خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جنوری 2015
سالِ نو مبارک
PDFBOOKSFREE.PK

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

جنوری 2015

جلد 42 شمارہ 9

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری 2015ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ربیع الاول کا مہینہ سایہ فگن ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں کائنات کی عظیم ترین ہستی نے دُنیا کو رونق بخشی اس کی عظمت کا کیا بیان ہو سکتا ہے کہ جس کے ذکر جمیل کو اللہ تعالیٰ نے ارض و سما میں بلند کیا، جس پر اللہ اور اس کے فرشتے صبح و شام درود بھیجتے ہیں۔ جس کے اخلاقِ حسنہ کی تعریف اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمائی جس کی سیرت طیبہ کی ایک ایک ادا تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے اور جو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔

ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعوا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آپ کی آمد کی خوشی میں جشن مناتے ہیں لیکن آپ سے حقیقی محبت تب ہی ہو گی جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس محبت، اخوت اور انسانیت کا درس دیا، اس پر غور کریں۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ گیا سال کچھ ایسے داغ بھی دے گیا جو شاید کبھی نہ مٹ پائیں گے۔ خصوصاً پشاور کے آرمی اسکول میں پیش آنے والا واقعہ جس نے دِلوں میں درد اور آنکھوں میں آنسو بھر دیے ہیں۔ دُعا ہے نئے سال کا سورج امن کا، خوشیوں کا پیغام لے کر آئے۔

ایک اندوہناک سانحہ،

کراچی میں ڈھائی عشروں سے جاری دہشت گردی نے ایک اور گھر کا چراغ بجھا دیا۔ ہمارے ساتھی رضا امام صاحب کے صاحبزادے عدنان رضا نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۝

والدین کی آنکھوں کے سامنے جوان اولاد کی اس طرح اچانک موت اور تین کمسن بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ رضا امام صاحب سے دیرینہ وابستگی کی بنا پر ہم سب کے دل سوگوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ رضا امام اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم عدنان رضا کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔
ہماری دُعا ہے کہ وہ لوگ کیفرِ کردار کو پہنچیں جنھوں نے یہ ظلم عظیم کیا ہے۔

انشاجی،

انشاجی اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت۔
ادب، شاعری، سفرنامے، مزاح، کالم نگاری۔ انہوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی اور خود کو منوایا۔ ایک طویل عرصہ بیت جانے کے باوجود ان کی شاعری مقبول ہے۔ ان کے کالم آج کے دور کی آواز ہیں۔ ان کے سفرنامے آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

11 جنوری 1978ء کو انشاجی اس دُنیا سے کوچ کر گئے لیکن وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ قارئین سے دُعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ نمل،
- عائشہ فیاض، صبا خان اور سعدی گل کے افسانے،
- ڈراما سیریل چپ رہو کے ہیرو فیروز خان سے باتیں،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول۔ عہدِ الست،
- آسیہ مقصود، نبیلہ رمضان اور شاہ جہاں گل کے ناولٹ،
- ماضی کی باصلاحیت فنکارہ۔ ہما نواب سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

نئے سال کا پہلا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

ادارہ

چالیس سال پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آپس میں بحث ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

"اے آدم! آپ ہمارے والد ہیں، آپ نے ہمیں محرومی کا شکار کر دیا اور گناہ کا ارتکاب کر کے ہمیں جنت سے نکلوا دیا۔"

آدم علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ "اے موسیٰ! اللہ نے آپ کو شرف ہم کلامی کے لیے منتخب فرمایا اور آپ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تورات دی کیا آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری قسمت میں لکھ دی تھی؟ چنانچہ بحث میں آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔" (تین مرتبہ آپ نے فرمایا۔) (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ ملاقات، ممکن ہے جنت میں ہوئی ہو، ممکن ہے عالم ارواح میں۔ واللہ اعلم۔

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد حضرت آدم علیہ السلام کو یہ طعنہ دینا نہیں کہ انہوں نے غلطی کیوں کی کیونکہ وہ غلطی تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دی تھی۔ ارشاد ربانی ہے۔

"پھر انہیں ان کے رب نے نوازا، ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔" ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی وجہ سے تمام انسانوں کو دنیا کی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں وضاحت فرما دی کہ یہ مصائب تو پہلے ہی

تقدیر میں لکھے جاچکے تھے اور ان کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔
3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ "آدم علیہ السلام غالب آ گئے۔" یہ تکرار تاکید کے لیے تھی تاکہ بخوبی علم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام سے جو کچھ ہوا وہ تقدیر الٰہی اور مشیت الٰہی کا اجر تھا۔

تقدیر پر بحث کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔
"قریش کے مشرک تقدیر کے مسئلہ میں بحث کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو یہ آیت نازل ہو گئی۔
ترجمہ :
"جس دن انہیں چہروں کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) تم دوزخ کی آگ لگنے کا مزا چکھو۔ بے شک ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔" القمر۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس آیت اور حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ملتا ہے۔
2۔ کفار کے لیے جہنم کا سخت عذاب مقدر ہے۔
3۔ واضح اور قطعی مسئلے میں اختلاف اور بحث کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

تقدیر پر بحث

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا "ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر صحابہ کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے اس قدر سرخ ہو گیا گویا اس پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہیں۔ (تب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ یا کیا تمہیں اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تم قرآن کی آیات کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہو۔ تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔" (مسند احمد)
حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا "مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مجلس سے غیر حاضر رہنے پر خوشی نہیں ہوئی جس طرح اس مجلس میں موجود نہ ہونے پر خوشی ہوئی۔

فوائد و مسائل :

1۔ تقدیر اسرار الٰہی میں سے ایک راز ہے، اس پر مجمل ایمان لانا کافی ہے، اسی طرح دوسرے غیبی امور کے بارے میں بھی جس قدر بتا دیا گیا، اسے مان لینا کافی ہے اور جس چیز کی وضاحت نہیں کی گئی، اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔
2۔ قرآن و حدیث کی نصوص کی وضاحت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ ان میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو، ورنہ امت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوتا ہے اور قرآن و حدیث پر ایمان میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔
3۔ قرآن و حدیث کے مطالعے کا اصل مقصد اخلاق و عمل کی اصلاح ہے۔ اگر کوئی شخص محض زور خطابت کے اظہار کے لیے یا اپنے علم و فضل کا رعب جمانے کے لیے پیچیدہ مسائل میں مشغول ہوتا ہے تو یہ اصل مقصد کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔
4۔ نصیحت کرتے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے بعض اوقات غصے کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے "خصوصاً" جب کہ نصیحت کرنے والا قابل احترام شخصیت کا حامل ہو اور سامعین پر اس کے غصے کا منفی اثر پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔
5۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ کسی دوسرے صحابی نے انہیں یہ واقعہ سنایا، تاہم محدثین کے اصول کے مطابق یہ حدیث "صحیح" ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ

وسلم سے حدیث براہ راست سننے والے صحابی کا نام نہ بھی لیا جائے لیکن اس سے سن کر روایت کرنے والا بھی صحابی ہوا تو ایسی حدیث بالا اتفاق صحیح ہوتی ہے کیونکہ تمام صحابہ "عادل" (قابل قبول اور قابل اعتماد) ہیں۔
6۔ صحابی کو اس مجلس سے غیر حاضری پر اس لیے خوشی ہوئی کہ حاضرین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خفگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو اگر نیکی کی توفیق مل جائے یا وہ کسی گناہ سے بچ جائے تو اس پر خوشی کا اظہار کرنا فخر و ریا میں شامل نہیں بلکہ نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت کی علامت ہے جو ایمان کا ایک حصہ ہے۔

بدشگونی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، بدشگونی کی کوئی حقیقت نہیں، نہ الو کوئی چیز ہے۔"
ایک اعرابی اٹھ کر آپؐ کے قریب آیا اور کہا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دیکھیے نا "ایک اونٹ کو خارش کی بیماری ہوتی ہے، وہ تمام اونٹوں کو خارش میں مبتلا کر دیتا ہے۔"
تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یہ تقدیر ہے، پہلے اونٹ کو خارش کس سے لگی؟"

فوائد و مسائل : 1۔ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ اگر کسی بیمار کے پاس کوئی تندرست آدمی اٹھتا بیٹھتا ہے یا اس کے ساتھ کھاتا پیتا ہے یا اس کا لباس استعمال کرتا ہے تو اسے بھی وہی بیماری لگ جاتی ہے جو مریض کو تھی۔ عرف عام میں ایسی بیماریوں کو متعدی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیماری اس طرح ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جس وجہ سے پہلے آدمی کے جسم میں مرض پیدا ہوا ہے، وہی وجہ کسی اور شخص میں بھی پائی جائے اور وہ بھی بیمار ہو جائے۔ جدید طب میں جراثیم کا نظریہ بہت مقبول ہے لیکن یہ جراثیم بھی بحکم الٰہی اثر انداز ہوتے ہیں، گویا دوسرے مریض کے بیمار ہونے کی اصل وجہ حکم باری تعالیٰ ہے نہ کہ مریض کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ اس کے علاوہ ہومیو پیتھک نظریہ علاج جراثیم کو امراض کا سبب ہی تسلیم نہیں کرتا، اس لیے اس نظریے کے مطابق بھی مرض کا ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہونا ایک غلط تصور ہے۔
2۔ عرب لوگ پرندوں اور جنگلی جانوروں کے گزرنے سے شگون لیتے تھے۔ کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا تو کسی بیٹھے ہوئے پرندے یا ہرن وغیرہ کو پتھر مار کر بھگاتا، اگر وہ دائیں جانب جاتا تو سمجھا جاتا کہ کام صحیح ہو جائے گا، اگر بائیں طرف جاتا تو سمجھا جاتا کہ کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے کام محض توہم پرستی کا مظہر ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل بھی اس طرح کے توہمات پائے جاتے ہیں، "مثلاً" کسی لنگڑے یا یک چشم انسان سے ملاقات ہو جائے تو اسے نحوست کا باعث قرار دینا۔ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سمجھنا کہ کام نہیں ہو گا یا کسی خاص عدد (مثلاً "تیرہ کا عدد) یا کسی خاص دن (مثلاً "منگل) یا کسی خاص مہینہ (مثلاً "ماہ صفر یا شوال) کو نامبارک قرار دینا بھی اسی میں شامل ہے۔ کوئی نقش بنا کر اس کے خانوں میں انگلی رکھنا یا اس قسم کے فال ناموں سے قسمت معلوم کرنے کی کوشش کرنا سب ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔
3۔ مشرکین عرب میں ایک غلط تصور یہ بھی پایا جاتا تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی روح الو کی شکل اختیار کر کے بھٹکتی اور چیختی پھرتی ہے اور انتقام کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے ان لوگوں میں نسل در نسل انتقام اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہتا تھا، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی، اسی طرح الو کو منحوس تصور کرنا غلط ہے۔ وہ بھی دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے جس کا انسانوں

کی قسمت سے کوئی تعلق نہیں۔

دل کی مثال

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"دل کی مثال ایک پر کی سی ہے جسے ہوائیں چٹیل میدان میں الٹاتی پلٹاتی رہتی ہیں۔"

فوائدو مسائل :

1۔ پرندے کا اکھڑا ہوا ایک پر بہت ہلکی چیز ہوتا ہے جسے معمولی ہوا بھی سیدھے سے الٹا اور الٹے سے سیدھا کر سکتی ہے۔ اگر وہ کسی کھلے میدان میں ہو تو ظاہر ہے ہوا اس پر زیادہ اثر انداز ہوگی کیونکہ وہاں ہوا کے اثر کو کم کرنے والی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ بڑی تیزی سے الٹ پلٹ ہوتا ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں اڑتا پھرے گا' انسان کے دل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس پر مختلف جذبات و احساسات تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے' کبھی گناہ کی طرف' کبھی اس میں محبت کے لطیف جذبات موجزن ہوتے ہیں' کبھی نفرت کی آندھی چڑھ آتی ہے۔ دل کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر شیطان اسے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے' لہٰذا کسی کو نیکی کی راہ پر گامزن دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ضرور جنت میں جائے گا اور نہ کسی کو گناہوں میں غرق دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لازماً" جہنمی ہے' اس لیے نیکی کی توفیق ملے تو اللہ سے استقامت کی دعا کرنی چاہیے اور گناہ ہو جائے تو اشک ندامت کا نذرانہ لے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ گناہوں کی آندھی اسے رحمت سے بہت دور لے جائے۔

2۔ چونکہ دل کی کیفیات کسی بھی لمحے تبدیل ہو سکتی ہیں' اس لیے انسان اپنے انجام کے بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ایمان پر وفات کی دعا کی جائے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی کی درخواست کی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کرتے تھے۔
"اے دلوں کو پھیرنے والے! میرا دل اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر ثابت رکھ۔"

عمر میں اضافہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"صرف نیکی ہی عمر میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور تقدیر کو محض دعا ہی ٹالتی ہے' بلاشبہ انسان کو بعض اوقات ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

فوائدو مسائل :

1۔ یہ روایت بعض محققین کے نزدیک حسن درجے کی ہے جو البتہ اس حدیث کا آخری حصہ "انسان اپنے برے عمل کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔" کسی معتبر سند سے ثابت نہیں بلکہ شیخ البانی رحمتہ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ موضوع ہے۔

2۔ نیکی کا ثواب جس طرح آخرت میں بلندی درجات اور ابدی نعمتوں کا باعث ہوتا ہے' اسی طرح نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی نعمت' عزت اور مزید نیکی کی توفیق۔ سے نوازتا ہے' اسی طرح برے عمل کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ملتی ہے' الا یہ کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے۔

3۔ عمر میں اضافے کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ (ا) یعنی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اچھے کاموں میں صرف ہوتی اور ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ (ب) نیکیوں کی توفیق ملتی ہے جس کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچتا رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے اچھی ہیں۔"
(ج) فرشتوں کو یا ملک الموت کو اس کی جو عمر معلوم تھی' اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ فرشتوں کے لحاظ سے اضافہ ہے' اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ شخص فلاں نیکی کرے گا جس کے انعام کے طور پر اس کی عمر میں اس قدر اضافہ کر دیا جائے گا۔

تقدیر بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مصیبت سے انسان ڈرتا ہے' دعا کی برکت سے رک جاتی ہے اور آئی ہوئی مصیبت رفع ہو جاتی ہے۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو دعا کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ سے نجات مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"اگر وہ (اللہ کی) پاکیزگی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہو جاتے' تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس (مچھلی) کے پیٹ ہی میں رہتے۔" الصفت 143-144

یہاں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تبدیلی فرشتوں کے علم کے مطابق تبدیلی ہے اللہ کے علم میں تبدیلی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ فلاں شخص دعا کرے گا' پھر اس کی مشکل حل ہو جائے گی۔

5۔ اس میں دعا کی ترغیب پائی جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا بھی جائز اسباب میں سے ہے جسے اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ عین توکل ہے۔

عمل

حضرت سراقہ بن جعشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا عمل ان امور میں شامل ہے جنہیں لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ ہو چکا یا اس کا تعلق آئندہ (فیصلہ ہونے والے معاملات) سے ہے۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"بلکہ وہ ان امور میں شامل ہے جن کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کا اندازہ ہو چکا اور ہر ایک کے لیے وہ کام آسان ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا۔"

فائدہ : انسان کے نیک اور بد ہونے کا تعلق بھی تقدیر سے ہے لیکن بندے کو اس کا علم نہیں۔ وہ شریعت کے مطابق عمل کرنے کا مکلف ہے۔

مومن

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مومن ہمیشہ اپنے دین کے بارے میں کشادگی میں رہتا ہے جب تک وہ حرام خون (بہانے کا ارتکاب) نہ کرے۔" (بخاری)

فائدہ :

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مومن جب تک کسی کا ناحق خون نہیں بہاتا' اسے دین پر عمل کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے اور دوسرا مفہوم ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے لیے کشادہ رہتی ہے' مآل (انجام) دونوں کا ایک ہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا زیادہ مستحق اور امیدوار ہوتا ہے اور جوں ہی وہ قتل ناحق کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ کی رحمت کی امید کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے اور وہ ناامیدوں میں سے ہو جاتا ہے۔

ناجائز لینا

حضرت خولہ بنت ثامر انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں' وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
"بلاشبہ کچھ لوگ اللہ کے مال (بیت المال) میں ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے قیامت والے دن جہنم کی آگ ہے۔" (بخاری)

فائدہ :

قومی خزانے میں ناجائز تصرف اور اسے مصالح عامہ کے بجائے مصالح خاصہ کے لیے استعمال کرنا کبیرہ گناہ ہے جس پر اسے جہنم کی سزا ہو سکتی ہے' اگر اس نے مرنے سے قبل خالص توبہ نہ کی۔

انشا سے انشا کی باتیں

مختار زمن

وہی کھنچا ہوا قد' کشمشی بالوں میں لہریے "گدّی پر سے تقریباً" منڈے ہوئے۔ تھا تو شاعر اور دانشور مگر بال ہمیشہ چھوٹے رکھتا تھا۔ دیکھیے' وہ سر ہلا رہا ہے۔ باتیں کرتے وقت سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دینا اس کی عادت ہے۔ موٹے تال کی عینک کے پیچھے سے اس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔ آیئے پوچھیں تو اس سے کہ آخر راہ فرار کیوں اختیار کی؟

"کیوں انشا جی! ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ کج ادائی؟"

"ارے بھائی! بات یہ ہے کہ سفر تو اپنا مقدر تھا اور ہم تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔

کارواں در کارواں سپنوں کو بسرائے ہوئے
لوگ تو جانے لگے انشا! چلو تم بھی چلو

"نہیں انشا جی! ہم سے باتیں نہ بناؤ۔ تم باہر تو اکثر جایا کرتے تھے مگر ہر دفعہ ایک نو تصنیف کتاب کا مسوّدہ اور ایک شفقت بھری مسکراہٹ کا تحفہ لے کر واپس لوٹ آتے تھے۔ مگر خیر' تمہیں کیا دوش دیں۔ تم سے کیوں شکایت کریں کہ تم کہہ چکے ہو کہ یہ شہر' یہ قریے تمہارا وطن نہیں ہیں۔ تم سدا کے رومانی' عاشق تن' آوارہ مزاج تھے۔

"آہوو حشی جان کے تم کو ساتھ تمہارے پھرتے تھے۔"

اور تمہیں بھی کچھ انہیں وحشیوں سے چاہت تھی۔ انہیں کی سنگت پسند تھی۔

بستیاں' قریے گھوم چکے' اب دشت کو لوٹیں' بن کو چلیں
شام ہوئی آوارہ غزالو' آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں

انشا جی تم تو خیر اپنے وطن کو لوٹ گئے یا باغ عدن کو لوٹ گئے۔ مگر دیکھ رہے ہو' تمہارے اس ناوقت سفر نے کیا قیامت ڈھائی؟ تم ایک دن چپکے سے چلے گئے۔ مگر جب تمہارا خاکی جسم تابوت میں رکھا ہوا کراچی آ کر اترا تو دیکھا تھا' کیا بجوگ پڑا۔ بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی' بچوں کو چین نہیں آتا تھا۔ بھائی بہنوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا رواں تھے۔ تمہارے یار دوست' تمہارے چاہنے والے' تمہارے مضامین پڑھنے والے' بلکہ شہر کا شہر ماتم کر رہا تھا۔

لندن سے تمہاری سناؤنی سنی تو عالی نے پہاڑ سی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

قدرت اللہ شہاب آٹھ' نو سو میل کا سفر کر کے کراچی آئے کہ تمہارا آخری دیدار کر لیں۔ ارے بندہ خدا جانے کی ایسی کیا جلدی تھی۔

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستہ کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

میں کہتا ہوں انشا جی! آخر تمہیں ہم سے شکایت کیا تھی؟ ہم لوگ تو تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ ہار پھول پہنائے جاتے تھے۔ لو صاحب پھر بھی آپ فرماتے ہیں۔

ان لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے
نجد کے قیس' یہاں کے انشا خوار ہوئے' بدنام ہوئے

مگر ہم نے تو کبھی نہ سنا اس بدنامی کا قصہ۔ ہاں اپنی بیماری کی طرح چھپاتے رہے ہو تو دوسری بات ہے۔ مگر کمال ہے' اپنے چلے جانے کی یہ شخص کیا کیا تاویلیں کرتا ہے۔

ہم جنگل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں
آج یہاں' کل اور ڈگر میں' صبح کہاں اور شام کہاں

میری جان انشا! تم تو جوگی ہو گئے مگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے چاہنے والے بھی بروگ لے لیں۔ اب کے سفر کے بعد تم نے آس توڑ دی۔ چہرہ چھپا کر اپنے چہیتوں کی دنیا سونی کر دی۔ تمہارے لطیفوں کی پھلجڑیاں کیا جوت جگایا کرتی تھیں۔ تم کیا گئے کہ اندھیرا چھا گیا۔ تم خوب جانتے ہو کہ جب جانے والا چلا جاتا ہے تو لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر نہ جانتے تو یہ کیونکر کہتے۔

کس کا چہرہ چمکتا لائیں' کس سورج سے مانگیں دھوپ
گھور اندھیرا چھا جاتا ہے خلوت دل میں شام ہوئے

تم اپنی شاعری میں عشق کا دم بھرتے تھے۔ بڑے عاشق بنے پھرتے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھا کہ تم خود کتنوں کے محبوب تھے؟ اور اب اپنے عاشقوں کا حال تک نہیں پوچھتے۔ خود را فضیحت' دیگراں را نصیحت۔ تم خود ہی کہتے تھے۔

اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

اچھا چلو' چشم تصور میں ہی آتے رہو' خواب ہی میں جلوہ دکھاتے رہو ہمیں منظور ہے۔

جنگل جنگل شوق سے گھومو' دشت کی سیر مدام کرو
انشا جی! ہم پاس بھی لیکن رات کی رات قیام کرو

انشا جی تمہاری وہی حالت ہے کہ "من نہ کردم شما حذر بکنید۔" ایک طرف آپ نصیحت فرماتے ہیں کہ.....

میر مغفور کے اشعار نہ پیہم پڑھنا
جینے والوں کو ابھی اور بھی جینا ہوگا

اور خود یہ حالت بنا رکھی ہے کہ.....

آوارہ آوارہ پھرنا چھوڑ کے منڈلی یاروں کی
دیکھ رہے ہیں دیکھنے والے انشا کا اب حال وہی

بلکہ نوبت بہ اینجا رسید کہ.....

کیا اچھا خوش باش جواں تھا جانے کیوں بیمار ہوا
اٹھتے بیٹھتے میر کی بیتیں پڑھنا اس کا شعار ہوا

اور آخر وہی ہوا جو ہونا تھا اور تقدیر کا بدا تھا۔ وہ دن آ گیا جب آنکھیں ڈھونڈتی ہیں کہ انشا کہاں گیا۔

اے متوالو' ناقے والو' ورنہ اک دن یہ ہوگا
تم لوگوں سے آتے جاتے پوچھیں گے انشا کا پتا

انشا! تم اپنے گرو میر تقی میر سے ملے ہو گے۔ وہ خستہ تن تم سے مل کر ضرور خوش ہوا ہو گا۔ شعر میں وہ تمہارا استاد تھا۔ تمہارے اشعار میں بھی آہوں کا دھواں ہے۔ عشق کی آگ سلگتی بھڑکتی رہتی ہے۔ درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ تمہارے بول میٹھے ہیں۔ ان میں غضب کی گھلاوٹ ہے مگر تم خود مانتے ہو کہ میر میر تھا' تم محض پیرو ہو اور حال یہ ہے۔

اک بات کہیں گے انشا جی! تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی
تم ایک جہاں کا علم پڑھے' کوئی میر سا شعر کہا تم نے

مگر جان من تمہاری نثر؟ وہ تمہاری اپنی خاص چیز ہے۔ خدا کی پناہ۔ تمہاری نثر کی البیلی ناگن خوب ڈستی ہے۔ ہاں زہر نہیں چھوڑتی۔ تم نے وہ فقرے بازیاں کی ہیں کہ لوگ تمہیں پڑھ کر لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ اس فن کے تم استاد ہو۔ حباب کی اور اخبار کی زندگی ہی کیا۔ لیکن اخبار میں وہ چند مربع انچ جہاں تمہارا قلم موتی جڑا کرتا تھا زندہ جاوید ہو گئے۔ شعراء شعر میں تعلی کیا کرتے ہیں' تم نے نثر میں بھی تعلی کی مگر اس طرح گویا محض گدگدا رہے ہو۔ یاد ہے جرمنی کی وہ بڑی بی جس سے تم نے بلیڈ خریدے تھے؟ وہ انگریز تھی۔ آپ فرماتے ہیں۔

"اس بے چاری کو جرمن نہیں آتی صرف انگریزی آتی ہے۔ ہماری طرح دونوں زبانوں پر قادر نہیں معلوم ہوتی!"

اور پھر وہ جرمن ٹیکسی والا جس کی شامت اعمال کہ اس نے آپ کو گڈ مارننگ کہا اور جناب نے کس پدرانہ شفقت سے فرمایا۔

"میاں خوب انگریزی بولتے ہو۔ ہمارے مقابلے

کی نہ سہی پھر بھی اچھی خاصی ہے۔"

دنیائے ادب کے بت طناز! طنز میں بھی تمہارا جواب نہیں۔ تم نے کاروبار کرنے والے غریب پاکستانیوں کو خوب کچوکے دیے ہیں جس کی کسک اب تک محسوس ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

"اہل فرنگ میں نیکی و نیک چلنی کا فقدان ہے کیونکہ شراب اکثر پیتے ہیں۔ گوشت بھی حلال یعنی ذبیحے کا نہیں کھاتے۔ پردے کا بھی چنداں خیال نہیں ہے۔ دکان داروں کے ماتھوں پر گٹے اور ہاتھوں میں تسبیح نہیں یعنی ان کی عاقبت کا معاملہ مشکوک ہے لیکن ملاوٹ کا کاروبار نہیں۔ دودھ، دہی اور مکھن مکا سب خالص ملتا ہے۔ چائے کی پتی میں بھی چنے کا چھلکا نہیں ہوتا نہ ہلدی میں اینٹیں ہوتی ہیں۔ چینی دکانوں سے پلک جھپکتے غائب نہیں ہوتی نہ آٹا کہیں جاتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ مین ہولوں کے ڈھکنے تک نہیں چراتے۔ پیارے یہ ہمیں سے ہو' ہرکارے دہر مردے۔"

انشا! یہ سچ ہے کہ تمہارے شعر کی گھلاوٹ اور "غنائیت" میریت کا پرتو ہے۔ لیکن تمہاری "انشائیت" تمہاری نثر میں ہے۔ یہ بڑی تحفہ چیز ہے۔ سیدھی سادی آسان زبان' چھوٹے چھوٹے فقرے متوازن طرز ادا' کوئی پیچ نہیں' کوئی سنگلاخ مقام نہیں' بدہضمی پیدا کرنے والے ثقیل الفاظ نہیں کہ لغت ساتھ لے کر بیٹھو تو پڑھو۔ بھئی' میرا تو یہ حال ہے کہ جب تم یاد آتے ہو تو تمہاری تحریریں پڑھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہو۔ محاورے کا نمک' اور کلاسیکی تلمیحات کے مسالے' اس پر معصوم سا طنز و مزاح لطف آجاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی صحبت سے تم نے فائدہ اٹھایا۔ تم نے یہ راز پالیا کہ تحریر میں رچاؤ پیدا کرنے کے لیے کلاسیکی' ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کتنا اہم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ کٹے کنکوے کی طرح جدھر کی ہوا ہوئی ادھر کو بہک گئے۔ اگر تم غالب کے رسیا نہ ہوتے تو میاں شیر محمد خاں انشا یہ کیوں کر لکھتے مرے' شعر تجھ پر بھی رحمت خدا کی۔

اور اگر تم نے اسمٰعیل میرٹھی کی وہ نظم نہ پڑھی ہوتی کہ

اک لڑکی بگھارتی تھی دال
دال کرتی تھی عرض یوں احوال
تو یہ جملے کہاں سے لاتے۔

"دال مہنگی ہے اتنی کہ وہ لڑکیاں جو اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں۔ اب فقط شیخی بگھارتی ہیں۔"

بھئی بقول باورچیوں کے کیا مزے دار "تڑکا" لگایا ہے اور کھانے کا ذکر ہو تو تم نے یہ بھی خوب کہا کہ

"گوشت نہ کھانے والا ہر شاعر معری نہیں ہوتا۔ بعض مہنگا ہونے کی وجہ سے نہیں کھاتے۔"

انشا! تم جیسے مرنجان مرنج آدمی تھے ویسے ہی طنز نگار بھی ہو۔ چٹکیاں لیتے ہو' بپھر کر حملہ نہیں کرتے مگر فقرہ ایسا چست کرتے کہ تیر کھانے والا تیر کھا کر بھی مسکراتا ہے۔ تمہارے متعلق مشتاق یوسفی نے کہ وہ خود بھی لیلائے مزاح کا ادا شناس ہے' کلاسیکی بات کہہ ڈالی کہ

"بچھو کا کاٹا روتا ہے۔ سانپ کا کاٹا سوتا ہے اور انشا کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔"

انشا جی! تم نے تاریخ فہمی کی بھی نئی ادا اختیار کی۔ خوب لکھا ہے۔

"جہانگیر کو بڑا ہی زیرک اور سمجھ دار جاننا چاہیے کہ اس نے محض کبوتر اڑانے سے نور جہاں کی لیاقت کا اندازہ کرکے اس سے شادی کر لی۔ اس کے سلیقہ شعار' پابند صوم و صلوٰۃ یا..... کشیدہ کاری کا ماہر وغیرہ ہونے کی شرط نہ رکھی۔"

"شاہ جہاں بڑی دور رس نظر رکھتا تھا۔ تاج محل نہ ہوتا تو آج بھارت کی ٹورسٹ ٹریڈ کو اتنی ترقی نہ ہوتی ...." پتا نہیں۔ سو برس بعد کوئی تمہارے اس فقرے کا مزا لے سکے گا یا نہیں کہ

"ہمایوں کا بیٹا اکبر سندھ کے سفر میں امرکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اصطلاح میں اسے نیا سندھی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

اور پھر.....

"اکبر اور ہیموں بقال کی لڑائی پانی پت میں شروع ہوئی تو ہمدردوں نے اس کے جدی وطن سے پیغام بھجوایا کہ تم اور ہیموں یہاں تاشقند آؤ' صلح کرائے دیتے ہیں۔ لیکن اکبر نہ مانا۔ ہیموں ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا روپے آنے پائی کا حساب لکھ رہا تھا کہ اس لڑائی کا مال غنیمت فروخت کرکے کسی کاروبار میں پیسہ لگائے کہ ناگہاں ایک تیر قضا کا پیغام لے کر اس کی آنکھ میں لگا اور وہ بے سدھ ہو کر گر گیا ہیموں بقال کو ہم تاریخ کا پہلا موشے دایان کہہ سکتے ہیں۔"

مجھے معلوم نہیں کہ انشا تمہیں کبھی پی جی ووڈ ہاوس سے بھی دلچسپی رہی ہے یا نہیں مگر تمہارے بعض فقروں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے مثلاً

"کبوتر کی دو قسمیں ہیں۔ نیلے کبوتر اور سفید کبوتر' نیلے کبوتر کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور سفید کبوتر بالعموم سفید ہی ہوتا ہے۔"

اور پھر طنز کی یہ کاٹ.....

"طوطے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جنگلی طوطے جو جنگل میں رہتے ہیں۔ پالتو طوطے جو پنجروں میں رہتے ہیں۔ فالتو طوطے جنہیں جنگل میسر ہے نہ پنجرہ۔ آئے دن ان کی وطنیت کا سوال اٹھتا رہتا ہے۔"

ہائے ہائے انشا مخمل میں لپیٹ کر لگانا اسی کو کہتے ہیں۔

سوال۔ پاکستان میں کون رہتا ہے؟

جواب۔ پنجابی' سندھی وغیرہ

سوال۔ پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں' سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ بنگالی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا؛

جواب۔ غلطی ہوئی معاف کردیجیے۔ آئندہ نہیں بنائیں گے۔"

انشا! انشا پردازی تمہارے لیے اتنی ہی سہل تھی جیسے آپس میں باتیں کرنا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام تمہیں کہیں مضمون پڑھنا تھا۔ میں تمہارے دفتر پہنچا کہ جلسے میں ساتھ ساتھ چلنے کا پروگرام تھا۔ تم دفتری کام کر رہے تھے۔ فون بھی آرہے تھے۔ باتیں بھی جاری تھیں اور ساتھ ساتھ ایک پرچے پر مضمون بھی لکھ کر جلد جلد تیار کر رہے تھے جو گھنٹے بھر بعد پڑھنا تھا۔ اسی طرح تمہاری کالم نویسی تمہاری زود نویسی کی مرہون منت تھی۔ یہی شاید تمہاری تحریر کی بے ساختگی کی وجہ ہے۔ اس میں آمد ہے آورد نہیں۔

انشا! تم واقعی دوستوں کے دوست تھے۔ یاد ہے جب میری کتاب چھپ رہی تھی تو تم ضد کرتے تھے کہ اس میں کارٹون ضرور ہوں گے۔ اس پر جملہ بازیاں بھی ہوتی تھیں۔

میں کہتا تھا کہ آؤ ہم اپنی تصویریں لگادیں! میں نے تم سے کہا تھا کہ "چھوڑو کس چکر میں پڑتے ہو۔"

تم نے جواب دیا کہ "بھئی مجھ پر چھوڑو۔" پھر تم نے کارٹون بنوائے..... اور تقریب تعارف میں وہ جوش و خروش دکھلایا کہ میں بھول نہیں سکتا۔

تم ایسے شاعر و نثار تھے جس سے قاری کو الفت ہو جاتی ہے۔ یہی تمہاری سب سے بڑی جیت تھی۔ یوں مرنا تو برحق ہے' ہم کہتے تھے۔

یاں تو آیا جو مسافر یونہی شب بھر ٹھہرا
یہ سرائے ہے یہاں کس کا ٹھکانہ ڈھونڈو

لیکن انشا جی! ایسا لگتا ہے کہ تم نے شب بھر بھی قیام نہ کیا۔ رات تو ابھی بھیگی بھی نہ تھی' چاند تو ابھرا بھی نہ تھا۔ چکور تو بولے بھی نہ تھے۔ ابھی تو یہ حالت تھی کہ۔

آغاز شباب شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

لیکن تم آئے۔ اِدھر چٹکی لی۔ اُدھر گدگدایا۔ کسی پر فقرہ کسا' کسی کا منہ چڑایا جوگیوں کی طرح ایک نعرہ مستانہ لگایا۔ اپنی شہرت کا خرقہ کاندھے پر ڈالا۔ عقیدت و محبت کے سکوں سے بھرا ہوا کشکول سنبھالا اور لوگوں کو روتا چھوڑ اپنا دامن جھٹک کر چلتے بنے۔ واہ انشا جی! خوب رسم وفا نبھائی۔

خوب ہمارا ساتھ نبھایا' بیچ بھنور کے چھوڑا ہات
ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا نکلے ہو اچھی بات

☆

ہما نواب سے ملاقات

شاہین رشید

برسوں بعد جب ماضی کی حسین فنکارہ "ہما نواب" کو ماں کے رول میں دیکھا تو احساس ہوا کہ وقت کسی کا نہیں اس نے سب کو چھو کر گزر جانا ہے۔ انسان وہی اچھا ہوتا ہے۔ جو اپنے آپ کو وقت کے سانچے میں ڈھال لے۔ میں نے اکثر حسین فنکاروں کو دیکھا ہے کہ جب جوانی ڈھلنے لگتی ہے تو وہ گوشہ نشین ہو جاتی ہیں مگر کچھ ایسی بھی ہیں جو ہر دور کو انجوائے کرتی ہیں اور حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں کہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ بڑھاپے میں انسان کی شخصیت میں وقار اور بردباری آجاتی ہے۔

ہما نواب ایک طویل عرصے کے بعد اسکرین پہ واپس آئی ہیں اور آپ یقین کریں کہ ان کے اسکرین آتے ہی ان کے انٹرویوز کی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ اپنی مصروفیات کے باعث بڑی مشکل سے ہاتھ آئیں ہم لیکن شکر کریں کہ آگئیں۔

"کیسی ہیں ہما نواب۔ آج بہت خوشی ہو رہی ہے آپ سے بات کر کے.... بہت شکریہ وقت دینے کا؟"

"جی اللہ کا شکر ہے.... بس مصروفیات ماشاء اللہ اتنی ہیں کہ وقت نکالنا ذرا مشکل ہو رہا تھا۔"

"جی.... آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ کیا آن ایر ہے کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"آج کل سوپ "سسرال میرا" آن ایر ہے پرائیویٹ چینل سے آتا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ کیوں کیا یہ رول.... میں نے کہا کہ بھئی ٹیپکل قسم کے رول بہت ہو گئے اب کچھ چینج آنا چاہیے۔ اپنے آپ کو اسٹیبلش کروانا تھا۔ سو کافی سال پہلے کروالیا "سسرال میرا" کے علاوہ "محرم" آن ایر ہے —— جیناد شوار سہی" پی ٹی وی ہوم سے آن ایر ہے کافی ٹیلی فلمز کی ہیں۔ گزری عید پہ سرد کھوسٹ کا کامیڈی پلے کیا تھا تو کام بہت ہو رہا ہے۔ لیکن ہر اسکرپٹ کا بھی مزہ نہیں ہے' کچھ اسکرپٹ ایسے بھی پڑے ہوئے ہیں' جن پہ کام کرنے کو دل ہی نہیں کر رہا۔ وہی ٹیپیکل اسٹوریز ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں یہاں سے گئی تھی' پاکستان سے تو اس وقت ہمارے ڈراموں کے موضوعات بہت اچھے ہوا کرتے تھے تو کام کرنے کا بھی مزہ آتا تھا۔ اور ڈرامہ دیکھنے کا بھی مزہ آتا تھا۔ اب تو محض موضوعات ہوتے ہیں بس۔ ایک فیکٹری بن چکی ہے' ایک منڈی بن چکی ہے۔"

"یعنی مزہ نہیں آرہا' مجبوری میں کر رہی ہیں؟"

"مزہ آ بھی رہا ہے اور نہیں بھی' اب اتنے سارے چینلز کھل گئے ہیں' کہ اب آپ صرف پی ٹی وی تک محدود نہیں ہیں' نئے نئے آرٹسٹ آگئے ہیں۔ نوجوان ڈائریکٹرز آگئے ہیں جو کہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ بہت عزت کرتے ہیں سب میری' اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے مجھے' انسان عزت کا ہی بھوکا ہوتا ہے۔ بس یہ بات میں نے ضرور نوٹ کی ہے کہ کمپنی تھوڑی سی ڈس آرگنائزڈ ہے۔ پے منٹس کا تھوڑا مسئلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے چھوٹا اور بڑا ہر ایکٹر رو رہا ہے۔"

"اچھا.... ایک سینئر ہونے کی وجہ سے آپ اپنی مرضی کی پے منٹ نہیں لیتیں کیا؟"

"آپ دیکھیں نا.... کہ ہمارے یہاں کوئی کمٹمنٹ نہیں ہوتی.... ہونی چاہیے وہ زبانی ہو یا پیپر میں اور یہاں اپنی مرضی سے کچھ نہیں ہوتا' یہاں پے منٹس مل تو جاتی ہیں مگر رلا رلا کر' فون کر کر کے' جیسے یہ ہم پر کوئی احسان کر رہے ہیں.... بس کیا کر سکتے ہیں.... اور ڈراموں میں بھی ایک بھیڑ چال چل پڑی ہے۔ شادیاں 'سٹ کام' ایک جیسے موضوعات' کم سے کم ہمارے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔"

"ہمارے ڈراموں میں عورتیں بڑی مظلوم دکھائی جاتی ہیں؟"

ہنستے ہوئے.... "عورتیں مظلوم بے چاری تھپڑ کھاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ایک کلاس ایسی ہے' جن کو اس قسم کے ڈرامے بہت پسند ہیں۔ تو ان کا ٹیسٹ بھی بدلنا چاہیے۔ کتنا مظلوم دکھائیں گے عورت کو.... عورت تو اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ اسے اسٹرانگ دکھاؤ' جو کہ اب حقیقت ہے' تاکہ کمزور اور مظلوم عورت میں بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ ہو۔ اور ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گی کہ میڈیکل سائنس سے یہ ثابت ہوا کہ کزنز میرج بیماریوں کو ٹرانسفر بھی کرتی ہے اور جنم بھی دیتی ہے۔ مگر ہمارے ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے کہ بھائی کے بیٹے سے شادی ہو رہی ہے۔ مائیں تڑپ رہی ہیں کہ میری بہن کے بیٹے یا بیٹی سے شادی ہو جائے۔"

"یہ بتائیں کہ اتنا عرصہ کہاں رہیں۔ کس ملک میں رہیں۔ وقت کیسا گزرا اور اسکرین سے کیوں غائب ہوئیں؟"

"ہر چیز کا ایک ٹائم ہوتا ہے اور انسان کی قسمت میں سب کچھ لکھا ہوتا ہے' جہاں اس کو جانا ہوتا ہے چاہے وہ لاہور ہو' کراچی ہو' امریکہ ہو یا لندن ہو.... تو 1998ء میں میں امریکہ چلی گئی تھی۔ کیونکہ میرا دانہ پانی وہاں لکھا ہوا تھا۔ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں میرا قیام رہا۔ وہاں رشتے دار تھے۔ ڈیڑھ سال ہوا ہے مجھے پاکستان آئے ہوئے' گو درمیان میں ایک بار پہلے بھی آئی تھی تو دوستوں اور رشتے داروں نے کہا کہ واپس آجاؤ اور یہاں آکر ڈراموں میں کام کرو.... چنانچہ وہاں جا کر سب کی باتوں پہ غور کیا کچھ سوچا اور پھر آگئی.... یہی کام چھوڑ کر گئی تھی۔ اسی کام کو دوبارہ شروع کر دیا۔"

"وہاں امریکہ میں کیا کرتی تھیں۔ جاب کی یا کوئی بزنس؟"

"وہاں رہ کر تو آپ کو پتا ہے کہ جاب کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ سو اخراجات ہوتے ہیں' ضرورتیں ہوتی ہیں۔ تو میں ہارڈویر اسٹور میں کام کرتی تھی اور مجھے انٹیریر کا ڈیپارٹمنٹ ملا ہوا تھا اور ہمارے پاس تقریباً" 100 کے قریب اکاؤنٹ ہوتے تھے ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے' موشن پکچرز جیسے سونی وغیرہ کے تو ان کی سیٹ ڈیزائننگ کیا کرتی تھی اور وہ بہت دلچسپ کام تھا اور مجھے بہت مزہ آتا تھا' کیونکہ اگر جاب مزے کی نہ ہو تو بڑی بوریت ہوتی ہے۔ تو بڑا اچھا وقت گزرا.... اور اچھا کمایا بھی۔"

"اب مستقل آئی ہیں یا واپس جانے کا ارادہ ہے

؟"

"جانا آنا تو انشاء اللہ لگا رہے گا۔ وہاں اتنا عرصہ رہ کر آئی ہوں تو ایک دم تو کٹ آف نہیں کر سکتی۔"

"جب آپ واپس پاکستان آئیں تو لوگوں نے ویلکم کیا یا انڈسٹری کے چکر لگانے پڑے؟"

"ارے نہیں نہیں۔۔۔ ماشاء اللہ سے "وارم ویلکم" ملا مجھے اور جب میں واپس آئی ہوں تو میں نے کسی کو بتایا نہیں بلکہ اپنے اپارٹمنٹ کو ریزویٹ کروانے میں مصروف تھی۔ تو جب میری آمد کا سب کو پتا چلا تو سب بہت خوش ہوئے اور کام کی آفرز آئیں۔ مگر ابتدا میں میں نے چھوٹے چھوٹے رولز کیے تاکہ اپنی فارم میں واپس آجاؤں۔۔۔ اب بڑے رولز بھی لینے لگی ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ ایک آرٹسٹ چار چار سیریلز میں بک ہوتے ہیں اور کام کر رہے ہوتے ہیں اور کیوں نہ کریں اگر انہیں اچھا کام بھی مل رہا ہے اور کمائی بھی ہو رہی ہے۔۔۔ مگر سچ پوچھیں تو مجھ سے بیک وقت اتنے سارے رولز نہیں ہوتے اور پھر کچھ آرگنائزڈ قسم کا کام بھی نہیں ہو رہا تو زیادہ کام نہیں لیتی میں۔"

"امریکہ میں جب اپنے ڈرامے دیکھتی تھیں تو ڈرامے اچھے لگتے تھے یا کُڑھتی تھیں کہ یہ کیسا کام ہو رہا ہے؟"

"کم دیکھتی تھی لیکن دیکھتی ضرور تھی۔۔۔ اور اچھے لگتے تھے زیادہ نہیں کُڑھتی تھی (ہنستے ہوئے) اور میری ایک بہت اچھی دوست ہیں جو کہ رائٹر بھی ہیں "عذرا بابر" جو ایک لائن بھی لکھتی ہیں تو لاجک کے ساتھ لکھتی ہیں تو جب ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر ڈرامہ دیکھتی تھیں تو ضرور کہتی تھیں ہم کہ "یار یہ کیا ہے؟" سٹ کام بھی بہت عجیب اور بے تکے قسم کے ہوتے تھے۔ ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بہت آرگنائزڈ اور ڈسپلن کے ساتھ کام ہوتا تھا اب تو ہر پلے میں رونا دھونا مچا رہتا ہے۔ جن لڑکیوں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں وہ بہت اچھی بچیاں ہیں ان سے کوئی اچھا اچھا کام کروائیں۔۔۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اب تو لڑکیوں کے ہاتھ میں وسک Vix ہوتی ہے' جہاں آنکھوں پہ لگائی ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگتے ہیں۔ کیونکہ کردار ہی رونے دھونے والے ہوتے ہیں۔"

"گزرے زمانے میں ڈرامے فیڈ بیک کو دیکھ کر بنا کرتے تھے اب پہلے پورا سیریل ریکارڈ ہوتا ہے پھر آن ایر ہوتا تھا۔۔۔ تو پہلے زیادہ بہتر تھا اب زیادہ بہتر ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہا اب اچھا رسپانس ملے یا بُرا آپ اسے چینج نہیں کر سکتے۔ اور پہلے تین ماہ کی ایک سہ ماہی ہوا کرتی تھی اور تین ماہ کے بعد نئے ڈرامے اور دیگر پروگرام آن ایر ہوتے تھے۔ مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ پھر پہلے ڈرامے کے لیے ریہرسل بھی بہت ہوتی تھی۔ ڈسکشن بھی بہت ہوتا تھا رائٹر اور ڈائریکٹر کے درمیان۔ اب اس طرح کا کام نہیں ہو رہا۔ نئے لوگ اپنی اپنی کہانیاں لے کر آجاتے ہیں۔"

"آپ جوانی میں اس میڈیا کو چھوڑ کر گئیں اور 14 سال بعد آپ کی واپسی ہوئی۔ ینگ سے اولڈ رولز میں آ گئیں۔ تکلیف ہوئی یا اچھا لگا۔ کیسا محسوس ہوا؟"

"نہیں نہیں' کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور انسان ایک ہی دور میں رہے تو پاگل ہو جائے۔ تبدیلی تو بہت ضروری ہے اور مجھے بالکل بھی بُرا نہیں لگ رہا' بلکہ میں اپنے کام کو بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ چاہے کام جیسا بھی مل رہا ہے۔۔۔ ہمارے رائٹرز کے پاس ٹاپک نہیں ہیں' وہی ہیرو ہیروئین پہ گھوم رہی ہیں کہانیاں۔ جبکہ پاکستان میں ایشیائی ممالک میں تو موضوعات کی بھرمار ہے۔ ہر گھر میں ایک کہانی موجود ہے۔ بس جو چل رہا ہے سو چل رہا ہے۔ کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا۔ پروڈکشن کمپنیز پیسے بنا رہی ہیں ماشاء اللہ سے۔"

"ریٹنگ کا بڑا زور ہوتا ہے؟"

"جی بالکل' ایک مرد کی دو دو تین تین شادیاں کروائیں گے تو ریٹنگ تو بڑھے گی ہی نا۔۔۔ یا کچھ اس طرح کے موضوعات ہوں گے چٹ پٹے تو ریٹنگ تو بڑھے گی ہی نا۔"

"رولز کے معاملے میں چوزی ہیں یا کہتی ہیں کہ چلو بھیڑ چال میں ہم بھی شامل ہو گئے تو کیا ہوا؟"

"پہلے میں چُوزی تھی۔ اب بھیڑ چال کا حصہ بن گئی ہوں۔۔۔ کیونکہ پہلے ہمارے پاس صرف پی ٹی وی ہوتا تھا اور بہت بعد میں این ٹی ایم آیا۔ اس وقت ہم سال میں صرف دو سیریلز ہی کر سکتے تھے وہ بھی بیک وقت نہیں بلکہ گیپ دے کر۔۔۔ تو جب اتنا محدود کام تھا تو پھر لازمی ہو جاتا تھا کہ بندہ وہ کردار کرے جو یادگار رہ جائیں۔۔۔ اور اگر آپ دیکھیں تو میں نے کوئی بہت زیادہ کام نہیں کیا گزرے زمانے میں۔ مگر جو کیا وہ اچھا کیا اور وہ ہی یادگار رہ گیا میں جب پاکستان واپس آئی تو اسی ذہن کے ساتھ کہ یہ نہیں کرنا وہ نہیں کرنا۔۔۔ پھر سوچا نہیں بھئی وہ ہی کچھ کرو جو سب کر رہے ہیں۔ ڈراموں کی سب مائیں رو رہی ہیں تو چلو میں بھی رو لیتی ہوں۔ سب مائیں نگیٹو رول کر رہی ہیں تو چلو میں بھی کر لیتی ہوں۔۔۔ تو میں تو ہر طرح کے رول کرنے کو تیار ہوں۔ اور میں چاہوں گی کہ ماں کے رول سے ہٹ کر بھی کوئی کردار کروں۔ کسی پاگل کا رول۔ صحرا میں بھٹکتی ہوئی عورت کا رول وغیرہ وغیرہ۔"

"انڈین ڈرامے دیکھتی ہیں۔۔۔ وہ آگے ہیں ڈراموں میں یا ہم؟"

"ارے نہیں نہ پہلے کبھی دیکھے تھے نہ اب دیکھنے کا ارادہ ہے۔ انڈین ڈرامے تو ہماری پنجابی فلموں کی طرح ہوتے ہیں۔ ڈھن ڈھن کرتے ہوئے۔۔۔ تو مجھے تو کبھی بھی پسند نہیں آئے۔۔۔ اور چونکہ میں نے کبھی ان کے ڈرامے دیکھنا پسند ہی نہیں کیے تو نہیں بتا سکتی کہ کون آگے اور کون پیچھے۔ لیکن میں پھر بھی یہ ضرور کہوں گی کہ ہمارے ڈرامے انڈین ڈراموں سے بہت بہت آگے ہیں کیونکہ وہاں امریکہ میں مجھے اپنے پاکستانی ڈراموں کا فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی تبدیلی آنی بہت ضروری ہے۔"

"مستقبل میں کیا کچھ کرنے کا ارادہ ہے؟"

"بس اس فیلڈ میں رہ کر کام کرنا ہے۔ جنوری سے مارچ تک کے سیریلز سائن کیے ہوئے ہیں میں نے اور درمیان میں امریکہ کا ایک چکر لگانے کا ارادہ ہے۔ آئی تو میں یہاں ایک دو ماہ کے لیے تھی۔ مگر پھر یہیں کی ہو کے رہ گئی۔"

"مزید باتوں سے پہلے کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں؟"

"راولپنڈی میں یکم دسمبر کو پیدا ہوئی۔ پاپا آرمی میں تھے اور مما پرنسپل تھیں فوجی فاؤنڈیشن اسکول کی انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور پاپا یوپی میں پیدا ہوئے اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی' ایک میرے بھائی ہیں جو کہ پی آئی اے میں کیپٹن ہیں۔ بھائی کے بعد میرا نمبر ہے اور پھر میری ایک چھوٹی بہن ہے' وہ امریکہ میں ہوتی ہے اور تدریس کے شعبے سے وابستہ ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں اور میں نے شادی نہیں کی۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں کیوں۔۔۔ شادی کا کبھی موڈ بنا ہی نہیں۔۔۔ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ شادی کر لو۔ سوچ لو۔۔۔ تو میں یہی کہتی ہوں کہ دنیا میں جہاں اربوں لوگوں کی شادیاں ہو رہی ہیں' وہاں اگر ایک آدھ ۔۔۔ کی شادیاں نہ بھی ہوئیں تو کیا فرق پڑتا ہے دنیا کو۔"

"دنیا کو تو فرق پڑتا ہی نہیں ہے۔ فرق تو اپنی زندگی کو پڑتا ہے۔ جب زندگی اکیلے گزارنی پڑتی ہے۔"

"ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں لیکن میں نے

دیکھا ہے کہ جن کی شادیاں ہوئی ہوتی ہیں' وہ کون سی بہت اچھی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور یہ نہ کہیں کہ اکیلے انسان کی زندگی نہیں ہوتی یا ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ اللہ نے ہر انسان کو اپنی یاد کے لیے رکھا ہوا ہے تو کسی کو کس انداز میں یاد کرواتا ہے تو کسی کو کس انداز میں۔"

"فورس تو سب نے کیا ہو گا؟"

"بالکل کیا۔ مما پاپا نے بہت کیا' فیملی نے بھی بہت فورس کیا۔ دوستوں نے بھی بہت کیا... رشتے داروں نے بھی بہت فورس کیا... پھر میں باہر چلی گئی کہ کوئی کہنے والا تو نہیں ہو گا کہ شادی کر لو... بڑے سکون سے گزرے گی زندگی' مگر جان چھوٹی نہیں کیونکہ ابھی بھی سب کہتے ہیں کہ شادی کر لو۔"

"گھریلو امور سے دلچسپی؟"

"بالکل ہے' کافی ہے... مگر ٹائم ملتا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری شوٹ کا ٹائم ایسا ہوتا ہے کہ رات گھر واپسی میں ہی اتنی دیر ہو جاتی ہے تو پھر راستے سے ہی کچھ لیتی ہوئی آتی ہوں۔ ہاں جس دن گھر پہ ہوتی ہوں تو پھر بہت شوق سے کھانا پکاتی ہوں۔ اور بہت اچھا پکاتی ہوں۔"

"اکیلی ہوتی ہیں؟"

"جی ہاں... کبھی کزنز وغیرہ آجاتی ہیں اور رہ جاتی ہیں تو کبھی دو ستیں آجاتی ہیں... تو بڑا اچھا وقت گزر جاتا ہے... اور ماشاء اللہ سے یہاں دوست رشتے دار اتنے ہیں کہ اگر ایک دن بھی ریکارڈنگ کے علاوہ ملتا ہے تو اس دن کا پتا ہی نہیں چلتا... پھر گھر کے کام بھی اتنے جمع ہو جاتے ہیں۔"

"اور اس انٹرویو کے آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی آپ؟"

"ہاں... ضرور' میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اگر اس ملک میں کسی نے کسی کی دعا لینی ہے تو پلیز پلیز جانوروں سے اچھا سلوک کریں۔ میں درخواست کروں گی کیونکہ آئی ایم آ پیٹ لور۔ مجھے جانوروں سے بہت پیار ہے۔ ویسے تو اس ملک میں انسانوں کے ساتھ بھی بہت برا سلوک ہو رہا ہے' لیکن جانور چونکہ بے زبان ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا خیال رکھا کریں' کتے اور بلیاں وفادار جانور ہوتے ہیں' جو گلیوں میں پھر رہے ہوتے ہیں یا تو ان کو ختم کر دیں یا پھر ان کی حفاظت کریں۔ سچ کہہ رہی ہوں کہ ان بے زبان جانوروں کی بد دعا اس ملک کو کھا رہی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر کسی ملک کو اچھا دیکھنا ہو تو اس ملک کے جانوروں کو دیکھیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے "ہما نواب" سے اجازت چاہی۔

گزشتنی ہے سحر بھی شب بھی
گزشتنی ہیں بسنت' برسات' پوس' پت جھڑ
رتوں کے یہ سارے قافلے اور ساعتوں کے یہ سب مسافر
ہواؤں کے ساتھ آتے رہیں گے یوں ہی
مگر یہ تکرار آمد و رفت ایک تسلی سے بیشتر خاک نہیں
کہ وقت تو ایک جادہ نارسا کی مانند جاوداں ہے

وقت کا دریا بہتا رہتا ہے۔ کھلی کتاب کے صفحے الٹتے رہتے ہیں۔ آتی جاتی ساعتوں کے ساتھ رتیں بدلتی رہتی ہیں۔ کرب' واہمے' وسوسے' اذیتیں' خواب' تعبیریں... دل بہت سے موسموں سے گزرتا ہے اور اندر کی رتیں باہر کے موسموں کو بھی بدل دیتی ہیں۔ زندگی اتنی تیزی سے رنگ بدلتی ہے کہ پتا ہی نہیں چل پاتا کیا کھویا' کیا پایا۔ ہاں وقت کی کچھ ساعتیں' کچھ حسین پل دل کے آنگن میں اس طرح ٹھہر جاتے ہیں کہ کامل خوشی کا احساس نہ سہی' ایک اطمینان سا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ہمارا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

1۔ 2014ء میں کوئی ایسا لمحہ آیا' جب آپ نے کوئی اچھا کام کر کے گہرا اطمینان محسوس کیا ہوا؟
2۔ گزرے سال کا وہ لمحہ' جب کسی کا کہا ایک جملہ' کوئی اچھی بات آپ کے دل میں خوشی کا انمول احساس جگا گئی ہو؟
3۔ زندگی تیزی سے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ اپنوں سے رنجشیں' ناراضیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ کوئی ایسی ناراضی اور رنجش جسے آپ اس سال دور کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟
4۔ 2014ء میں مذہب' سیاست' میوزک' ڈراما' کھیل اور ادب کے حوالے سے آپ کی پسندیدہ شخصیات کون سی رہیں؟
5۔ ایک کتاب' جو آپ کو بہت اچھی لگی اور آپ اسے ہماری قارئین کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں گی۔

آیئے دیکھتے ہیں' ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔

اِن آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

امت الصبور

روبینہ شاہد... کراچی

(1) یہ ماہ جنوری کی ایک یخ بستہ صبح تھی' جب میرے چھوٹے بیٹے نے بالکونی کا دروازہ کھول دیا... اور ایک سرد جھونکے نے میرے چہرے کو چھوا۔

میں نے رضائی چہرے تک لے لی تھی' مگر بالکونی کی منڈیر پر بیٹھے کوے کی کائیں کائیں مجھے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی' میں غصے سے اٹھی بیٹے کو ڈانٹا اور اپنے دوپٹے کو ڈبل کر کے کوے کو شش شش کر کے بھگانے لگی مگر وہ ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا اور الٹا جب میں دوپٹا مارتی وہ اسے چونچ میں دبانے کو لپکتا' میرا بیٹا اتنی دیر میں کچن سے آدھی روٹی لے آیا اور بولا "مما یہ بہت بھوکا ہے' یہ روٹی اسے دے دیں یہ چلا جائے گا۔"

میں نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے توڑے اور اس کے سامنے دیوار پر رکھ دیے' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کائیں کائیں شروع کر دی اور کئی کوے منڈیر پر آ بیٹھے' میرا بیٹا جلدی سے روٹی کا ڈبہ اٹھا لایا۔ اور میں باقی کی بچی ہوئی ساڑھے تین روٹیاں بھی جلدی جلدی توڑنے لگی اور یوں تمام روٹی کوؤں کو ڈال دی اور کوؤں کی تعداد بڑھتی رہی' میرا بیٹا خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا اس نے منڈیر پر رکھے مٹی کے کونڈے میں پانی بھی ڈال دیا۔ تمام کوؤں نے

کھانے کے بعد آسمان کی طرف دیکھ کر کائیں کائیں کی، جیسے اپنے رب کا شکر ادا کر رہے ہوں اور اڑ گئے۔

میرا بیٹا بہت خوش تھا، بولا "مما! دیکھا آپ نے پرندے مل جل کر کھاتے ہیں، انہیں احساس ہوتا ہے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا۔"

میں بالکل بھول چکی تھی کہ اس یخ بستہ موسم میں ٹھنڈے فرش پر ننگے پیر بنا کسی گرم کپڑے کے کھڑی ہوں، کیونکہ اس وقت میرے ساتھ طمانیت کا ایک احساس تھا اور ساتھ ہی ایک سبق کہ بے زبان پرندے ہم انسانوں کو ایک سبق دے گئے کہ اپنی بھوک کے ساتھ اگر ہم دوسروں کی بھوک کا بھی احساس کریں اور مل بانٹ کر کھائیں تو بھوک و افلاس کے مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

(2) کبھی کبھی یکدم موسم بدل جاتے ہیں اور منظر تبدیل ہو جاتے ہیں، اور کسی کا کہا صرف ایک جملہ آپ کی روح میں اتر جاتا ہے اور سب کچھ بدل کے رکھ دیتا ہے۔

ہاں ایک جملہ "زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اگر ہزار بار بھی ملتی تو میں اپنے پروردگار سے یہی دعا کرتا کہ ہر بار "تم ہی میری جیون ساتھی بنو۔" یہ جملہ میرے جیون ساتھی نے مجھ سے کہا۔

(3) خدا کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، کیونکہ اس دوڑتی بھاگتی دنیا میں، نہ کسی سے کوئی رنجش ہے نہ ناراضی، سب ہم سے خوش ہیں اور ہم سب سے خوش ہیں۔

(4) پسندیدہ شخصیات

مذہبی :- مولانا طارق جمیل اپنے دلنشیں اور پراثر انداز بیان کی وجہ سے منفرد ہیں۔

سیاسی، سیاسی شخصیات میں مولانا سراج الحق پسند ہیں۔

میوزک، راحت فتح علی جو بے حد سریلے ہیں۔

ڈراما، عمیرہ احمد کا تحریر کیا ہر ڈراما (پچھلے سال کا محبت صبح کا ستارہ) اور ان کی ہر تحریر مجھے بے حد پسند ہے۔

کھیل، کرکٹ پسند ہے اور پسندیدہ کھلاڑی یونس خان۔

(5) تمام بہنوں کو میں قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔ یوں میری پسندیدہ رائٹر عمیرہ احمد ہیں اور ان کی تحریریں میں بار بار پڑھتی ہوں۔

(روبینہ آپ نے سروے بہت اچھے انداز میں، تحریر کیا ہے افسانوں پر بھی طبع آزمائی کریں۔ آپ اچھا لکھ سکتی ہیں)

کرن نعمان..... کراچی

(1) بالکل امتل جی! 2014ء میں ایک بہت خاص لمحہ میری زندگی میں آیا جس نے میری زندگی کو ایک نیا رنگ دیا۔ ہوا کچھ یوں کہ اس سال رمضان میں سحری کی نشریات جاری تھیں ان ہی باتوں کے دوران ایک رات مفتی صاحب (مجھے ان کا نام یاد نہیں آرہا) نے باحیا، باکردار اور پردہ دار عورت کا آخرت میں درجہ بتایا، ان کی باتیں سن کر میرے دل میں شدید خواہش جاگی کہ کاش میں بھی ان عورتوں میں شامل ہو جاؤں اور اسی لمحے میں نے شرعی پردے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئی۔ اس سے میں نے صرف اطمینان ہی محسوس نہیں کیا بلکہ اپنی ذات میں

سیلف کانفیڈنس پہلے سے کہیں زیادہ پایا۔ یقین کریں کہ پہلے کبھی مجبوراً "نقاب لگانا پڑ جاتا تھا تو دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا اور اب میں شادیوں میں، بازاروں میں، ہوٹلز میں پارک میں رشتے داروں کے گھر جہاں بھی جاؤں مکمل نقاب میں جاتی ہوں۔

(2) ایک ماہ قبل میری رشتے کی ایک نند اپنے شوہر، والدین اور بھائیوں بھابیوں کے ساتھ میرے گھر آئیں تو مجھے نقاب میں دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ پھر مکمل نقاب میں مہمان داری کرتے دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئیں۔ اور جاتے وقت کہنے لگیں "خدا ایسی توفیق ہر عورت کو دے" اور میرے ساتھ سب نے کہا آمین۔ ان کی یہ بات میرے دل کو انمول خوشی کا احساس دے گئی۔

(3) دور دور تک بھی کوئی میری نظر میں ایسا نہیں، جس کے لیے میرے دل میں ناراضی یا رنجش ہو، میرے جیٹھ جٹھانیاں اور ایک دیور دیورانی میری ساس اور ہمارے ماشاء اللہ اٹھارہ بچے ایک جگہ ایک ساتھ رہتے ہیں، میری شادی کو اٹھارہ سال ہو چکے ہیں، جہاں برتن ہوں وہ کھڑکتے بھی ہیں، مگر میں نے کبھی ناراضیاں نہیں پالیں۔ اپنی غلطیوں کو مان کر اپنے چھوٹے بڑوں سے معافی بھی مانگ لیتی ہوں، اس میں میں نے کبھی شرم محسوس نہیں کی۔

(4) 2014ء میں مذہب کے حوالے سے میری پسندیدہ شخصیت جنید جمشید کی تھی، ماشاء اللہ وہ کیا تھے اور کیا بنا دیا اللہ نے انہیں۔ سیاست میں مجھے کوئی پسند نہیں میوزک میں مجھے ہمیشہ رومانٹک میوزک پسند ہے۔

جب تک صرف پی ٹی وی تھا تو بہت شوق سے ڈرامے دیکھتی تھی، پر جب سے لیبل پر چینلز کی بہتات ہوئی ہے ڈراموں سے دل ہی اٹھ گیا ہے۔ پھر بھی دو ڈرامے ذرا شوق سے دیکھے وہ بھی آخری چند اقساط، ایک تو "پیارے افضل" اور دوسرا "بڑی آپا" سویرا ندیم کی وجہ سے وہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کھیل کے حوالے سے اس سال مجھے سب سے زیادہ خوشی گلی محلوں کے ان بچوں نے دی، جنھوں نے فٹ بال میں پاکستان کا دنیا بھر میں نام روشن کیا اور ان کے علاوہ جو بھی پاکستان کے لیے بہترین پرفارم کرے، کسی بھی کھیل میں مجھے پسند ہے۔

ادب کے حوالے سے وصی شاہ اس سال میرے فیورٹ رہے ان کے پروگرامز میں نے بہت شوق سے دیکھے اور دوسرا نام عمیرہ احمد کا ہے، پیر کامل کی وجہ سے، یہ ناول میں نے اس سال پڑھا اور مجھے بہت زیادہ متاثر کن لگا۔

امتل جی میں ایک نہیں دو کتابیں پڑھنے کا مشورہ دوں گی بہنوں کو۔ ایک تو اشفاق صاحب کی "زاویہ" ہے اور دوسری کتاب عصر حاضر کے صوفی بزرگ جنہیں دنیا سے گزرے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے، واصف علی واصف صاحب کی گفتگو پر مبنی کتاب جس کا نام بھی "گفتگو" ہی ہے۔

میری نظر میں آج حضرت انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی مرضی کرنا چاہتا ہے ہر معاملے میں وہ یہ نہیں دیکھتا کہ خدا کی مرضی کیا ہے۔

حرمت روا اکرم..... ڈلوال

(1) تمام تر یادداشتیں کھنگالنے پر بھی کوئی ایسی بات نہیں

یاد آئی، جس سے میں نے خود کو مطمئن پایا ہو۔ کوئی ایسا کام جس سے مجھے خود پر فخر محسوس ہوا ہو' یا اطمینان رگ و پے میں سرایت کر گیا ہو۔

دعا ہے 2015ء میں کوئی بڑی نیکی میرے حصے میں لکھ دی جائے۔

(2) 2014ء کا ایک نہیں بہت سے ایسے لمحے ہیں جس میں میری تعریف کی گئی۔ کرن میں فرحانہ ناز ملک آپی کے لیے لکھا جانے والا میرا تعزیتی آرٹیکل بہت لوگوں کو پسند آیا نا جیہ مہر اور مونا اور بہت سے لوگوں نے تعریف کی حیا بخاری آپی نے بہت زیادہ تعریف کی۔ خصوصاً" ان کا جملہ "حرمت آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ہماری رائٹر برادری کا ایک بہت اچھا اضافہ ثابت ہو سکتی ہیں آپ"

ام طیفور آپی نے تو بہت دفعہ تعریف کی۔

تنزیلہ ریاض آپی نے کہا تھا۔ "حرمت آپ کی نالج بہت اچھی ہے' آپ میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ موجود ہے۔" عام روٹین میں بھی بہت سے اچھے جملے سننے کو ملتے رہے' اپنی ذات کے حوالے سے بھی اور ویسے بھی' مثلاً" "حرمت! تم بہت خالص ہو۔ تمہارے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پہ اور "حرمت! تم ایک کھلی کتاب کی مانند ہو۔ کوئی باب کسی سے پوشیدہ نہیں" مگر اس جملے کی صداقت پہ شک ہے کہ بہت سے ایسے راز ہیں جن سے میرے علاوہ کوئی واقف نہیں (ہی ہی ہی)

جہان سے انسپائر ہوں ناں! حرمت کو اپنے اور دوسروں کے راز رکھنے آتے ہیں۔"

(3) زندگی پل پل گھڑی۔ اختتام کے قریب اور قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ سو ایسے وقت میں اگر کوئی ناراض ہو تو میرا غصہ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔

زبان کی کڑوی' تلخ ضرور ہوں مگر تب تک جب بات دل میں ہو۔ جونہی اپنی بھڑاس نکال لی۔ دل پاک صاف ہو جاتا ہے۔ میں کسی کو زیادہ عرصہ بلکہ عرصہ کیا تین دن سے زیادہ ناراض ہی نہیں رہنے دیتی خود سے' یا من جاتی ہوں یا پھر منا لیتی ہوں۔ مگر کچھ رشتے ایسے بھی ہیں جن کو میں اپنی زندگی میں سب کچھ ہار کر بھی یا پھر سب کچھ جیت کر بھی کبھی معاف نہیں کر پاؤں گی۔ نہ اگلے سال اور نہ ہی آئندہ کبھی مناؤں گی۔

(4) 2014ء میں مذہب کے حوالے سے حریم خان (میری نیٹ فرینڈ) ان کی معلومات نے بہت متاثر کیا۔ سیاست سے مجھے انتہائی حد تک نفرت ہو چکی ہے۔ میوزک کے حوالے سے "راحت فتح علی خان" کا "تیری آنکھوں کے درمیان کا" ایک انتہائی بہترین کاوش تھی اس کے علاوہ کسی گانے نے متاثر نہیں کیا' اور جہاں تک بات ہے ڈرامے کی تو انڈین اور ترکی ڈراموں کی آمد نے میری ٹی وی سے دلچسپی انتہائی کم کر دی ہے اور ستم در ستم کہ ہمارے تمام اچھے اچھے ناولز کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ڈرامے کے نام پہ' اس نے تو ٹی وی سے دل بالکل ہی اچاٹ کر دیا ہے۔ کھیل تو اس سال بھی "دی لیجنڈ لالہ" شاہد خان آفریدی کا ہی بہترین تھا کہ میں ان کی بہت بچپن سے فین بلکہ "اے سی" ہوں اور ادب تو اس سال جو پڑھا اس میں "جنت کے پتے" ہی سب سے اچھا لگا" سو "نمرہ احمد" کا نام لوں گی۔

(5) میری پسندیدہ کتاب ہے تو سب ہی کو پسند' مگر اپنی روزمرہ کی روٹین میں ہم بھاگتے دوڑتے اس کتاب سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ پڑھنے کے بجائے بک ریک میں سب سے اوپر یا پھر طاقوں میں ہی سجاتے ہیں صرف۔

سو میں تو سب ہی قارئین کو "قرآن پاک" ترجمے کے ساتھ پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔ اور اس کے علاوہ "بچپن کا دسمبر" بھی ایک انتہائی خوب صورت اور پڑھی جانے کے قابل کتاب ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ پاک سبھی قارئین بہنوں کے لیے آنے والا سال انتہائی خوب صورت اور مسرتوں کی نوید لے کر آئے۔

ثمینہ اکرم۔۔۔۔ بہار کالونی لیاری کراچی

(1) گزشتہ برس بہت سے ایسے لمحات آئے۔ ایک مرتبہ کھارادر کی مصروف سڑک جس کے اطراف کئی اسکولز واقع ہیں اور ٹریفک بھی دونوں سائیڈ سے بہت تیزی سے آتی ہے۔ ایک اسکول کا بچہ روڈ کراس کر رہا تھا کہ اچانک دوسری سائیڈ سے ایک ہیوی ٹرک آیا نظر آتا۔ میں نے آناً" فاناً" بھاگ کر اس بچے کو گھسیٹ لیا اور سیف سائیڈ پر کر دیا۔ جبکہ میں خود چاروں طرف سے گاڑیوں کے نرغے میں پھنس گئی۔ بچے کو صحیح سلامت دیکھ کر ایک گہرا اطمینان محسوس کیا۔۔۔۔

ورنہ ذرا سی دیر ہو جاتی تو۔۔۔

اسی طرح میں اکثر اپنے علاج کی غرض سے سول اسپتال کراچی میں آتی جاتی رہتی ہوں۔۔۔۔ سول اسپتال بہت بڑا ہے ہر وارڈز اور او پی ڈی مختلف جگہوں پر بنی ہوئی ہیں۔

سول اسپتال میں ہر روز ہزاروں مریض علاج کے لیے آتے ہیں۔ اندرون سندھ کے لوگ بھی بہ غرض علاج وہاں موجود ہوتے ہیں۔ ایک اندرون سندھ سے آئی عورت اپنے بیمار بچے کو گود میں لیے بیٹھی رو رہی تھی۔۔۔۔ ڈاکٹر نے اسے سرجیکل وارڈ میں جانے کا کہا تھا اور وہ اسے معلوم نہیں تھا' کوئی اسے بتا بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے کہا آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں مختلف لوگوں سے آگاہی لیتی سرجیکل وارڈ میں پہنچی۔ بچے کا چیک اپ کرایا۔ ڈاکٹر نے مختلف ٹیسٹ لکھ کر دیے' میں وہ سب کرانے کے لیے بھی مختلف جگہوں پر اس کے ساتھ گئی۔ جب اس کے سب لیب ٹیسٹ ہو گئے تو میں نے اس سے اجازت چاہی جبکہ اس دوران میرا اپنا ڈاکٹر کے چیک اپ کا نمبر نکل گیا تھا مگر جس طرح مجھے اس عورت نے دعائیں دیں یقین جانیں ایک انمول خوشی' گہرا سکون اور اطمینان میں نے محسوس کیا۔

(2) دوران سفر میرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور میں مسلسل اس پر کچھ نہ کچھ ذکر اللہ پڑھتی رہتی ہوں (معیز کے جانے کے بعد یہ عادت پختہ ہو گئی۔ ہے کہ میں اس کے ایصال ثواب کے لیے زیادہ سے زیادہ کلمہ طیبہ پڑھ سکوں۔) میں چنگ چی رکشہ میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ میرے برابر ایک عورت آکر بیٹھی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔۔۔۔ میں۔ نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بولی کہ بیٹی

بقیہ صفحہ نمبر 278

عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں' جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کررہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ ریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز

فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

ا۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پارہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد 'مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی' جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرادی۔

۸۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بد دیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اسے بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہوکر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آلگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی' اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ لان میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ

ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار' احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایئرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس بینکوئٹ ہال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینکوئٹ ہال میں داخل ہو گا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے 'امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان' طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار' امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

تیسری قسط

"اسلام آباد چلو گی؟" اس کے اگلے جملے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔

وہ سب کچھ جو وہ سوچ کر آئی تھی' اس کے ذہن سے غائب ہو گیا۔

"اسلام آباد؟" اس نے بے حد بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔

"ہاں' میں اس ویک اینڈ پر جا رہا ہوں۔" سالار نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔

"لیکن میں..... میں کیسے جا سکتی ہوں؟" وہ بے اختیار اٹکی۔ "تمہارے پاپا تو تمہیں منع کر کے گئے ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ اسلام آباد نہ لے کر آنا۔ پھر؟" سالار نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں..... اور اب وہی کہہ رہے ہیں کہ اگر میں تمہیں ساتھ لانا چاہوں تو لے آؤں۔" اس نے بڑی روانی سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"میری فیملی کو پتا لگ سکتا ہے۔" اس نے لمبی خاموشی کے بعد بالآخر کہا۔

"آج یا کل تو پتا لگنا ہی ہے۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ "یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ساری عمر تمہیں چھپا کر رکھوں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "تمہاری فیملی نے تمہارے بارے میں لوگوں سے کہا ہے کہ تم شادی کے بعد بیرون ملک سیٹل ہو گئی ہو۔ اب اتنے سالوں کے بعد تمہارے حوالے سے کچھ کریں گے تو خود انہیں بھی ایمبیرسمنٹ ہو گی۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ کریں گے۔" وہ مطمئن تھا۔

"تم انہیں نہیں جانتے' انہیں پتا چل گیا تو وہ چپ نہیں بیٹھیں گے۔" وہ پریشان ہونے لگی تھی۔

"وہاں کبھی کبھار جایا کریں گے' خاموشی سے جائیں گے اور آجایا کریں گے۔ یار! اتنا سوشلائز نہیں کریں گے وہاں۔" وہ اس کی بے فکری سے چڑی۔

"انہیں پتا چلا تو وہ مجھے لے جائیں گے..... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"فرض کرو امامہ! اگر انہیں اتفاقاً" تمہارے بارے میں پتا چلتا ہے یا یہاں لاہور میں تمہیں کوئی دیکھ لیتا ہے' تمہیں کوئی نقصان پہنچاتے ہیں تو.....؟"

"نہیں پتا چلے گا' میں کبھی باہر جاؤں گی ہی نہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"تمہارا دم نہیں گھٹے گا اس طرح.....؟" اس نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں مسیحا جیسی ہمدردی تھی۔

"مجھے عادت ہو گئی ہے سالار..... اتنا ہی سانس لینے کی..... مجھے فرق نہیں پڑتا۔ جب میں جاب نہیں کرتی تھی تو مہینوں گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ میں اتنے سالوں سے لاہور میں ہوں لیکن میں نے یہاں بازاروں' پارکس اور ریسٹورنٹس کو صرف سڑک پر سفر کرتے ہوئے باہر سے دیکھا ہے یا ٹی وی اور نیوز پیپرز میں۔ میں اگر اب ان جگہوں پر جاؤں تو میری سمجھ میں ہی نہیں آئے گا کہ مجھے وہاں کرنا کیا ہے۔ جب ملتان میں تھی تو بھی ہاسٹل اور کالج کے علاوہ دوسری کوئی جگہ نہیں تھی میری زندگی میں۔ اب لاہور آگئی تو یہاں بھی پہلے یونیورسٹی اور گھر..... اور اب گھر..... مجھے ان کے علاوہ دوسری ساری جگہیں عجیب سی لگتی ہیں۔ مہینے میں ایک بار میں سعیدہ اماں کے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں ان کے ساتھ جاتی تھی' وہ میری واحد آؤٹنگ ہوتی تھی۔ وہاں ایک بک شاپ تھی۔ میں پورے مہینے کے لیے بکس لے لیتی تھی وہاں سے۔ کتاب کے ساتھ وقت گزارنا آسان ہوتا ہے۔"

وہ پتا نہیں اسے کیوں بتاتی گئی۔

"ہاں' وقت گزارنا آسان ہوتا ہے' زندگی گزارنا نہیں۔"

اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا' وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

"مجھے فرق نہیں پڑتا سالار۔"

"مجھے فرق پڑتا ہے..... اور بہت فرق پڑتا ہے۔" سالار نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔ "میں ایک نارمل

زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ جیسی کبھی تمہاری زندگی تھی۔ تم نہیں چاہتیں یہ سب کچھ ختم ہو جائے...؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ابنارمل لائف ہی سہی لیکن میں سیف ہوں۔"

سالار نے بے اختیار اس کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلایا۔

"تم اب بھی سیف رہو گی... ٹرسٹ می... کچھ نہیں ہو گا... میری فیملی تمہیں پروٹیکٹ کر سکتی ہے اور اگر تمہاری فیملی کو اب یہ پتا چلتا ہے کہ تم میری بیوی ہو تو اتنا آسان نہیں ہو گا ان کے لیے تمہیں نقصان پہنچانا۔ جو بھی ہونا ہے' ایک بار کھل کر ہو جائے۔ تمہیں اس طرح چھپا کر رکھوں اور انہیں کسی طرح علم ہو جائے تو وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ایسی صورت میں ہمیں پولیس کے پاس جا کر بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ تم نو سال سے غائب ہو اور وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" وہ خاموش رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" سالار نے بولتے بولتے اس کی خاموشی نوٹس کی۔

"مجھے تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہیے تھی... کسی کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہیے تھی... میں نے اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" وہ بے حد اپ سیٹ ہو گئی۔

"ہاں' اگر تم کسی اور کے ساتھ شادی کرتیں تو یہ واقعی ان فیئر ہوتا لیکن میری کوئی بات نہیں۔ میں نے تو خیر پہلے بھی تمہاری فیملی کی بہت گالیاں اور بددعائیں لی ہیں' اب پھر سہی۔" وہ بڑی لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"تو پھر سیٹ بک کروا دوں تمہاری؟" وہ واقعی ڈھیٹ تھا۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔

"کچھ نہیں ہو گا امامہ... مارک مائی ورڈ۔" سالار نے اسٹیئرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"تم کوئی ولی نہیں ہو۔" اس نے خفگی سے کہا۔

اس کے کندھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے وہ بے اختیار ہنسا۔

"اچھا' میں نے کب کہا کہ میں ولی ہوں۔ میں تو شاید انسان بھی نہیں ہوں۔"

اس کے اس جملے پر اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اب ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔" اس نے اپنے چہرے پر امامہ کی نظریں محسوس کیں۔ "ویسے ہی پاپا چاہتے ہیں ہم وہاں آئیں۔"

امامہ نے اس بار جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس شام سالار کو ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کچھ سنجیدہ لگے تھے اور اس سنجیدگی کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ امامہ بھی کھانے کے دوران بالکل خاموش رہی تھی' لیکن اس نے اس کی خاموشی کو گاڑی میں ہونے والی گفتگو کا نتیجہ سمجھا۔

وہ لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب ڈاکٹر سبط علی نے اس موضوع کو چھیڑا۔

"سالار! امامہ کو کچھ شکایتیں ہیں آپ سے۔" وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ٹھٹکا۔ یہ بات اگر ڈاکٹر سبط علی نے نہ کہی ہوتی تو وہ اسے مذاق سمجھتا۔ اس نے کچھ حیرانی کے عالم میں ڈاکٹر سبط علی کو دیکھا' پھر اپنے برابر میں بیٹھی امامہ کو۔ وہ چائے کا کپ اپنے گھٹنے پر رکھے چائے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال گاڑی

میں ہونے والی گفتگو کا آیا لیکن امامہ نے کس وقت ڈاکٹر صاحب کو گاڑی میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تھا...؟... وہ بے حد حیران ہوا۔

"جی...!" اس نے کپ واپس پرچ میں رکھ دیا۔

"امامہ آپ کے رویے سے ناخوش ہیں۔" ڈاکٹر سبط علی نے اگلا جملہ بولا۔

سالار کو لگا' اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

"جی..." اس نے بے اختیار کہا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

"آپ امامہ پر طنز کرتے ہیں...؟" وہ پلکیں جھپکے بغیر ڈاکٹر سبط علی کو دیکھتا رہا۔ بمشکل سانس لے کر چند لمحوں بعد اس نے امامہ کو دیکھا۔

"یہ آپ سے امامہ نے کہا؟" اس نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سبط علی سے کہا۔

"ہاں' آپ اس سے ٹھیک سے بات نہیں کرتے۔"

سالار نے گردن موڑ کر ایک بار پھر امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"یہ بھی آپ سے امامہ نے کہا؟" اس کے تو جیسے چودہ طبق روشن ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر سبط علی نے سرہلایا۔ سالار نے بے اختیار اپنے ہونٹ کا ایک کونا کاٹتے ہوئے چائے کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن بری طرح چکرا گیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے پریشان کن صورت حال میں سے ایک تھی۔

امامہ نے چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے بے حد شرمندگی اور پچھتاوے کے عالم میں اس کو گلا صاف کرتے ہوئے' کہتے سنا۔ "اور...؟"

جو کچھ ہو رہا تھا' یہ امامہ کی خواہش نہیں تھی' حماقت تھی' لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"اور یہ کہ آپ کہیں جاتے ہوئے اسے انفارم نہیں کرتے۔ پرسوں آپ جھگڑا کرنے کے بعد اسے سعیدہ بہن کی طرف چھوڑ گئے تھے۔" اس بار سالار نے پہلے کلثوم آنٹی کو دیکھا پھر ڈاکٹر سبط علی کو... پھر امامہ کو... اگر آسمان اس کے سر پر گرتا تب بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت ہوئی تھی۔

"جھگڑا...؟ میرا تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔" اس نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

"اور امامہ نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ سعیدہ اماں کے گھر رہنا چاہتی ہے اور میں تو پچھلے چار دنوں سے کہیں۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

اس نے امامہ کی سسکی سنی تھی۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر امامہ کو دیکھا' وہ اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔ کلثوم آنٹی اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سالار بات جاری نہیں رکھ سکا۔ کلثوم آنٹی اٹھ کر اس کے پاس آکر اسے دلاسا دینے لگیں۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سبط علی نے ملازم کو پانی لانے کے لیے کہا۔

سالار کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس وقت وہاں اپنی صفائیاں دینے اور وضاحت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا' وہ الو کا پٹھا ہے کیونکہ پچھلے چار دن سے اس کی چھٹی حس جو سگنلز بار بار دے رہی تھی' وہ بالکل ٹھیک تھے۔ صرف اس نے خوش فہمی اور لاپروائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پانچ دس منٹ کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً" آدھے گھنٹے تک سالار کو سمجھاتے رہے۔ وہ خاموشی سے سرہلاتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے برابر بیٹھی امامہ کو بے حد ندامت ہو رہی تھی۔ اس کے بعد سالار کا اکیلے میں سامنا کرنا کتنا مشکل تھا۔ یہ اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی ڈاکٹر سبط علی کے گھر کے گیٹ

سے باہر نکلتے ہی امامہ نے اسے کہتے سنا۔
"مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں یقین نہیں کر سکتا۔"
اسے اس سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔ وہ ونڈ اسکرین سے نظر آتی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی اس وقت بے حد نروس ہو رہی تھی۔
"میں تم پر طنز کرتا ہوں.... تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا.... تمہیں بتائے بغیر جاتا ہوں.... تمہیں سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ گیا تھا.... جھگڑا کیا۔ تم نے ان لوگوں سے جھوٹ بولا؟"
امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ جھوٹ کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسے اتنا برا نہ لگتا۔
"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" اس نے بے حد خفگی سے کہا۔
"میں تم پر طنز کرتا ہوں؟" سالار کی آواز میں تیزی آگئی۔
"تم نے اس رات میری اندھیرے میں سونے کی عادت کو "عجیب" کہا۔" وہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔
"وہ طنز تھا؟ وہ تو بس ایسے ہی ایک بات تھی۔"
"مگر مجھے اچھی نہیں لگی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔
"تم نے بھی تو جواباً "میری روشنی میں سونے کی عادت کو عجوبہ کہا تھا۔" وہ اس بار چپ رہی۔ سالار واقعی بہت زیادہ ناراض ہو رہا تھا۔
"اور میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا....؟" وہ اگلے الزام پر آیا۔
"مجھے لگا تھا۔" اس نے اس بار مدافعانہ انداز میں کہا۔
"لگا تھا....؟" وہ مزید خفا ہوا۔ "تمہیں صرف "لگا" اور تم نے سید ھا ڈاکٹر صاحب سے جا کر کہہ دیا۔"
"میں نے ان سے کچھ نہیں کہا' سعیدہ اماں نے سب کچھ کہا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔
وہ چند لمحے صدمے کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکا۔
"یعنی تم نے ان سے بھی یہ سب کچھ کہا ہے؟" وہ چپ رہی۔
وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ اسے اب سعیدہ اماں کی اس رات کی بے رخی کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔
"اور میں کہاں جاتا ہوں' جس کے بارے میں' میں نے تمہیں نہیں بتایا....؟" سالار کو یاد آیا۔
"تم سحری کے وقت مجھے بتا کر گئے؟" سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
"امامہ! میں مسجد جاتا ہوں اس وقت فرقان کے ساتھ۔ اس کے بعد جم اور پھر واپس گھر آجاتا ہوں۔ اب میں مسجد بھی تمہیں بتا کر جایا کروں؟" وہ جھنجلایا تھا۔
"مجھے کیا پتا تم اتنی صبح کہاں جاتے ہو....؟ مجھے تو اپ سیٹ ہونا ہی تھا۔" امامہ نے کہا۔
اس کی وضاحت پر وہ مزید تپ گیا۔
"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں رمضان میں سحری کے وقت کہاں جا سکتا ہوں....؟ کسی نائٹ کلب....؟ یا کسی گرل فرینڈ سے ملنے....؟ کوئی احمق بھی جان سکتا ہے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔" وہ احمق کے لفظ پر بری طرح تلملائی۔
"ٹھیک ہے' میں واقعی احمق ہوں.... بس۔"
"اور سعیدہ اماں کے گھر میں رہنے کا تم نے کہا تھا.... کہا تھا نا.... اور کون سا جھگڑا ہوا تھا تمہارا؟"
وہ خاموش رہی۔

"اتنے زیادہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟" وہ اس بار اس کی بات پر روہانسی ہو گئی۔
"بار بار مجھے جھوٹا مت کہو۔"
"امامہ! جو جھوٹ ہے' میں اسے جھوٹ ہی کہوں گا۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کیا سوچ رہے ہوں گے وہ میرے بارے میں....؟" وہ واقعی بری طرح اپ سیٹ تھا۔
"اچھا اب یہ سب ختم کرو۔" اس نے امامہ کے گالوں پر یک دم بہنے والے آنسو دیکھ لیے تھے اور وہ بری طرح جھنجلایا تھا۔ "ہم جس ایشو پر "بات" کر رہے ہیں امامہ! اس میں رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ روتی رہی۔
"یہ ٹھیک نہیں ہے امامہ!.... تم نے ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی یہی کیا تھا میرے ساتھ۔"
اس کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا لیکن جھنجلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا' وہ اس کی شادی کا چوتھا دن تھا اور وہ ایک گھنٹے میں دوسری بار یوں زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی یوں رو رہی ہوتی تو وہ پریشان ہوتا' یہ تو خیر امامہ تھی۔ وہ بے اختیار نرم پڑا۔ اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اس نے جیسے اسے چپ کروانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اپنی سرخ ہوتی ہوئی ناک کو رگڑا اور سالار کی صلح کی کوششوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔
"میں اسی لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پتا تھا' تم میرے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرو گے۔"
وہ اس کے جملے پر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا پھر اس نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔
"کیسا سلوک.... تم وضاحت کرو گی؟" اس کے لہجے میں پھر خفگی اتر آئی "میں نے آخر کیا کیا ہے تمہارے ساتھ۔"
وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ سالار نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کیں۔ وہ ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو یقیناً "سر بھی پکڑ لیتا۔ باقی رستے دونوں میں کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر چپ ہو گئی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔
اپارٹمنٹ میں آکر بھی دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ بیڈ روم میں جانے کے بجائے لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ سالار بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر بیڈ روم میں آیا' وہ تب بھی اندر نہیں آئی تھی۔ "اچھا ہے' اسے بیٹھ کر اپنے رویے کے بارے میں کچھ دیر سوچنا چاہیے...." اس نے اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ وہ سونا چاہتا تھا اور اس نے بیڈ روم کی لائٹس آف نہیں کی تھیں لیکن نیند یک دم اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے' بندہ سوچے لیکن اتنا بھی کیا سوچنا۔ مزید پانچ منٹ گزرنے کے باوجود اس کے نمودار نہ ہونے پر وہ بے اختیار جھنجلایا۔ دو منٹ مزید گزرنے کے بعد وہ بیڈ روم سے نکل آیا۔
وہ لاؤنج کے صوفے کے ایک کونے میں' دونوں پاؤں اوپر رکھے' کشن گود میں لیے بیٹھی تھی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اس وقت رو نہیں رہی تھی۔ سالار کے لاؤنج میں آنے پر اس نے سر اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اسی طرح کشن کو گود میں لیے اس کے دھاگے کھینچتی رہی۔ وہ اس کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ کشن کو ایک طرف رکھتے ہوئے امامہ نے بے اختیار صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ سالار نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔
"یہیں بیٹھو۔" اس نے تحکمانہ انداز میں اس سے کہا۔
اس نے ایک لمحے کے لیے بازو چھڑانے کا سوچا' پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی لیکن اس نے اپنے بازو سے سالار کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے..... لیکن آئی ایم سوری۔" اس نے مصالحت کی پہلی کوشش کا آغاز کیا۔
امامہ نے خفگی سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ فی الحال اس کی معذرت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔
"تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہا.....؟ امامہ! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" اس نے اس کے خاموش رہنے پر کہا۔
"تم مجھے اگنور کرتے رہے۔" ایک لمحے توقف کے بعد اس نے بالآخر کہا۔
"اگنور؟" وہ بھونچکا رہ گیا۔ "میں تمہیں..... "تمہیں" اگنور کرتا رہا..... میں کر "سکتا" ہوں؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔ امامہ نے اس سے نظریں نہیں ملائیں۔
"تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ.....؟ تمہیں "اگنور" کرنے کے لیے شادی کی تھی میں نے تم سے؟ تمہیں اگنور کرنے کے لیے اتنے سالوں سے خوار ہوتا پھر رہا ہوں میں۔"
"لیکن تم کرتے رہے....." وہ اپنی بات پر مصر تھی۔ "تم زبان سے ایک بات کہتے ہو لیکن تم....." وہ بات کرتے کرتے رکی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "تمہاری زندگی میں میری کوئی..... کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔"
"رکو مت کہتی رہو..... میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں ایسا کیا کر رہا ہوں، جس سے تمہیں میرے بارے میں اتنی غلط فہمیاں ہو رہی ہیں۔" اس نے اس کی آنکھوں کی نمی کو نظر انداز کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"میں نے تمہیں صبح مسجد جاتے ہوئے نہیں بتایا..... آفس جاتے ہوئے بھی نہیں بتایا..... اور؟" اس نے گفتگو شروع کرنے کے لیے اسے کیو دی۔
"تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم افطار پر دیر سے آؤ گے۔ تم چاہتے تو جلدی بھی آسکتے تھے۔" وہ رکی۔
"اور.....؟" سالار نے کوئی وضاحت کیے بغیر کہا۔
"میں نے تمہارے کہنے کے مطابق تمہیں میسج کیا لیکن تم نے مجھے کال نہیں کی۔ اپنے پیرنٹس کو ریسیو کرنے یا چھوڑنے کے لیے تم مجھے بھی ایئرپورٹ لے جاسکتے تھے لیکن تم نے مجھ سے نہیں کہا۔ ٹھیک ہے، میں نے کہا تھا کہ مجھے سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ دو، لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔ میری کتنی بے عزتی ہوئی ان کے سامنے۔"
وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔
وہ پلک جھپکے بغیر یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پانی اب اس کی آنکھوں سے ہی نہیں، ناک سے بھی بہنے لگا تھا۔ وہ پوری دل جمعی سے رو رہی تھی۔ سالار نے سینٹر ٹیبل کے ٹشو باکس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر خود ایک ٹشو پیپر نکال لیا۔ اس نے ناک رگڑی تھی، آنکھیں نہیں۔
"اور.....؟" سالار نے بڑے تحمل کے ساتھ ایک بار پھر کہا۔
وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے شادی کا کوئی گفٹ تک نہیں دیا۔ اس کی ایک دکھتی رگ یہ بھی تھی لیکن اس سے تحفے کا ذکر کرنا اسے اپنی توہین لگی۔ اس نے تحفے کا ذکر نہیں کیا۔ کچھ دیر وہ اپنی ناک رگڑتی، سسکیوں کے ساتھ روتی رہی۔ سالار نے بالآخر اس سے پوچھا۔
"بس یا ابھی کچھ اور بھی جرم ہیں میرے؟"
"مجھے پتا تھا کہ تم شادی کے بعد میرے....."
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔
"ساتھ یہی کرو گے..... مجھے پتا ہے، تمہیں میرے بارے میں سب کچھ پہلے سے ہی پتا چل جاتا ہے۔" وہ اس

کے جملے پر بری طرح چڑا تھا۔ "اس کے باوجود اب تم مجھے کچھ کہنے کا موقع دو گی.....؟" وہ چپ بیٹھی اپنی ناک رگڑتی رہی۔
"اگر میں شادی کے اگلے دن آفس سے جلدی آسکتا تو آجاتا" آج آیا ہوں نا جلدی۔"
"تم اپنے پیرنٹس کے لیے تو آگئے تھے۔" امامہ نے مداخلت کی۔
"اس دن میری پریزنٹیشن نہیں تھی اور میں نے تمہیں کال کی تھی۔ ایک بار نہیں، کئی بار..... تم اپنا سیل فون دیکھو یا میں دکھاؤں۔" سالار نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔
"میرے میسج کرنے پر تو نہیں کی تھی نا؟"
"اس وقت میں میٹنگ میں تھا، میرا سیل میرے پاس نہیں تھا۔ بورڈ روم سے نکل کر پہلی کال میں نے تمہیں ہی کی تھی، ریسیو کرنا تو ایک طرف تم نے توجہ تک نہیں دی۔ میں نے سعیدہ اماں کے گھر بھی تمہیں کالز کیں، تم نے وہاں بھی یہی کیا بلکہ سیل ہی آف کر دیا۔ تو مجھے بھی ناراض ہونا چاہیے تھا، مجھے کہنا چاہیے تھا کہ تم مجھے اگنور کر رہی ہو لیکن میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو سوچا تک نہیں اس چیز کے بارے میں۔" وہ اب اسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔
"تمہیں اپنے ساتھ ایئرپورٹ لے کر جانا تو ممکن ہی نہیں تھا..... ایئرپورٹ ایک طرف ہے..... بیچ میں میرا آفس ہے..... اور دوسری طرف گھر..... میں پہلے یہاں آتا..... تمہیں لے کر پھر ایئرپورٹ جاتا..... دگنا ٹائم لگتا..... اور تمہارے لیے انہیں ایئرپورٹ جا کر ریسیو کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر بولا۔
"اب میں شکایت کروں تم سے؟"
امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
"تم نے سعیدہ اماں کے گھر پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، مجھ سے پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی۔" اس کی آنکھوں میں سیلاب کا ایک نیا ریلا آیا۔
"میرا خیال تھا، تم مجھے وہاں رہنے ہی نہیں دو گے، لیکن تم تو تنگ آئے ہوئے تھے مجھ سے۔ تم نے مجھے ایک بار بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔"
سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔
"مجھے کیا پتا تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہاری خواہش ہے، مجھے پوری کرنی چاہیے۔ چلو ٹھیک ہے، میری غلطی تھی۔ مجھے کہنا چاہیے تھا تمہیں چلنے کے لیے، لیکن کم از کم تمہیں مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے باہر تک تو آنا چاہیے تھا۔ میں پندرہ منٹ صحن میں کھڑا انتظار کرتا رہا لیکن تم نے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر آنے کی زحمت نہیں کی۔"
"میں ناراض تھی، اس لیے نہیں آئی۔"
"ناراضی میں بھی کوئی فارمیلٹی تو ہوتی ہے نا.....؟" وہ خاموش رہی۔
"تم نے فرقان کے حوالے سے ضد کی کہ مجھے وہاں نہیں جانا۔ خواہ مخواہ کی ضد تھی۔ مجھے برا لگا تھا لیکن میں نے تمہیں اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کیا۔" وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ "فرقان میرا سب سے زیادہ کلوز فرینڈ ہے۔ فرقان اور بھابھی نے ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا ہے اور یہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ میری وائف اس فیملی کی عزت نہ کرے۔"
اس کی آنکھوں میں امڈتے سیلاب کے ایک اور ریلے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔ امامہ نے اس بار کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔

"میں نے تم سے یہ گلہ بھی نہیں کیا کہ تم نے میرے پیرنٹس کو ایک دفعہ بھی کال کر کے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ٹھیک سے پہنچ گئے یا ان کی فلائٹ ٹھیک رہی۔" وہ بڑے تحمل سے کہہ رہا تھا۔ وہ جز بز ہوئی۔

"میرے پاس ان کا نمبر نہیں ہے۔"

"تم مجھ سے لے لیتیں اگر تم واقعی ان سے بات کرنے میں انٹرسٹڈ ہوتیں۔ وہ تمہارے لیے یہاں آئے تھے تو تمہاری اتنی ذمہ داری تو بنتی تھی نا کہ تم ان کی فلائٹ کے بارے میں ان سے پوچھتیں یا ان کے جانے کے بعد ان سے بات کرتیں۔"

"تو تم مجھ سے کہہ دیتے۔ کیوں نہیں کہا...؟"

"میں نے اس لیے نہیں کہا کیونکہ یہ میرے نزدیک کوئی ایشوز نہیں ہیں' یہ معمولی باتیں ہیں۔ یہ ایسے ایشوز نہیں ہیں کہ جن پر میں تم سے ناراض ہوتا پھروں یا جھگڑا کروں۔" وہ بول نہیں سکی۔

"لیکن تم نے یہ کیا کہ میرے خلاف کیس تیار کرتی رہیں... ہر چھوٹی بڑی بات دل میں رکھتی رہیں' مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی... لیکن سعیدہ اماں کو سب کچھ بتایا... اور ڈاکٹر صاحب کو بھی... کسی دوسرے سے بات کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی... کرنی چاہیے تھی نا...؟"

اس کے آنسو تھمنے لگے۔ وہ اسے بڑے تحمل سے سمجھا رہا تھا۔

"اگر میں تمہاری بات نہ سنتا تو اور بات تھی۔ پھر تم کہتیں کسی سے بھی' مجھے اعتراض نہ ہوتا۔" وہ خاموش رہی۔ اس کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔

"تم سو نہ رہی ہوتیں تو میں یقیناً" تمہیں بتا کر ہی گھر سے نکلتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں لیکن ایک سوئے ہوئے بندے کو صرف یہ بتانے کے لیے اٹھاؤں کہ میں جا رہا ہوں' یہ تو میں کبھی نہیں کر سکتا۔"

وہ کچھ بول نہ سکی۔

"اگنور... ؟ میں حیران ہوں امامہ! کہ یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آگیا۔ میں چار دن سے ساتویں آسمان پر ہوں اور تم کہہ رہی ہو' میں تمہیں اگنور کر رہا ہوں۔"

"لیکن تم نے ایک بار بھی میری تعریف نہیں کی۔" امامہ کو ایک اور "خطا" یاد آئی۔

سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کس چیز کی تعریف؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ ایک بے حد احمقانہ سوال تھا لیکن اس سوال نے امامہ کو شرمندہ کیا تھا۔

"اب یہ بھی میں بتاؤں؟" وہ بری طرح بگڑی تھی۔

"تمہاری خوب صورتی کی؟" سالار نے کچھ الجھ کر اندازہ لگایا۔ وہ مزید خفا ہوئی۔

"میں کب کہہ رہی ہوں خوب صورتی کی کرو۔ کسی بھی چیز کی تعریف کر دیتے' میرے کپڑوں کی کر دیتے۔"

اس نے کہہ تو دیا لیکن وہ یہ شکایت کرنے پر پچھتائی۔ سالار کے جوابی سوالوں نے اسے بری طرح شرمندہ کیا تھا۔ سالار نے ایک نظر اسے' پھر اس کے کپڑوں کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور بے اختیار ہنسا۔

"امامہ! تم مجھے اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ جیسے اس کے لیے مذاق تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"مت کرو' میں نے کب کہا ہے۔"

"نہیں' یو آر رائٹ۔ میں نے واقعی ابھی تک تمہیں کسی بھی چیز کے لیے نہیں سراہا۔ مجھے کرنا چاہیے تھا۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے امامہ کی شرمندگی محسوس کر لی تھی۔

اس کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اس نے امامہ کو اپنے قریب کیا۔ اس بار امامہ نے اس کا ہاتھ نہیں جھٹکا تھا۔ اس کے آنسو اب تھم چکے تھے۔ سالار نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بڑی نرمی کے ساتھ سہلاتے ہوئے بولا۔

"ایسی شکایتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں صرف چند دن کا ساتھ ہو لیکن جہاں زندگی بھر کی بات ہو' وہاں یہ سب کچھ بہت سیکنڈری ہو جاتا ہے۔" اسے اپنے ساتھ لگائے وہ بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"تم سے شادی میرے لیے بہت معنی رکھتی "تھی" اور معنی رکھتی "ہے"... لیکن آئندہ بھی کچھ معنی رکھے "گی" اس کا انحصار تم پر ہے۔ مجھ سے جو گلہ ہے اسے مجھ سے کرو' دوسروں سے نہیں۔ میں صرف تم کو جوابدہ ہوں امامہ! کسی اور کے سامنے نہیں۔" اس نے بڑے نپے تلے لفظوں میں اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہم کبھی دوست نہیں تھے لیکن دوستوں سے زیادہ بے تکلفی اور صاف گوئی رہی ہے ہمارے تعلق میں۔ شادی کا رشتہ اسے کمزور کیوں کر رہا ہے؟"

امامہ نے نظر اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں بھی وہی سنجیدگی نظر آئی جو اس کے لفظوں میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ "وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا" اس کے دل نے اعتراف کیا۔

"تم میری زندگی میں ہر شخص اور ہر چیز سے بہت زیادہ امپورٹینس رکھتی ہو۔" سالار نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ ایک جملہ میں تمہیں ہر روز نہیں کہہ پاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے لیے تمہاری امپورٹنس کم ہو گئی ہے۔ میری زندگی میں تمہاری امپورٹنس اب میرے ہاتھ میں نہیں' تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ تمہیں طے کرنا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تم اس امپورٹنس کو بڑھاؤ گی یا کم کر دو گی۔"

اس کی بات سنتے ہوئے امامہ کی نظر اس کے اس ہاتھ کی پشت پر پڑی جس سے وہ اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت بے حد صاف ستھری تھی۔ ہاتھ کی پشت اور کلائی پر بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہاتھ کی انگلیاں کسی مصور کی انگلیوں کی طرح لمبی اور عام مردوں کے ہاتھوں کی نسبت پتلی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر سبز اور نیلی رگیں بہت نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اس کی کلائی پر رسٹ واچ کا ہلکا سا نشان تھا۔ وہ یقیناً" بہت باقاعدگی سے رسٹ واچ پہنتا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کے ہاتھ کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کے ہاتھ بہت اچھے لگے۔ اس کا دل کچھ اور موم ہوا۔

اس کی توجہ کہاں تھی' سالار کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ وہ اسے اسی طرح سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

"محبت یا شادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں پارٹنرز ایک دوسرے کو اپنے اپنے ہاتھ کی مٹھی میں بند کر کے رکھنا شروع کر دیں۔ اس سے رشتے مضبوط نہیں ہوتے' دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایک دوسرے کو اسپیس دینا' ایک دوسرے کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنا' ایک دوسرے کی آزادی کے حق کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔" امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا' وہ اب بے حد سنجیدہ تھا۔

"ہم دونوں اگر صرف ایک دوسرے کے عیب اور کوتاہیاں ڈھونڈتے رہیں گے تو بہت جلد ہمارے دل سے ایک دوسرے کے لیے عزت اور لحاظ ختم ہو جائے گا۔ کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا گیا ہو' اگر عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں محبت کے گھر کی چار دیواری ہیں' چار دیواری ختم ہو جائے تو گھر کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

امامہ نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر مسکرایا۔

"اچھی فلاسفی ہے نا؟"

امامہ کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بیک وقت آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سرہلایا۔

سالار نے اسے اپنے کچھ اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

"میں اللہ کا پرفیکٹ بندہ نہیں ہوں تو تمہارا پرفیکٹ شوہر کیسے بن سکتا ہوں امامہ! شاید اللہ میری کوتاہیاں نظر انداز کردے تو تم بھی معاف کردیا کرو۔"

وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی' وہ واقعی اس سالار سکندر سے ناواقف تھی۔ سالار نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سوجے ہوئے پپوٹوں کو اپنی پوروں سے چھوا۔

"کیا حال کرلیا ہے تم نے اپنی آنکھوں کا....؟ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا؟"

وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب بے حد پُرسکون تھی۔ اس کے گرد اپنا ایک بازو حمائل کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے اور گردن پر آئے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اس نے پہلی بار نوٹس کیا کہ وہ رونے کے بعد زیادہ اچھی لگتی ہے لیکن اس سے یہ بات کہنا' اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ اس کے نائٹ ڈریس کی شرٹ پر بنے پیٹرن پر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"موو کلر اچھا لگتا ہے تم پر۔" اس نے بے حد رومانٹک انداز میں اس کے کپڑوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کے سینے پر حرکت کرتا اس کا ہاتھ یک دم رکا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سالار نے اس کی آنکھوں میں خفگی دیکھی' وہ مسکرایا۔

"تعریف کررہا ہوں تمہاری۔"

"یہ ٹی پنک ہے۔"

"اوہ! اچھا۔" سالار نے گڑبڑا کر اس کے کپڑوں کو دوبارہ دیکھا۔

"یہ ٹی پنک ہے؟ میں نے اصل میں موو کلر بہت عرصے سے کسی کو پہنے نہیں دیکھا۔" سالار نے وضاحت کی۔

"کل موو پہنا ہوا تھا میں نے۔" امامہ کی آنکھوں کی خفگی بڑھی۔

"لیکن میں تو اسے پرپل سمجھا تھا۔" سالار مزید گڑبڑایا۔

"وہ جو سامنے دیوار پر پینٹنگ ہے نا' اس میں ہیں پرپل فلاورز۔" امامہ نے کچھ تحمل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

سالار اس پینٹنگ کو گھورتے ہوئے اسے یہ نہیں بتا سکا کہ وہ ان فلاورز کو بلیو کلر کا کوئی شیڈ سمجھ کر لایا تھا۔ امامہ اب اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سالار نے کچھ بے چارگی کے انداز میں گہرا سانس لیا۔

"میرا خیال ہے' اس شادی کو کامیاب کرنے کے لیے مجھے اپنی جیب میں ایک شیڈ کارڈ رکھنا پڑے گا۔" وہ پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پہلی صبح تھی جب اس کی آنکھ سالار سے پہلے کھلی تھی' الارم سیٹ ٹائم سے بھی دس منٹ پہلے۔ چند منٹ وہ اسی طرح بستر میں پڑی رہی۔ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ رات کا کون سا پہر ہے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا الارم کلاک اٹھا کر اس نے ٹائم دیکھا پھر ساتھ ہی الارم آف کردیا۔ بڑی احتیاط سے وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھی۔ سائیڈ ٹیبل

کا لیمپ بڑی احتیاط سے آن کرتے ہوئے اس نے سلیپرز ڈھونڈے' پھر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کا لیمپ آف کیا۔ تب اس نے سالار کی سائیڈ کے لیمپ کو آن ہوتے دیکھا۔ وہ کس وقت بیدار ہوا تھا' امامہ کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔

"میں سمجھی تم سو رہے ہو۔" اس نے سالار کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی اٹھا ہوں' کمرے میں آہٹ کی وجہ سے۔"

وہ اسی طرح لیٹے لیٹے اب اپنا سیل فون دیکھ رہا تھا۔

"لیکن میں نے تو کوئی آواز نہیں کی۔ میں تو کوشش کررہی تھی کہ تم ڈسٹرب نہ ہو۔" امامہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

"میری نیند زیادہ گہری نہیں ہے امامہ! کمرے میں ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی ہو تو میں جاگ جاتا ہوں۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیل سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

"میں آئندہ احتیاط کروں گی۔" اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"ضرورت نہیں' مجھے عادت ہے اسی طرح کی نیند کی۔ مجھے اب فرق نہیں پڑتا۔" اس نے بیڈ پر پڑا ایک اور تکیہ اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ واش روم میں جانے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ہر انسان ایک کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ کھلی کتاب جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ سالار بھی اس کے لیے ایک کھلی کتاب تھا لیکن چائنیز زبان میں لکھی ہوئی کتاب۔

اس دن اس نے اور سالار نے سحری اکٹھے کی اور ہر روز کی طرح سالار' فرقان کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ شاید پچھلے کچھ دنوں کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ امامہ کا موڈ رات کو ہی بہت اچھا ہوگیا تھا اور اس میں مزید بہتری اس کی اس "توجہ" نے کی۔

مسجد میں جانے سے پہلے آج پہلی بار اس نے اسے مطلع کیا۔

"امامہ! تم میرا انتظار مت کرنا۔ نماز پڑھ کر سو جانا' میں کافی لیٹ آؤں گا۔"

اس نے جاتے ہوئے اسے تاکید کی' لیکن وہ اس کی تاکید کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

وہ ساڑھے آٹھ بجے اس کے آفس جانے کے بعد سوئی تھی۔ دوبارہ اس کی آنکھ گیارہ بجے ڈور بیل کی آواز پر کھلی۔ نیند میں اپنی آنکھیں مسلتے ہوئے' اس نے بیڈ روم سے باہر نکل کر اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ کھولا۔ چالیس' پینتالیس سالہ ایک عورت نے اسے بے حد پُرتجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا۔

"مجھے نوشین باجی نے بھیجا ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

امامہ کو یک دم یاد آیا کہ اس نے نوشین کو صفائی کے لیے ملازمہ کو کل کے بجائے اگلے دن بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسے راستہ دیتی ہوئی دروازے سے ہٹ گئی۔

"اتنی خوشی ہوئی جب نوشین باجی نے مجھے بتایا کہ سالار صاحب کی بیوی آگئی ہے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب شادی کرلی سالار صاحب نے۔" امامہ کے پیچھے اندر آتے ہوئے ملازمہ کی باتوں کا آغاز ہوگیا تھا۔

"کہاں سے صفائی شروع کرنی ہے تم نے؟"

امامہ کی فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے صفائی کے بارے میں کیا ہدایات دے۔

"باجی! آپ فکر نہ کریں۔ میں کرلوں گی' آپ جاہے آرام سے سو جاؤ۔" ملازمہ نے اسے فوری آفر کی۔ یہ شاید اس نے اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں، تم لاؤنج سے صفائی شروع کرو، میں ابھی آتی ہوں۔"

آفر بری نہیں تھی، اسے واقعی بہت نیند آ رہی تھی لیکن وہ... اس طرح اسے گھر میں کام کرتا چھوڑ کر سو نہیں سکتی تھی۔

واش روم میں آ کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، کپڑے تبدیل کر کے بال سمیٹے اور لاؤنج میں نکل آئی۔ ملازمہ ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں کے بلائنڈز اب ہٹے ہوئے تھے۔ سورج ابھی پوری طرح نہیں نکلا تھا لیکن اب دھند نہ ہونے کے برابر تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں سے باہر پودے دیکھ کر اسے انہیں پانی دینے کا خیال آیا۔

ملازمہ ایک بار پھر گفتگو کا آغاز کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے بالکونی کی طرف جاتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔

جب وہ پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوئی تو ملازمہ لاؤنج صاف کرنے کے بعد اب سالار کے اس کمرے میں جا چکی تھی جسے وہ اسٹڈی روم کی طرح استعمال کرتا تھا۔

"سالار صاحب بڑے اچھے انسان ہیں۔"

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے میں اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے کے بعد امامہ نے اس سے چائے کا پوچھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ملازمہ نے ایک بار پھر اس سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امامہ اس کے تبصرے پر صرف مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"آپ بھی ان کی طرح بولتی نہیں ہیں؟" ملازمہ نے اس کے بارے میں اپنا پہلا اندازہ لگایا۔

"اچھا، سالار بھی نہیں بولتا۔" امامہ نے جان بوجھ کر اسے موضوع گفتگو بنایا۔

"کہاں جی۔ حمید بھی یہی کہتا ہے صاحب کے بارے میں۔"

ملازمہ نے شاید سالار کے ملازم کا نام لیا تھا۔

"لیکن باجی! بڑی حیا ہے آپ کے آدمی کی آنکھ میں۔"

اس نے ملازمہ کے جملے پر جیسے بے حد حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ملازمہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔

"جیسے فرقان صاحب ہیں ویسی ہی عادت سالار صاحب کی ہے۔ فرقان صاحب تو خیر سے بال بچوں والے ہیں، لیکن سالار صاحب تو اکیلے رہتے تھے ادھر۔ میں تو کبھی بھی اس طرح اکیلے مردوں والے گھروں میں صفائی نہ کروں۔ بڑی دنیا دیکھی ہے جی میں نے، لیکن یہاں کام کرتے ہوئے کبھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا صاحب نے مجھے۔ میں کئی بار سوچتی تھی کہ بڑے ہی نصیب والی عورت ہو گی، جو اس گھر میں آئے گی۔"

ملازمہ فراٹے سے بول رہی تھی۔

ہیٹر کے سامنے صوفے پر نیم دراز امامہ اس کی باتیں سنتی کسی سوچ میں گم رہی۔ ملازمہ کو حیرت ہوئی تھی کہ باجی اپنے شوہر کی تعریف پر خوش کیوں نہیں ہوئی۔ "باجی" کیا خوش ہوتی، کم از کم اسے اتنی توقع تو تھی اس سے کہ وہ گھر میں کام کرنے والی کسی عورت کے ساتھ کبھی انوالو نہیں ہو سکتا۔ وہ مردوں کی کوئی بڑی ہی بدترین قسم ہوتی ہو گی، جو گھر میں کام کرنے والی ملازمہ پر بھی نظر رکھتے ہوں گے اور سالار کم از کم اس قسم کے مردوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔

ملازمہ اس کی مسلسل خاموشی سے کچھ بیزار ہو کر جلد ہی چائے پی کر فارغ ہو گئی۔ امامہ اس کے پیچھے دروازہ بند کرنے گئی تو ملازمہ نے باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر اس سے کہا۔

"باجی! کل ذرا جلدی آ جاؤں آپ کے گھر؟"

امامہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر یقیناً" کوئی ایسا تاثر تھا جس نے ملازمہ کو کچھ بوکھلا دیا تھا۔

"باجی! مجھے چھوٹے بچے کو ہسپتال لے کر جانا ہے، اس لیے کہہ رہی تھی۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔" امامہ نے بمشکل جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ کل جلدی آنے کے مطالبے نے اسے ساکت نہیں کیا تھا بلکہ اسے ساکت کیا تھا اس کے تین لفظوں نے... "آپ کے گھر" یہ "اس کا گھر" تھا جس کے لیے وہ اتنے سالوں بے خوار ہوتی پھر رہی تھی۔ جس کی آس میں وہ کتنی بار جلال انصر کے پیچھے گڑگڑانے گئی تھی۔ وہ بے یقینی سے لاؤنج میں آ کر ان دیواروں کو دیکھ رہی تھی جنہیں دنیا "اس کے گھر" کے نام سے شناخت کر رہی تھی، وہ واقعی اس کا گھر تھا۔ وہ پناہ گاہیں نہیں تھیں جہاں وہ اتنے سال سر جھکا کر ممنون و احسان مند بن کر رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا اس کی آنکھوں میں... بعض اوقات انسان سمجھ نہیں پاتا کہ وہ روئے یا ہنسے... روئے، تو کتنا روئے... ہنسے، تو کتنا ہنسے... وہ بھی کچھ ایسی ہی کسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح ہر کمرے کا دروازہ کھول کھول کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہی تھی۔ وہ جا سکتی تھی وہاں... جو چاہے کر سکتی تھی... یہ اس کا گھر تھا۔ یہاں کوئی جگہ اس کے لیے "علاقہ غیر" نہیں تھی۔ اسے بس اتنی سی دنیا ہی چاہیے تھی اپنے لیے... کوئی ایسی جگہ جہاں وہ استحقاق کے ساتھ رہ سکتی ہو... سالار یک دم جیسے کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔ گھر کے معاملے میں عورت کے لیے ہر مرد پیچھے رہ جاتا ہے۔

سالار نے اسے دوبارہ وقفے وقفے سے سیل پر کال کی لیکن امامہ نے ریسیو نہیں کی... سالار نے تیسری بار پھر پی ٹی سی ایل پر کال کی، اس بار امامہ نے ریسیو کی لیکن اس کی آواز سنتے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ اسے اس کی آواز بھرائی ہوئی لگی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔"

وہ دوسری طرف جیسے اپنے آنسوؤں اور آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیوں رو رہی ہو؟"

سالار کی واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ رات ہر جھگڑے کا اختتام بے حد خوشگوار انداز میں ہوا تھا۔ وہ صبح دروازے تک مسکرا کر اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ پھر اب...؟ وہ الجھ رہا تھا۔

دوسری طرف امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے۔ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس لیے رو رہی ہے کہ کسی نے اسے "گھر والی" کہا ہے۔ سالار یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا... کوئی بھی مرد نہیں سمجھ سکتا۔

"مجھے امی اور ابو یاد آ رہے ہیں۔" سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

یہ وجہ سمجھ میں آتی تھی... وہ یک دم پر سکون ہوا۔ ادھر وہ بالکل خاموش تھی۔ ماں باپ کا ذکر کیا تھا، جھوٹ بولا تھا لیکن اب رونے کی جیسے ایک اور وجہ مل گئی تھی۔ جو آنسو پہلے تھم رہے تھے، وہ ایک بار پھر سے برسنے لگے تھے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ فون پر اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا۔

وہ اس غیر ملکی بینک میں انویسٹمنٹ بینکنگ کو ہیڈ کرتا تھا... چھوٹے سے چھوٹا انویسٹمنٹ scam پکڑ سکتا تھا، خسارے میں جاتی بڑی سے بڑی کمپنی کے لیے بیل آؤٹ پلان تیار کر سکتا تھا۔ کمپنیز کے مرجر پیکجز تیار کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ پوائنٹ ون پرسنٹ کی پریسیشن کے ساتھ ورلڈ اسٹاک مارکیٹس کے ٹرینڈز کی پیش بینی کر سکتا تھا۔ مشکل سے مشکل سرمایہ کار کے ساتھ سودا طے کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا لیکن شادی کے اس ایک ہفتے کے دوران ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ امامہ کو روتے ہوئے چپ نہیں کرا سکتا، نہ وہ ان

آنسوؤں کی وجہ ڈھونڈ سکتا تھا' نہ انہیں روکنے کے طریقے اسے آتے تھے۔ وہ کم از کم اس میدان میں بالکل اناڑی تھا۔

"ملازمہ نے گھر صاف کیا تھا آج؟" ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی توجہ رونے سے ہٹانے کے لیے جس موضوع اور جملے کا انتخاب کیا وہ احمقانہ تھا۔ امامہ کو جیسے یقین نہیں آیا کہ یہ بتانے پر کہ اسے اپنے ماں باپ یاد آرہے ہیں' سالار نے اس سے یہ پوچھا ہے۔ پچھلی رات کے سالار کے سارے لیکچرز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور فون منقطع ہوتے ہی سالار کو اپنے الفاظ کے غلط انتخاب کا احساس ہو گیا تھا۔ اپنے سیل کی تاریک اسکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

اگلے پانچ منٹ وہ سیل ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا اس نے اب کال کی تو وہ ریسیو نہیں کرے گی۔ پانچ منٹ کے بعد اس نے دوبارہ کال کی۔ خلاف توقع امامہ نے کال ریسیو کی۔ اس بار اس کی آواز میں خفگی تھی لیکن وہ بھرائی ہوئی نہیں تھی۔ وہ یقیناً" رونا بند کر چکی تھی۔

"آئی ایم سوری!" سالار نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

امامہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت اس کی معذرت نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی بات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی' اسے سالار پر غصہ کیوں آجاتا تھا.... ؟ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر.... اتنے سالوں میں جس ایک احساس کو وہ مکمل طور پر بھول گئی تھی' وہ غصے کا احساس ہی تھا۔ یہ احساس اس کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ اتنے سالوں سے اس نے اللہ کے علاوہ کسی سے بھی کوئی گلہ' کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ کسی سے ناراض ہونا یا کسی کو خفگی دکھانا تو بہت دور کی بات ہے' پھر اب یہ احساس اس کے اندر کیوں جاگ اٹھا تھا۔ سعیدہ اماں' ڈاکٹر سبط علی اور ان کی فیملی.... اس کے کلاس فیلوز.... کولیگز.... ان میں سے بھی کسی پر اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ ہاں' کبھی کبھار شکایت ہوتی تھی لیکن وہ شکایت بھی لفظوں کی شکل اختیار نہیں کر سکی' پھر اب کیا ہو رہا تھا اسے؟

"امامہ پلیز بولو.... کچھ کہو۔" وہ چونکی۔

"نماز کا وقت نکل رہا ہے' مجھے نماز پڑھنی ہے۔" اس نے اسی الجھے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔

"تم خفا تو نہیں ہو؟" سالار نے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ نماز کے بعد دیر تک اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈتی رہی اور اسے جواب مل گیا.... نو سال میں اس نے پہلی بار اپنے لیے کسی کی زبان سے محبت کا اظہار سنا تھا۔ وہ احسان کرنے والوں کے ہجوم میں تھی' پہلی بار کسی محبت کرنے والے کے حصار میں آئی تھی۔ گلہ' شکوہ' ناز' نخرا' غصہ' خفگی یہ سب کیسے نہ ہوتا' اسے "پتا" تھا کہ جب وہ روٹھے گی تو وہ اسے منالے گا' خفا ہو گی تو وہ اسے وضاحتیں دے گا' مان تھا یا گمان.... لیکن جو کچھ بھی تھا' غلط نہیں تھا۔ اتنے سالوں میں جو کچھ اس کے اندر جمع ہو گیا تھا' وہ کسی لاوے کی طرح نکل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شام کو سالار اسے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ یہ خلاف توقع تھا' خاص طور پر دوپہر والے واقعہ کے بعد.... لیکن.... اس رات وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا۔ وہ بے حد نروس تھی لیکن بے حد ایکسائیٹڈ بھی.... وہ کتنے سالوں کے بعد یوں کسی ریسٹورنٹ کے اوپن ایئر حصہ میں بیٹھی باربی کیو کھا رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں ونڈو شاپنگ کی نیت سے مارکیٹ چلے آئے۔ سالار نے بڑی نرمی اور توجہ سے اسے

خود کو سنبھالنے کا موقع دیا تھا۔ وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا کھانا ختم کرنے تک وہ نارمل ہو چکی تھی۔

عید کی خریداری کی وجہ سے مارکیٹ میں اس وقت بھی بڑی گہما گہمی تھی۔ وہ بہت عرصہ کے بعد وہاں آئی تھی' مارکیٹ کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ وہ بے حد حیرت سے ان نیو برانڈز اور دکانوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی جو آٹھ نو سال پہلے وہاں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹیاں یا سعیدہ اماں کے بیٹے اپنی فیملیز کے ساتھ جب بھی آؤٹنگ کے لیے باہر نکلتے' وہ اسے بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے' لیکن ان کے ساتھ باہر نہ جانے کا فیصلہ اس کا اپنا ہوتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کے لیے مزید کسی مصیبت کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی۔ شادی کو وہ صرف رہنے کی جگہ کی تبدیلی سمجھ رہی تھی' حالات کی تبدیلی کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا.... لیکن معجزات ہوتے ہیں.... شاذ و نادر سہی لیکن ہوتے ضرور ہیں۔

"کچھ لو گی؟" سالار کی آواز پر وہ بے اختیار چونکی۔

"ہاں.... کافی۔" اس نے جھجک کر کہا۔

"میں شاپنگ کی بات کر رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"نہیں' میرے پاس سب کچھ ہے۔" امامہ نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو اب میرے پاس بھی ہے۔" اس کے چہرے پر بے اختیار سرخی دوڑی تھی۔

"تمہیں میری تعریف اچھی لگی.... ؟"

"سالار! باز آؤ' میں نے تمہیں یہاں تعریف کرنے کو کہا تھا؟" وہ بے ساختہ جھینپی۔

"تم نے جگہ نہیں بتائی تھی' صرف یہ کہا تھا کہ مجھے تمہاری تعریف کرنی چاہیے۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔

امامہ نے اس بار گردن موڑ کر اسے نظر انداز کیا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے ایک شوکیس میں ڈسپلے پر لگی ایک ساڑھی دیکھ کر وہ بے ساختہ رکی۔ کچھ دیر ستائشی نظروں سے وہ اس کاہی رنگ کی ساڑھی کو دیکھتی رہی۔ وہاں شوکیس میں لگی یہی وہ شے تھی' جس کے سامنے وہ یوں ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ سالار نے ایک نظر اس ساڑھی کو دیکھا پھر اس کے چہرے کو اور بڑی سہولت کے ساتھ کہا۔

"مجھے لگتا ہے' یہ ساڑھی تم پر بہت اچھی لگے گی' آؤ لیتے ہیں۔" وہ گلاس ڈور کھولتے ہوئے بولا۔

"نہیں' میرے پاس بہت سے فینسی کپڑے ہیں۔" امامہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

"لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیا تمہیں شادی پر' اس لیے کچھ دینا چاہتا ہوں۔"

وہ اس بار بول نہیں سکی۔ وہ ساڑھی اسے واقعی بہت اچھی لگی تھی۔

اس بوتیک سے انہوں نے صرف وہ ساڑھی ہی نہیں خریدی بلکہ چند اور سوٹ بھی لیے تھے۔ دوسری بوتیک سے گھر میں پہننے کے لیے کچھ ریڈی میڈ ملبوسات' کچھ سویٹرز اور جوتے۔

"مجھے پتا ہے' تمہارے پاس کپڑے ہیں لیکن تم میرے خریدے ہوئے پہنو گی تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ یہ سب میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا ہوں' تمہیں خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔"

اس کے پہلے اعتراض پر سالار نے بے حد رسانیت سے کہا تھا۔

امامہ نے اس کے بعد اعتراض نہیں کیا۔ اسے کچھ جھجک تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ جھجک بھی ختم ہو گئی۔ پھر اس نے ساری چیزیں اپنی پسند سے لی تھیں۔

"مجھے تم پر ہر چیز اچھی لگتی ہے.... سو تم مجھ سے مت پوچھو۔" اس نے سالار کی پسند پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"لاؤنج کی کھڑکیوں پر کرٹنز (پردے) لگالیں۔" امامہ کو یاد آیا۔
"بلائنڈ سے کیا ایشو ہے تمہیں؟" وہ چونکا۔
"کوئی نہیں لیکن مجھے کرٹنز اچھے لگتے ہیں۔ خوب صورت سے۔"
"کیوں نہیں..." سالار نے اپنے دلی تاثرات چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اسے پردوں سے چڑ تھی۔

رات پونے بارہ بجے ایک کیفے میں کافی اور ٹیرا میسو کیک کھانے کے بعد وہ تقریباً" ساڑھے بارہ بجے گھر واپس آئے۔ لاہور تب تک ایک بار پھر دھند میں ڈوب چکا تھا لیکن زندگی کے راستے سے دھند چھٹنے لگی تھی۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ بے مقصد ان چیزوں کو کھول کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کتنے سالوں بعد وہ ملنے والی کسی چیز کو تشکر اور احسان مندی کے بوجھ کے ساتھ نہیں بلکہ استحقاق کے احساس کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

عورت کے لیے بہت ساری نعمتوں میں سے ایک نعمت اس کے شوہر کا اس کی ذات پر پیسہ خرچ کرنا بھی ہے اور یہ نعمت کیوں تھا' وہ اسے آج سمجھ پائی تھی۔

ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی ہر سیزن کے آغاز میں اسے کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر دیتے تھے۔ سعیدہ اماں بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی تھیں۔ ان کے بیٹے اور ڈاکٹر سبط علی کی بیٹیاں بھی اسے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی تھیں لیکن ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے ایسی خوشی یا سکون محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ خیرات نہیں تھی لیکن وہ حق بھی نہیں تھا' وہ احسان تھا اور وہ اتنے سالوں میں بھی اپنے وجود کو احسانوں کا عادی نہیں بنا سکی تھی۔ بے شک وہ اس کی زندگی کا حصہ ضرور بن گئے تھے۔

یہ کیسا احساس تھا جو ان چیزوں کو گود میں لیے اسے ہو رہا تھا۔ خوشی؟ آزادی؟ اطمینان؟ سکون...؟ یا کوئی ایسی شے تھی جس کے لیے اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو تم؟"
سالار کپڑے تبدیل کر کے واش روم سے نکلا تھا اور ڈریسنگ روم کی لائٹ آف کر کے کمرے میں آتے ہوئے اس نے امامہ کو اسی طرح صوفے پر وہ ساری چیزیں پھیلائے بیٹھے دیکھا۔ وہ حیران سا ہوا۔ وہ جب سے آئی تھی' اس وقت سے ان چیزوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔
"کچھ بھی نہیں' میں بس رکھنے ہی لگی تھی۔" امامہ نے ان چیزوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔
"ایک وارڈ روب میں نے خالی کر دی ہے' تم اپنے کپڑے اس میں رکھ لو۔ اگر کچھ اور جگہ کی ضرورت ہو تو گیسٹ روم کی ایک وارڈ روب بھی خالی ہے... تم اسے استعمال کر سکتی ہو۔"
وہ اپنے کمرے سے کچھ ڈھونڈتا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔
"مجھے سعیدہ اماں کے گھر سے اپنا سامان لانا ہے۔" امامہ نے ساری چیزوں کو دوبارہ ڈبوں اور بیگز میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"کیسا سامان؟" وہ ابھی تک دراز میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔
"میرے جہیز کا سامان۔" امامہ نے بڑی رسانیت سے کہا۔
"مثلاً"؟" وہ دراز سے نکالے گئے کچھ پیپرز دیکھتے ہوئے چونکا۔
"برتن ہیں' الیکٹرونکس کی چیزیں ہیں۔ فرنیچر بھی ہے لیکن وہ شوروم پر ہے۔ اور بھی کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔"
وہ ان پیپرز کو دراز میں رکھ کر اس کی بات سنتا رہا۔

"تمہارے ذاتی استعمال کی کوئی چیز ہے وہاں...؟" اس نے پوچھا۔
"وہ سب میری ذاتی چیزیں ہیں۔" اس نے بے ساختہ کہا۔
"وہ جہیز کا سامان ہے۔" سالار نے اسے جتانے والے انداز میں کہا۔
"اب تم کہو گے' تمہیں جہیز نہیں چاہیے۔" وہ کچھ جزبز ہو کر بولی۔
"مجھے کسی بھی قسم کا سامان نہیں چاہیے۔" سالار نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تمہیں لگتا ہے اس اپارٹمنٹ میں پہلے ہی کسی چیز کی کمی ہے...؟ تم چاہتی ہو' یہاں ہر چیز دو' دو کی تعداد میں ہو۔ رکھیں گے کہاں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ امامہ سوچ میں پڑ گئی۔
"اتنے سالوں سے چیزیں میں خریدتی رہی ہوں اپنے لیے' لیکن زیادہ سامان ابو کے پیسوں سے آیا ہے۔ وہ ناراض ہوں گے۔" وہ اب بھی تیار نہیں تھی۔
"ڈاکٹر صاحب نے اپنی تینوں بیٹیوں کو جہیز دیا؟" وہ اب پوچھ رہا تھا۔ "نہیں دیا نا؟"
"تمہیں کیسے پتا؟" وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔
"انہوں نے ہمیں خود بتایا تھا۔" اس نے کہا۔
"ان کی تینوں بیٹیوں کی شادیاں فیملی میں ہوئی ہیں اس لیے۔" امامہ نے کہا۔
"ٹرسٹ می... میں بھی جہیز لے کر نہ آنے پر تم سے برا سلوک نہیں کروں گا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا تحفہ ہوتا تو میں ضرور رکھتا لیکن یہ انہوں نے تمہاری سیکیورٹی کے لیے دیا تھا' کیونکہ تمہاری شادی کسی ایسی فیملی میں ہو رہی تھی جن کے بارے میں وہ مکمل طور پر نہیں جانتے تھے لیکن میرے بارے میں تو وہ بھی جانتے ہیں اور تم بھی۔" سالار نے اس سے کہا۔
"میرے برتن' بیڈ شیٹس اور کپڑے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کتنی چیزیں ہیں جو میں اتنے سالوں سے جمع کر رہی ہوں۔ اب کیسے دے دوں یہ سب کچھ؟" وہ ناخوش تھی۔
"اوکے' جو چیز تم نے اپنی پے سے لی ہے' وہ لے آؤ' باقی چھوڑ دو سب کچھ۔ وہ کسی خیراتی ادارے کو دے دیں گے۔" سالار نے ایک اور حل نکالا۔ وہ اس بار کچھ سوچنے لگی۔
"میں صبح آفس جاتے ہوئے تمہیں سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دوں گا اور آفس سے آج ذرا جلدی آجاؤں گا۔ تمہاری پیکنگ بھی کروا دوں گا۔"
وہ ہاتھ میں کچھ پیپرز لیے ہوئے اس کی طرف آیا۔ صوفے پر اس کے پاس پڑی چیزوں کو ایک طرف کرتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"یہ جس جگہ پر کراس کا نشان ہے' اس پر اپنے سائن کر دو۔"
اس نے کچھ پیپرز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک پین اسے تھمایا۔
"یہ کیا ہے؟" اس نے کچھ حیران ہو کر ان پیپرز کو دیکھا۔
"میں اپنے بینک میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا رہا ہوں۔"
"لیکن میرا اکاؤنٹ تو پہلے ہی کھلا ہوا ہے۔"
"چلو' ایک اکاؤنٹ میرے بینک میں بھی سہی۔ برے نہیں ہیں ہم' اچھی سروس دیتے ہیں۔" اس نے مذاق کیا۔ امامہ نے پیپرز پر سائن کرنا شروع کر دیا۔
"پھر وہ اکاؤنٹ بند کر دوں؟" امامہ نے سائن کرنے کے بعد کہا۔
"نہیں' اسے وہیں رہنے دو۔" سالار نے پیپرز اس سے لیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کتنی رقم کا چیک دوں؟"

امامہ کا خیال تھا کہ وہ غیر ملکی بینک ہے۔ یقیناً" اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ملکی بینک کی نسبت کچھ زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی۔

"تمہارا حق مہر پے کرنا ہے مجھے 'اسی رقم سے کھول دوں گا۔"

سالار نے پیپرز ایک لفافے میں رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"اس پر ایک فگر لکھو۔"

امامہ نے حیرانی سے اس رائٹنگ پیڈ کو دیکھا جو اس نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔ "کیسی فگر؟" وہ الجھی۔

"کوئی بھی فگر 'اپنی مرضی کے کچھ ڈیجٹس (ہندسے)....." سالار نے کہا۔

"کیوں؟" وہ مزید الجھی۔

سالار نے اس کے ہاتھ میں پین تھمایا۔ اس نے دوبارہ پین پکڑ تو لیا لیکن اس کا ذہن مکمل طور پر خالی تھا۔

"کتنے ڈیجٹس کا فگر۔" امامہ نے چند لمحے بعد اس کی مدد چاہی۔

وہ یک دم سوچ میں پڑ گیا 'پھر اس نے کہا۔

"اگر تم اپنی مرضی سے کوئی فگر لکھو گی تو کتنے ڈیجٹس لکھو گی....؟"

"سیون ڈیجٹس....." امامہ سوچ میں پڑ گئی۔

"آل رائٹ..... لکھو پھر۔" سالار کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔

امامہ چند لمحے اس صاف کاغذ کو دیکھتی رہی پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ 3752960..... اس نے رائٹنگ پیڈ سالار کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذ پر نظر ڈالتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سکتہ میں آیا پھر کاغذ کو پیڈ سے الگ کرتے ہوئے بے اختیار ہنسا۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کے رد عمل سے کچھ اور الجھی۔

"کچھ نہیں..... کیا ہونا تھا؟" کاغذ کو تہہ کرتے ہوئے اس نے امامہ کے چہرے کو مسکراتے ہوئے بے حد گہری لیکن عجیب نظروں سے دیکھا۔

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟" وہ اس کی نظروں سے الجھی۔

"تمہارا شوہر ہوں 'دیکھ سکتا ہوں تمہیں۔"

امامہ کو احساس نہیں ہوا 'وہ بڑی صفائی سے بات بدل رہا تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں کاغذ بھی اس لفافے میں ڈال چکا تھا۔

"تم نے مجھے ساڑھی پہن کر نہیں دکھائی؟"

"رات کے اس وقت میں تمہیں ساڑھی پہن کر دکھاؤں؟" وہ بے اختیار ہنسی۔

وہ اس کے پاس سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔ وہ پہلی بار اس طرح کھلکھلا کر ہنسی تھی یا پھر شاید وہ اتنے قریب سے پہلی بار اسے ہنستے دیکھ رہا تھا۔ ایک بیگ کے اندر ڈبے رکھتے ہوئے امامہ نے اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا 'وہ واقعی اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب کیا ہے؟"

"میں ایک بات سوچ رہا تھا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"کیا؟"

"کہ تم صرف روتے ہوئے ہی نہیں 'ہنستے ہوئے بھی اچھی لگتی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت آئی 'پھر چمک اور پھر خوشی۔ سالار نے ہر تاثر کو پہچانا تھا یوں جیسے کسی نے اسے فلیش کارڈ دکھائے ہوں..... پھر اس نے اسے نظریں چراتے ہوئے دیکھا..... پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا..... پہلے اس کے کان کی لوئیں سرخ ہوئیں پھر اس کے گال 'ناک..... اور شاید اس کی گردن بھی..... اس نے زندگی میں کبھی کسی عورت یا مرد کو اتنے واضح طور پر رنگ بدلتے نہیں دیکھا تھا جس طرح اسے..... نو سال پہلے بھی دو تین بار اس نے اسے غصے میں اسی طرح سرخ ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے لیے عجیب سہی لیکن یہ منظر دلچسپ تھا..... اور اب وہ اسے محجوب ہوتے ہوئے بھی اسی انداز میں سرخ ہوتے دیکھ رہا تھا 'یہ منظر اس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ "یہ کسی بھی مرد کو پاگل کر سکتی ہے۔" اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے اعتراف کیا 'اس نے اپنی زندگی میں آنے والی کسی عورت کو اتنے "بے ضرر" جملے پر اتنا شرماتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اس کو شکایت تھی کہ وہ اس کی تعریف نہیں کرتا۔ سالار کا دل چاہا 'وہ اسے کچھ اور چھیڑے۔ وہ بظاہر بے حد سنجیدگی سے اسے نظر انداز کیے ہوئے چیزیں بیگ میں ڈال رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ اس کی نظروں سے یقیناً" کنفیوز ہو رہی تھی۔

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں گھر میں لانے کے بعد آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انہیں کہاں رکھیں 'کیونکہ آپ انہیں جہاں بھی رکھتے ہیں 'اس چیز کے سامنے وہ جگہ بے حد بے مایہ سی لگتی ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں 'جنہیں گھر میں لانے کے بعد انہیں جہاں بھی رکھیں 'وہی جگہ سب سے انمول اور قیمتی ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا 'امامہ اس کے لیے ان چیزوں میں سے کون سی چیز تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھا وہ کچھ بے اختیار ہو کر اس کی طرف جھکا اور اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کے دائیں گال کو چھوا 'وہ کچھ حیا سے سمٹی۔ اس نے اسی نرمی کے ساتھ اس کا دایاں کندھا چوما اور پھر امامہ نے اسے ایک گہرا سانس لے کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی 'سالار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ ان پیپرز کو اب اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ رہا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو شاید امامہ کی نظریں اسے حیران کر دیتیں۔ اس نے پہلی بار اس کے کندھے کو چوما تھا اور اس لمس میں محبت نہیں تھی — "احترام" تھا..... اور کیوں تھا 'یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔

☼ ☼ ☼

وہ اگلے دن تقریباً" دس بجے سعیدہ اماں کے گھر آئے۔ امامہ کا مسکراتا 'مطمئن چہرہ دیکھ کر فوری رد عمل یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف سالار کے سلام کا جواب دیا بلکہ اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کا ماتھا بھی چوما۔

"یہ سب لے کر جانا ہے۔" وہ اسے اپنے کمرے میں لائی تھی وہاں کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور ان میں تقریباً" تین چار سو کتابیں تھیں۔

"یہ بکس؟" سالار نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

"نہیں 'یہ ایزل 'کینوس اور پینٹنگ کا سارا سامان بھی۔" امامہ نے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پڑے پینٹنگ کے سامان اور کچھ ادھوری پینٹنگز کی طرف اشارا کیا۔

"یہ سب کچھ زیادہ نہیں ہے 'بکس ہی تقریباً" دو کارٹن میں آئیں گی۔"

سالار نے ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

"نہیں 'یہ اتنی ہی بکس نہیں ہیں اور بھی ہیں۔" امامہ نے کہا۔

اس نے اپنا دوپٹا اتار کر بیڈ پر رکھ دیا اور پھر گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھتے ہوئے بیڈ کے نیچے سے ایک کارٹن کھینچنا شروع کیا۔

"ٹھہرو! میں نکالتا ہوں۔" سالار نے اسے روکا اور خود جھک کر اس کارٹن کو کھینچنے لگا۔

"بیڈ کے نیچے جتنے بھی ڈبے ہیں' وہ سارے نکال لو۔ ان سب میں بکس ہیں۔" امامہ نے اسے ہدایت دی۔

سالار نے جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں مختلف سائز کے کم از کم سات آٹھ ڈبے موجود تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک ڈبا نکالتا گیا۔

"بس....؟" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔

وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کمرے میں موجود کپڑوں کی الماری کے اوپر ایک اسٹول پر چڑھی کچھ ڈبے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سالار نے ایک بار پھر اسے ہٹا کر خود وہ ڈبے نیچے اتارے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کتابوں کی آخری کھیپ ہے کیونکہ کمرے میں اسے ڈبا رکھنے کی کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی' یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ اب الماری کو کھولے اس کے اندر موجود ایک خانے سے کتابیں نکال کر بیڈ پر رکھ رہی تھی۔ وہ کم از کم سو کتابیں تھیں جو اس نے الماری سے نکالی تھیں' وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ الماری کے بعد بیڈ سائیڈ ٹیبلز کی درازوں کی باری تھی' ان میں بھی کتابیں تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبلز کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں اور خانوں کی باری تھی۔ کمرے میں موجود کپڑے کی جس باسکٹ کو وہ لانڈری باسکٹ سمجھا تھا' وہ بھی کتابیں اسٹور کرنے کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا' اسے کمرے کی مختلف جگہوں سے کتابیں برآمد کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیڈ پر موجود کتابوں کا ڈھیر اب شیلف پر لگی کتابوں سے بھی زیادہ ہو چکا تھا لیکن وہ اب بھی بڑی شدومد کے ساتھ کمرے کی مختلف جگہوں پر رکھی ہوئی کتابیں نکال رہی تھی۔ اس نے ان کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جو صحن میں کھلتی تھیں۔ اس کے بعد سالار نے اسے باری باری ساری کھڑکیاں کھول کر ان میں سے بھی کچھ کتابیں نکالتے ہوئے دیکھا' جو پلاسٹک کے شاپرز میں بند تھیں۔ شاید یہ احتیاط کتابوں کو مٹی اور نمی سے بچانے کے لیے کی گئی تھی۔

"بس اتنی ہی کتابیں ہیں۔" اس نے بالآخر سالار کو مطلع کیا۔

سالار نے کمرے میں چاروں طرف بکھرے ڈبوں اور ڈبل بیڈ پر پڑی کتابوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"کوئی اور سامان بھی ہے....؟"

"ہاں! میرے کچھ اور کینوس اور پینٹنگز بھی ہیں' میں لے کر آتی ہوں۔"

وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

سالار نے ڈبل بیڈ پر پڑی کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی' وہ ایک ناول تھا۔ گھٹیا رومانس لکھنے والے ایک بہت ہی مشہور امریکن رائٹر کا ناول.... اس نے ٹائٹل پر نظر ڈالی اور بے اختیار اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اگر وہ اس ناول کا نام امامہ کے سامنے لیتا تو وہ سرخ ہو جاتی۔ اس نے ناول کھولا۔ کتاب کے اندر پہلے ہی خالی صفحے پر امامہ نے اپنا نام لکھا تھا۔ جس تاریخ کو وہ کتاب خریدی گئی' وہ تاریخ.... جس جگہ سے خریدی گئی وہ جگہ.... جس تاریخ کو کتاب پڑھنا شروع کیا اور جس تاریخ کو کتاب ختم کی۔ وہ حیران ہوا' اس طرح کے ناول کو وہ فضول سمجھتا تھا۔ وہ شاید یہ کبھی پسند نہ کرتا کہ اس رائٹر کے کسی ناول کو کوئی اس کے ہاتھ میں دیکھے مگر اس نے اس ناول پر اتنی سنجیدگی سے اپنا نام اور ڈیٹس لکھی ہوئی تھیں جیسے وہ بے حد اہم کتاب ہو۔ اس نے ناول کے چند اور صفحے پلٹے اور پھر کچھ بے یقینی کے عالم میں پلٹتا ہی چلا گیا۔ ناول کے اندر جگہ جگہ رنگین مارکرز کے ساتھ مختلف لائنز ہائی لائٹ کی گئی تھیں۔ بعض لائنز کے سامنے اسٹار اور بعض کے سامنے ڈبل اسٹار بنائے گئے تھے۔

وہ بے اختیار ایک گہرا سا سانس لے کر رہ گیا۔

ان لائنز میں بے ہودہ رومانس' بے حد پلے ٹونک' سوپی باتیں' ذومعنی ڈائیلاگز تھے۔ ان پر اسٹار بنے ہوئے تھے اور وہ نشان زدہ تھے۔

سالار نے وہ ناول رکھتے ہوئے دوسرا ناول اٹھایا.... پھر تیسرا.... پھر چوتھا.... پانچواں.... چھٹا.... ساتواں.... وہ سب کے سب رومانٹک تھے۔ ایک ہی طرح کے رومانٹک ناولز اور وہ سب بھی اسی طرح ہائی لائٹڈ تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار رومانٹک اور وہ بھی ملز اینڈ بونز اور باربرا کارٹ لینڈ کی ٹائپ کے رومانس کے اتنے "سنجیدہ قاری" سے مل رہا تھا اور کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھتے ہوئے اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ "کتابیں" نہیں پڑھتی تھی بلکہ صرف یہی ناولز پڑھتی تھی۔ کمرے میں موجود ان ڈیڑھ دو ہزار کتابوں میں اسے صرف چند پینٹنگز' ککری اور شاعری کی کتابیں نظر آئی تھیں' باقی سب انگلش ناولز تھے۔

"اور یہ لے کر جانی ہیں۔" ایک ناول دیکھتے ہوئے وہ امامہ کی آواز پر بے اختیار چونکا۔

وہ کمرے میں دو تین چکروں کے دوران کچھ مکمل اور کچھ ادھوری پینٹنگز کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بھی بنا چکی تھی۔ سالار اس دوران ان کتابوں کے جائزے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ناول واپس کتابوں کے اس ڈھیر پر رکھ دیا جو بیڈ پر پڑا تھا۔ کارپٹ پر پڑی ان پینٹنگز پر نظر ڈالتے ہوئے سالار کو احساس ہوا کہ سعیدہ اماں کے گھر میں جابجا لگی ہوئی پینٹنگز بھی اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں اور یقیناً "ان پینٹنگز کے کسی دیوار پر لٹکا نہ ہونے کا سبب مزید خالی جگہ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔

"بیٹا! یہ سارا کاٹھ کباڑ کیوں اکٹھا کر لیا' یہ لے کر جاؤ گی ساتھ؟"

سعیدہ اماں کمرے میں آتے ہی کمرے کی حالت دیکھ کر چونکیں۔

"اماں! یہ ضروری چیزیں ہیں میری۔"

امامہ' سالار کے سامنے اس سامان کو کاٹھ کباڑ قرار دیے جانے پر کچھ جزبز ہوئی۔

"کیا ضروری ہے ان میں' یہ کتابیں تو ردی میں دے دیتیں۔ اتنا ڈھیر لگا لیا ہے اور تصویریں وہیں رہنے دیتیں' جہاں پڑی تھیں۔ چھوٹا سا گھر ہے تم لوگوں کا' وہاں کہاں پورا آئے گا یہ سب کچھ۔" سعیدہ اماں کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر متوحش ہو رہی تھیں۔ یقیناً "انہوں نے بھی امامہ کی ساری کتابوں کو پہلی بار اکٹھا دیکھا تھا اور یہ ان کے لیے کوئی خوشگوار نظارہ نہیں تھا۔

"نہیں' آ جائے گا پورا' یہ سب کچھ۔ تین بیڈ رومز ہیں' ان میں سے ایک کو استعمال کریں گے یہ سامان رکھنے کے لیے' لیکن دوسری چیزوں کو بیچیں رکھنا پڑے گا۔ کمبل' کونلٹس' رگز اور کشنز وغیرہ کو۔" وہ ایک سیکنڈ میں تیار ہو گئی تھی۔

"لیکن بیٹا! یہ سارا سامان تو کام کا ہے۔ گھر سجانا اس سے.... یہ کتابوں کے ڈھیر اور تصویروں کا کیا کرو گی تم؟"

سعیدہ اماں اب بھی معترض تھیں۔

"کوئی بات نہیں' ان کی کتابیں ضروری ہیں۔ ابھی کچھ اور کارٹن یا شاپرز ہیں جنہیں پیک کرنا ہے۔" سالار نے اپنے سوئیٹر کی آستینوں کو موڑتے ہوئے آخری جملہ امامہ سے کہا۔

تین بجے کے قریب وہ سارا سامان سالار کے گھر پر گیسٹ روم میں بکھرا ہوا تھا۔ فرقان نے اس دن بھی انہیں افطاری کے لیے اپنی طرف مدعو کیا ہوا تھا لیکن سالار نے معذرت کر لی۔ فی الحال اس سامان کو ٹھکانے لگانا زیادہ اہم تھا۔

ایک اسٹور میں سالار نے کچھ عرصے پہلے ایلومینیم اور شیشے کے ریکس والی کچھ الماریاں دیکھی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہاں لگایا ہوا چکر بے کار نہیں گیا۔ چھ فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی ایک ہی طرح کی تین الماریوں نے

گیسٹ روم کی ایک پوری دیوار کو کور کر کے یک دم اسے اسٹڈی روم کی شکل دے دی تھی لیکن امامہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ان تین الماریوں میں اس کی تقریباً" ساری کتابیں سماگئی تھیں۔ ان کتابوں کو اتنے سالوں میں پہلی بار کوئی ڈھنگ کی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ اس کے ایزل اور ریکس 'لانڈری کی دیوار پر بنی ریکس پر سمیٹے گئے تھے۔

وہ جہیز کے سامان میں برتنوں اور بیڈ شیٹس کے علاوہ اور کچھ نہیں لائی تھی' تب اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی قسمت میں اس سامان میں سے صرف ان ہی دو چیزوں کا استعمال لکھا تھا۔

سالار کا کچن ایریا اب پہلی بار ایک آباد جگہ کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ برتنوں کے لیے بنے ریکس کے شیشوں سے نظر آتی نئی کراکری اور کاؤنٹر کی سلیب پر کچن کے استعمال کی چھوٹی موٹی نئی چیزوں نے کچن کی شکل کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔

وہ لوگ رات کے دس بجے جب فارغ ہوئے تو اپارٹمنٹ میں آنے والا نیا سامان سمیٹا جا چکا تھا۔ ان کے لیے فرقان کے گھر سے کھانا آیا تھا لیکن اس رات امامہ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ نئی کراکری میں سرو کیا تھا۔

"اچھا لگ رہا ہے نا ایسے؟" امامہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس سے پوچھا۔

سالار نے اپنے سامنے موجود نئی برانڈڈ ڈنر پلیٹ اور اس کے اطراف میں لگی چمکتی ہوئی کٹلری کو دیکھا اور پھر کانٹا اٹھا کر اسے بغور دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں' ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم کسی ریسٹورنٹ کی اوپننگ والے دن سب سے پہلے اور اکلوتے کسٹمر ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے امامہ! کہ یہ کراکری اور کٹلری اتنی نئی ہے کہ اس میں کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔۔۔ میں پرانے برتنوں میں نہیں کھا سکتا۔۔۔؟"

امامہ کا موڈ بری طرح آف ہوا۔ کم از کم یہ وہ جملہ نہیں تھا جو وہ اس موقع پر اس سے سننا چاہتی تھی۔

"لیکن یہ بہت خوب صورت ہیں۔" سالار نے فوراً" اپنی غلطی کی تصحیح کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فی الحال وہ مذاق کو سراہنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ امامہ کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے سالار نے کہا۔ "کھانے کے بعد کہیں کافی پینے چلیں گے۔" اس بار اس کے چہرے پر کچھ نرمی آئی۔

"کچن کا سامان لینا ہے۔" اس نے فوراً" کہا۔

وہ چاول کا چمچ منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گیا۔ "ابھی بھی کوئی سامان لینا باقی ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"گروسری چاہیے۔"

"کیسی گروسری۔۔۔؟ کچن میں سب کچھ تو ہے۔"

"آٹا' چاول' دالیں' مسالے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔" امامہ نے جواباً" پوچھا۔

"ان کو میں نے کیا کرنا ہے؟ میں نے کبھی کھانا نہیں پکایا۔" سالار نے کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔

"لیکن میں تو پکاؤں گی نا۔۔۔ ہمیشہ تو دوسروں کے گھر سے نہیں کھا سکتے ہم۔" امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"جارز اور کنٹینرز بھی چاہئیں۔" امامہ کو یاد آیا۔

"فی الحال آج میرا اس طرح کی خریداری کرنے کا موڈ نہیں ہے۔۔۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے۔" سالار کراہا۔

"اچھا' ٹھیک ہے' کل خرید لیں گے۔" امامہ نے کہا۔

اس رات وہ کافی کے لیے قریبی مارکیٹ تک ہی گئے تھے۔ گاڑی فورٹریس کے گرد گھماتے ہوئے انہوں نے

وہیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے کافی پی۔

"شکر ہے' کتابوں کو تو جگہ مل گئی۔"

سالار کافی پیتے ہوئے چونکا۔ وہ کھڑکی سے باہر دور شاپس کو دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔ اس کے لاشعور میں اب بھی کہیں وہ کتابیں ہی اٹکی ہوئی تھیں۔

"وہ کتابیں نہیں ہیں۔" سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

کافی کا گھونٹ بھرتے اس نے چونک کر سالار کو دیکھا۔

پچانوے فیصد ناولز ہیں۔۔۔ وہ بھی چیپ رومانس۔۔۔ پانچ دس میں سمجھ سکتا ہوں۔۔۔ چلو اتنے سالوں میں سو دو سو بھی ہو سکتے ہیں۔۔۔ لیکن ڈیڑھ دو ہزار اس طرح کے ناولز۔۔۔؟ تمہارا کتنا اسٹیمنا ہے اس طرح کی ربش پڑھنے کے لیے اور تم نے باقاعدہ مارک کر کے پڑھا ہے ان ناولز کو۔ میرا خیال ہے' پاکستان میں چیپ رومانس کی سب سے بڑی کلیکشن اس وقت میرے گھر پر ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ کافی پیتے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

سالار کچھ دیر اس کی طرف سے کسی رد عمل کا انتظار کرتا رہا' پھر اس کی لمبی خاموشی پر اسے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ برا نہ مان گئی ہو۔ اپنا بایاں بازو اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے جیسے خاموش معذرت پیش کی۔

"ٹھیک ہے' چیپ رومانس ہے' لیکن اچھا لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ دیر بعد بولی۔

"وہاں لوگ ہمیشہ مل جاتے ہیں۔۔۔ کوئی کسی سے بچھڑتا نہیں ہے۔۔۔ میرے لیے ونڈر لینڈ ہے یہ۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جیسے کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا اور اسے سنتا رہا۔

"جب اپنی زندگی میں کچھ بھی اچھا نہ ہو رہا ہو تو کسی ایسی دنیا میں جانا اچھا لگتا ہے' جہاں سب کچھ پرفیکٹ ہو۔ وہاں وہ کچھ ہو رہا ہو' جو آپ چاہتے ہیں۔۔۔ وہ مل رہا ہو' جو آپ سوچتے ہوں۔۔۔ جھوٹ ہے یہ سب کچھ لیکن کوئی بات نہیں' اس سے میری زندگی کی کڑواہٹ تھوڑی کم ہوتی تھی۔۔۔ جب میں جاب نہیں کرتی تھی تب زیادہ پڑھتی تھی ناولز۔ کبھی کبھار' سارا دن اور ساری رات۔۔۔ جب میں یہ ناولز پڑھتی تھی تو مجھے کوئی بھی یاد نہیں آتا تھا۔ امی ابو' بہن بھائی' بھتیجے' بھتیجیاں' بھانجے بھانجیاں۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ ورنہ بہت مشکل تھا سارا دن یا رات کو سونے سے پہلے اپنی فیملی کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا' اپنی زندگی کے علاوہ کسی اور کے بارے میں پریشان ہونا' میں خوف ناک خواب دیکھتی تھی اور پھر میں نے ان ناولز کے ذریعے خوابوں کی ایک دنیا بسالی۔ میں ناول کھولتی تھی اور یک دم زندگی بدل جاتی تھی۔ میری فیملی ہوتی تھی اس میں۔۔۔ میں ہوتی تھی۔۔۔ جلال ہوتا تھا۔"

سالار کافی کا گھونٹ نہیں لے سکا۔ اس کے لبوں پر اس وقت اس "شخص" کا نام سن کر کتنی اذیت ہوئی تھی اسے۔۔۔ نہیں' اذیت بہت ہی چھوٹا سا لفظ ہے۔ ایسی تکلیف انسان کو شاید مرتے وقت ہوتی ہو گی۔ ہاں' اگر یہ ناولز اس کی "کامل دنیا" اور اس کا ونڈر لینڈ تھے تو اس میں جلال انصر ہی ہوتا ہو گا' سالار سکندر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مذہباً" اور قانوناً" ایک رشتے میں بندھی تھی' دل کے رشتے میں کہاں بندھی تھی۔ دل کے رشتے میں تو شاید ابھی تک۔۔۔ اور وہ تو ماضی تھا جہاں جلال انصر کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ رنجیدگی سے سوچ رہا تھا اور امامہ کو بولتے ہوئے شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے جلال کا نام لیا اور کس پیرائے میں لیا تھا' احساس ہوتا تو وہ ضرور اٹکتی یا کم از کم ایک بار سالار کا چہرہ ضرور دیکھ لیتی۔ وہ ابھی بھی کھڑکی سے

باہر دیکھ رہی تھی۔ ابھی بھی کہیں "اور" تھی۔ ابھی بھی "کسی" کا صبر آزما رہی تھی۔

"اچھا لگتا تھا مجھے اس دنیا میں رہنا۔ وہاں امید تھی... روشنی تھی... انتظار تھا لیکن لاحاصل نہیں' تکلیف تھی مگر ابدی نہیں' آنسو تھے مگر کوئی پونچھ دیتا تھا اور واحد کتابیں تھیں جن میں امامہ ہاشم ہوتی تھی' آمنہ نہیں۔ ہر بار ان کتابوں پر اپنا نام لکھتے ہوئے میں جیسے خود کو یاد دلاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ دوبارہ کتاب کھولنے پر جیسے کتاب مجھے بتاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ وہ مجھے میرے پرانے نام سے بلاتی تھی۔ اس نام سے' جس سے اتنے سالوں میں مجھے کوئی اور نہیں بلاتا تھا۔ تاریکی میں بعض دفعہ اتنی روشنی بھی بہت ہوتی ہے۔ جس سے انسان بے شک اپنے آپ کو نہ دیکھ پائے لیکن اپنا وجود محسوس کرنے کے تو قابل ہو جائے۔"

اس کی آواز اب بھیگنے لگی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے کپوں میں کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور وہ اسے اب پینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب ڈیش بورڈ پر پڑے ٹشو باکس سے ٹشو پیپر نکال کر اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ لے لیا۔ ایک ڈمپسٹر میں دونوں کپ پھینکنے کے بعد وہ دوبارہ گاڑی میں آکر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے امامہ سے پوچھا۔

"اور کافی چاہیے تمہیں؟"

"نہیں۔" واپسی کا راستہ غیر معمولی خاموشی میں طے ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے آفس کا کچھ کام ہے تم سو جاؤ۔" وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے بجائے کمرے سے نکل گیا۔

"میں انتظار کروں گی۔" امامہ نے اس سے کہا۔

"نہیں' مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔" اس نے امامہ کے ہاتھ میں پکڑے ناول کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا جو وہ رات کو پڑھنے کے لیے لے کر آئی تھی۔

اسے واقعی آفس کے کچھ کام نمٹانے تھے' مگر اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ آخری کام جو وہ آج کرنا چاہتا تھا' وہ یہ تھا۔ کچھ دیر وہ لیپ ٹاپ آن کیے اپنی ٹیبل پر بیٹھا رہا' پھر یک دم اٹھ کر گیسٹ روم میں آگیا۔ لائٹ آن کرتے ہی کتابوں سے بھری ہوئی سامنے دیوار کے ساتھ لگی الماریاں اس کی نظروں کے سامنے آگئیں۔ اس نے ان کتابوں کو وہاں کچھ گھنٹے پہلے ہی رکھا تھا' بڑی احتیاط اور نفاست کے ساتھ۔ مصنف کے نام کے اعتبار سے ان کی مختلف ریکس پر گروپنگ کی تھی... تب تک وہ اس کے لیے صرف "امامہ کی کتابیں" تھیں لیکن اب وہ ان تمام کتابوں کو اٹھا کر بحیرہ عرب میں ڈبو دینا چاہتا تھا یا کم از کم راوی میں تو پھینک ہی سکتا تھا۔ وہ اب کتابیں نہیں ردی تھی۔

امامہ کی وہ تصوراتی پرفیکٹ زندگی جو وہ جلال انصر کے ساتھ گزارتی رہی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو ہزار رومانس ان کرداروں کے رومانس نہیں تھے جو ان ناولز میں تھے۔ وہ صرف دو کرداروں کا رومانس تھا۔ امامہ اور جلال کا... اعلا ظرف بننے کے لیے کھلے دل یا برداشت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دماغ کا کام نہ کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ وہ ریکس پر لگی ان کتابوں کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ امامہ کے اس اعتراف کے بعد کوئی شوہر بھی برداشت نہ کر پاتا وہ بھی اس کا شوہر تھا۔ وہ ان کتابوں کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی... روتی دھوتی' ناراض ہوتی لیکن اتنی بااختیار نہیں تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر ان کتابوں کو وہاں رکھ سکتی۔ وہ عورت تھی۔ ضد کر سکتی تھی' منوا نہیں سکتی تھی۔ وہ مرد تھا اسے اپنی مرضی کے لیے ضد جیسے کسی حربے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا گھر تھا' یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ شرائط کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا نہ ہی ایسے جی سکتا ہے۔ وہ

مراعات کے ساتھ دنیا میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ دنیا میں رہتا ہے۔

تو آسان حل یہ تھا جو اسے معاشرہ اور اس کا ذہن بتا رہا تھا۔ مشکل حل وہ تھا جو اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا اور دل کہہ رہا تھا۔ "چھوڑو' جانے دو یار! یہ زہر کا گھونٹ ہے لیکن پی جاؤ۔" اور دل نہ بھی کہتا تب بھی وہ اس چیز کو اپنے گھر سے نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا' جو امامہ کی ملکیت تھی۔ جو کبھی اس کے دکھوں کے لیے مرہم بنی تھی۔ ان کتابوں کے کرداروں میں وہ جس کسی کو بھی سوچتی رہی تھی لیکن ان کتابوں پر لکھا ہوا نام اس کا اپنا تھا اور یہ وہ نام تھا جو اس کی روح کا حصہ تھا۔ صبر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور کوئی بھی قسم آسان نہیں ہوتی' وہاں کھڑے اس نے سوچا اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ رمضان میں کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسٹڈی روم میں واپس آکر اس نے سگریٹ سلگایا تھا۔ اس وقت خود کو نارمل کرنے کے لیے یہی واحد حل اس کی سمجھ میں آیا۔ ایک سگریٹ پینے کی نیت سے بیٹھے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنے سگریٹ پی چکا ہے۔

"سالار...!" امامہ کی آواز پر وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے چونکا۔ غیر محسوس انداز میں بائیں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں مسلا۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی اور یقیناً" اس کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ چکی تھی۔ نہ بھی دیکھتی تب بھی کمرے میں پھیلی سگریٹ کی بو اسے بتا دیتی۔

"تم اسموکنگ کرتے ہو؟" وہ جیسے کچھ پریشان اور شاکڈ انداز میں آگے بڑھی۔

"نہیں' بس کبھی کبھار۔ جب اپ سیٹ ہوتا ہوں تو ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں۔" کہتے ہوئے سالار کی نظر ایش ٹرے پر پڑی۔ وہ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔

"آج کچھ زیادہ ہی پی گیا۔"

وہ بڑبڑایا پھر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم سوئیں نہیں ابھی تک؟"

"تم میری وجہ سے اپ سیٹ ہو؟" اس نے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا...

تو اس نے محسوس کر لیا؟ سالار نے اس کا چہرہ دیکھا اور سوچا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف اور اضطراب تھا۔ وہ نائٹی میں ملبوس اونی شال اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ سالار جواب دینے کے بجائے راکنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کرسی کو ہلانا بند کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی نے جیسے اس کے اضطراب میں اور اضافہ کیا۔

"تمہاری فیملی نے کچھ کہا ہے...؟... یا میری فیملی نے کچھ کیا ہے؟"

وہ کیا سوچ رہی تھی؟ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا... کاش "یہ" وجہ ہوتی "وہ" نہ ہوتی' جو تھی۔

"کیا کہے گی میری فیملی...؟ یا کیا کرے گی تمہاری فیملی...؟" اس نے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ اسی طرح الجھی ہوئی یوں چپ کھڑی رہی جیسے اسے خود بھی اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن وہ خاموش اسے دیکھتی رہی' یوں جیسے اسے یقین ہو کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کیسے کیسے خدشات ذہن میں لیے بیٹھی ہے۔

وہ راکنگ چیئر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت امامہ پر جیسے ترس آیا تھا۔

"یہاں آؤ!" اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اس کا بایاں ہاتھ پکڑا۔ وہ جھجکی' ٹھٹکی پھر اس کی آغوش میں آگئی۔ سالار نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اس کی شال کے اندر کرتے ہوئے' اس کی شال کو اس کے گرد اور اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے' کسی ننھے بچے کی طرح اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے تھپکا اور اس کا سر چوما۔

"کوئی کچھ نہیں کہہ رہا.... اور کوئی کچھ نہیں کر رہا.... ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہے اور اگر کچھ ہو گا تو میں دیکھ لوں گا سب کچھ۔ تم اب ان چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دو۔"

وہ اسے گود میں لیے اب دوبارہ راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔

"پھر تم اپ سیٹ کیوں ہو؟"

"میں....؟.... میرے اپنے بہت سے مسئلے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

امامہ نے گردن اوپر کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اتنے دنوں میں وہ پہلی بار اسے اتنا سنجیدہ لگا تھا۔

"سالار! تم...."

"میں پریشان نہیں ہوں اور اگر ہوں بھی تو تم اس کی وجہ نہیں ہو۔ اب دوبارہ مجھ سے یہ سوال مت کرنا۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے کچھ سخت لہجے میں جھڑکنے والے انداز میں اس کی بات کاٹ کر سوال سے پہلے جواب دیا۔ وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا اور سالار کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے کہ کچن کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے....؟" اس نے اس بار بے حد نرمی کے ساتھ موضوع بدلا۔

امامہ نے ایک بار پھر اسے ان چیزوں کے نام بتائے۔

"کل چلیں گے رات کو گروسری کے لیے۔"

امامہ نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ اس کے سینے پر سر رکھے' وہ دیوار پر اس سوفٹ بورڈ پر لکھے' بہت سے نوٹس' ڈیڈ لائنز اور کچھ عجیب سے انڈیکسز والے چارٹس دیکھتی رہی' پھر اس نے سالار سے پوچھا۔

"تم بینک میں کیا کرتے ہو؟"

وہ ایک لمحہ کے لیے چونکا' پھر اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بورڈ پر نظر ڈالی۔

"میں بے کار کام کرتا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔

"مجھے بینکرز کبھی اچھے نہیں لگے۔" امامہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے غلط وقت پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

"جانتا ہوں' تمہیں ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں۔" سالار کے لہجے میں خنکی آئی تھی۔

"ہاں' مجھے ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں۔" امامہ نے سادہ لہجے میں بورڈ کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی محسوس کیے بغیر' اس کے سینے پر سر رکھے اس کی تائید کی۔ یہ کہتے ہوئے اسے جلال کا خیال نہیں آیا تھا لیکن سالار کو آیا تھا۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم بینک میں کیا کرتے ہو؟" امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

"میں پبلک ریلیشننگ میں ہوں۔" اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا' وہ خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ امامہ نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔

"یہ پھر بھی بہتر ہے۔ اچھا ہے تم ڈائریکٹ بینکنگ میں نہیں ہو۔ تم نے کیا پڑھا تھا سالار؟"

"ماس کمیونیکیشنز۔" وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ بول رہا تھا۔

"مجھے یہ سبجیکٹ بہت پسند ہے۔ تمہیں کچھ اور بننا چاہیے تھا۔"

"یعنی ڈاکٹر؟" سالار سلگا لیکن امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"ماس کمیونیکیشنز پڑھ کر تو ڈاکٹر نہیں بن سکتے۔" سالار نے جواب نہیں دیا۔ اگر وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو اتنی بے تکلفی کے ساتھ یہ سارے تبصرے نہ کر رہی ہوتی۔

"میں ڈاکٹروں سے نفرت کرتا ہوں۔" سالار نے سرد لہجے میں کہا وہ بے اختیار سالار سے الگ ہوئی۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ بے تاثر تھا' کم از کم امامہ اسے پڑھ نہیں سکی۔

"ایسے ہی۔" سالار نے کندھے اچکاتے ہوئے بڑی سرد مہری سے کہا۔

"ایسے ہی کیسے....؟ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔" وہ جز بز ہوئی۔

"تمہیں کیوں ناپسند ہیں بینکرز؟" سالار نے ترکی بہ ترکی جواب کہا۔

"بددیانت ہوتے ہیں۔" امامہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"بینکر؟" سالار نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔" اس بار وہ سنجیدہ تھی۔

وہ سالار کا بازو اپنے گرد سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب قریب جا کر بورڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس پر لگائے ہوئے نوٹس اور ڈیڈ لائنز پڑھ رہی تھی۔

"بینکرز لوگوں کا پیسہ' اثاثہ محفوظ رکھتے ہیں۔"

اس نے اپنے عقب میں سالار کو بڑے جتانے والے انداز میں کہتے سنا۔

"اور پیسہ لوگوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"اس کے باوجود لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ اس بار امامہ پلٹی۔

"لیکن وہ آپ پر بھروسا نہیں کرتے۔"

وہ مسکرا رہی تھی مگر سالار نہیں۔ اس نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا' پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک بددیانت بینکر صرف آپ کا پیسہ لے سکتا ہے لیکن ایک بددیانت ڈاکٹر آپ کی جان لے سکتا ہے تو پھر زیادہ خطرناک کون ہوا؟"

اس بار امامہ بول نہیں سکی۔ اس نے چند منٹ تک جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اسے جواب نہیں ملا' پھر اس نے یک دم سالار سے کہا۔

"اگر میں ڈاکٹر ہوتی تو پھر بھی تمہیں ڈاکٹرز سے نفرت ہوتی....؟"

وہ اب اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔ یہ غلط تھا لیکن اب وہ اور کیا کرتی؟

"میں ممکنات پر کوئی نتیجہ نہیں نکالتا' زمینی حقائق پر نکالتا ہوں۔ جب "اگر" ایگزسٹ نہیں کرتا تو میں اس پر رائے بھی نہیں دے سکتا۔" اس نے کندھے اچکا کر صاف جواب دیا۔

امامہ کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا۔ جواب غیر متوقع تھا' کم از کم سالار کی زبان سے۔

"زمینی حقائق یہ ہیں کہ تم میری بیوی ہو اور تم ڈاکٹر نہیں ہو۔ میں بینکر ہوں اور میں ڈاکٹرز سے نفرت کرتا ہوں۔"

اس کے لہجے کی ٹھنڈک پہلی بار امامہ تک پہنچی تھی' لہجے کی ٹھنڈک یا پھر آنکھوں کی سرد مہری۔ وہ بول نہیں سکی اور نہ ہی ہل سکی۔ ایک ہفتے میں اس نے اس طرح تو کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

"رات بہت ہو گئی ہے' سونا چاہیے ہمیں۔"

وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اسے دیکھے بغیر کرسی سے اٹھ کر چلا گیا۔

وہ دیوار کے ساتھ لگی جھولتی ہوئی کرسی کو دیکھتی رہی' وہ اس کے بدلتے موڈ کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہے تھے جس پر وہ اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرتا۔ وہ وہاں کھڑی اپنی اور اس کے درمیان

ہونے والی گفتگو کو شروع سے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے بینکرز کے بارے میں میرے کمنٹس اچھے نہیں لگے۔ وہ جیسے تجزیہ کر رہی تھی۔

جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو کمرے کی لائٹ آن تھی لیکن وہ سوچکا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ سارا دن کام کرتی رہی تھی لیکن بری طرح تھک جانے کے باوجود اس وقت اس کی نیند یک دم غائب ہو گئی تھی۔ سالار کے بارے میں سارے اندیشے، جو اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ہفتے نے سلا دیے تھے، یک دم پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ وہ اس کی طرف کروٹ لیے ہوئے سو رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا، کم از کم نیند کی حالت میں پرسکون لگ رہا تھا۔

"آخر مرد اتنی جلدی کیوں بدل جاتے ہیں؟ اور اتنے ناقابل اعتبار کیوں ہوتے ہیں؟" اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اس کی رنجیدگی میں اضافہ ضرور ہوا تھا۔ زندگی اتنی محفوظ نہیں ہوئی تھی جتنی وہ کچھ گھنٹے پہلے تک سمجھ رہی تھی۔

"آج لائٹ آن کر کے سو گئی کیا؟" سالار کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

وہ یقیناً "گہری نیند میں نہیں تھا۔ امامہ نے ہاتھ بڑھا کر لائٹس آف کر دیں لیکن وہ سونے کے لیے نہیں لیٹی تھی۔ اندھیرے میں سالار نے دوبارہ اس کی طرف کروٹ لی۔

"تم سو کیوں نہیں رہیں؟"

"ابھی سو جاؤں گی۔"

سالار نے ہاتھ بڑھا کر اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ امامہ نے کچھ کہے بغیر کمبل خود پر کھینچا اور سیدھے لیٹتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سالار چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے لیمپ دوبارہ آف کر دیا۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں کھول لیں۔

"تمہیں سحری کے وقت بھی اٹھنا ہے امامہ!"

اسے حیرت ہوئی، اس نے اندھیرے میں اسے آنکھیں کھولتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا۔
گردن موڑ کر اس نے سالار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی، اسے کچھ نظر نہ آیا۔

"تمہیں پتا ہے سالار! دنیا کا سب سے بے ہودہ کام کون سا ہے؟" اس نے سالار کی طرف کروٹ لے کر کہا۔

"کیا...؟"

"شادی۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے سالار کو کہتے سنا۔

"I agree"

امامہ کو بے اختیار دکھ ہوا۔ کم از کم سالار کو اس بات سے اتفاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سالار کا بازو اپنے گرد حمائل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اب اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"گڈ نائٹ۔" یہ اسے سلانے کی ایک اور کوشش تھی۔

وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کچھ بے چین ہو کر کہا۔

"سالار!"

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا اور آنکھیں کھول دیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے...؟"

"کچھ نہیں۔" جھوٹ "ضروری" تھا، لیکن سچ بے حد "مضر" تھا۔

"تم میرے ساتھ اتنے روڈ ہوئے۔" اس نے بالآخر شکایت کی۔

"آفس کے کسی پرابلم کی وجہ سے میں کچھ اپ سیٹ تھا شاید اسی لیے روڈ ہو گیا۔" اس نے معذرت کی، وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

"کیسا پرابلم؟"

"ہوتے رہتے ہیں امامہ... you just don't worry اگر آئندہ کبھی بھی میرا ایسا موڈ ہو تو تم پریشان مت ہونا، نہ ہی مجھ سے زیادہ سوال جواب کرنا۔ میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

امامہ کی سمجھ میں اس کی توجیہہ نہیں آئی تھی لیکن وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

"میں اس لیے پریشان ہو رہی تھی، کیونکہ مجھے لگا کہ شاید تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے۔ میں نے بینکرز کو برا کہا تھا نا اس لیے۔"

"تمہیں تو سات خون معاف کر سکتا ہوں میں، یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔"

اس نے ایک بار پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، ڈاکٹرز میں بھی بہت سی برائیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے بس اچھے لگتے ہیں وہ... بس محبت ہے مجھے ڈاکٹرز سے... میں بھی ان کی ساری خامیاں اگنور کر سکتی ہوں۔" سالار کی آنکھوں سے نیند یک دم غائب ہو گئی۔ وہ کسی اور حوالے سے وضاحت دے رہی تھی، اس نے اسے کسی اور پیرائے میں لیا۔

"تمہیں واقعی ڈاکٹرز سے نفرت ہے؟" وہ اب بے یقینی کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

"جو چیز تمہیں پسند ہو، میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں... ؟ مذاق کر رہا تھا میں۔" امامہ کے ہونٹوں پر مطمئن مسکراہٹ آئی۔

اس نے بھی سالار کے گرد اپنا بازو حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے نیند آ رہی ہے، تم بھی سو جاؤ۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ محبوب کی دو خصوصیات یونیورسل ہوتی ہیں۔ وہ بے نیاز ہوتا ہے... اور... اور اپنی بے نیازی سے بے خبر بھی... اور یہ دونوں خصوصیات اس کے محبوب میں بھی تھیں۔ جلال انصر سے اسے ایک بار پھر شدید قسم کا حسد محسوس ہوا... لیکن رشک اسے اپنے آپ پر آیا کہ وہ اس کے "پاس" تھی... اور اس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"صاحب نے نیوز پیپرز کا کہا تھا کہ آپ سے پوچھ لوں اور یہ میگزین ہیں، ان میں سے جو پسند ہیں، بتا دیں، میں لے آیا کروں گا۔"

نیوز ہاکر نے اسے ایک کاغذ تھماتے ہوئے کہا جس پر اخبارات اور میگزینز کی ایک لسٹ تھی۔ وہ نیند میں بیل بجنے کی آواز پر اٹھ کر آئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ سالار کے گھر اس نے صرف اتوار کو اخبار دیکھا تھا، وہ بھی سالار نے ہاکر سے خود لیا تھا۔ وہ خود آفس میں ہی اخبار دیکھتا تھا۔ اب وہ یقیناً "اس کی وجہ سے اخبار لگوا رہا تھا۔ ایک نظر اس لسٹ پر ڈال کر اس نے ہاکر کو ایک اخبار اور ایک میگزین کا بتایا۔ وہ اخبار اسے تھما کر چلا گیا۔ وہ جمائیاں لیتے ہوئے اخبار اندر لائی اور رکھ دیا۔ دس بجنے والے تھے، کھڑکی سے باہر دھند چھٹ رہی تھی لیکن ابھی بھی کچھ تھی۔

جتنی دیر میں ملازمہ آئی، وہ اخبار دیکھ چکی تھی۔ ملازمہ آج اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ مالی بھی تھا۔ وہ فرقان کے پودے دیکھنے آیا تھا۔ وہ سالار کے پودے اتوار کے دن دیکھنے آتا تھا یا پھر نوشین خود اس کے ساتھ وہاں آتی تھی۔ سالار کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ان کے پاس بھی تھی۔ آج نوشین نے یہاں امامہ کی موجودگی کی وجہ سے اسے بھیج دیا تھا۔

وہ اس کے ٹیرس پر جانے کے کچھ دیر کے بعد خود بھی باہر نکل آئی۔ مالی کے پاس کھڑے خاموشی سے اسے دیکھتے رہنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ اسے کسی قسم کی ہدایات کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ماہرانہ انداز میں اپنا کام کر رہا تھا، وہ واپس اندر آگئی۔ ملازمہ نے بڑے پرجوش انداز میں کچن میں رکھے ہوئے برتنوں کو نوٹس کرنے کے بعد تعریف کی۔ امامہ بے اختیار خوش ہوئی۔

"باجی! اب یہ گھر، گھر لگ رہا ہے۔" اس نے امامہ سے کہا۔ وہ سالار کی اسٹڈی کو ویکیوم کر رہی تھی۔ امامہ مسکراتی ہوئی سالار کی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ڈسٹ صاف کرنے لگی۔

"باجی! میں کرتی ہوں، آپ رہنے دو۔" ملازمہ نے اسے روکا۔

"نہیں، تم باقی سب کرلینا۔ میں ابھی فارغ ہوں، اس لیے کر رہی ہوں۔" وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ نہیں چاہتی کہ سالار کا کوئی کاغذ ادھر ادھر ہو جائے لیکن یہ سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں اس اسٹڈی ٹیبل کو اتنے عرصے سے وہ ملازمہ ہی صاف کر رہی ہے۔

میل ٹرے دعوتی کارڈز کے بند اور کھلے لفافوں سے تقریباً" بھری ہوئی تھی۔ امامہ نے ایک لفافہ کھول کر دیکھا۔ وہ کسی افطار پارٹی کا انویٹیشن تھا۔ ایک کے بعد ایک، وہ سارے لفافے کھول کر دیکھتی گئی۔ سب کارڈ کسی نہ کسی افطار پارٹی یا تقریب سے متعلق تھے اور بعض کارڈز میں تو وہ دو یا تین جگہوں پر بھی انوائٹڈ تھا۔ وہ یقیناً" بے حد سوشل زندگی گزار رہا تھا۔ یہ اس کا اندازہ تھا، یقیناً" وہ اس کے گھر آجانے کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے ان پارٹیز میں نہیں جا رہا تھا۔ یہ اس کا ایک اور تجزیہ تھا۔ پندرہ بیس کارڈز دیکھنے کے بعد اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے کارڈز اٹھا کر واپس رکھ دیے۔ کچھ اور کارڈز دیکھتی یا نیچے میل کے کسی لفافے کے ایڈریس پر نظر ڈال لیتی تو شاید اسے سالار کا شعبہ نظر آجاتا کہ وہ انویسٹمنٹ میں تھا، پی آر میں نہیں۔ کم از کم وہ یہ جھوٹ تو ضرور پکڑ سکتی تھی۔

"باجی! رات کو کوئی مہمان آئے تھے؟" وہ ملازمہ کی آواز پر چونکی۔ وہ ایش ٹرے ہاتھ میں لیے کچھ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔" امامہ نے سوال سمجھے بغیر کہا۔

"تو یہ سگریٹ کس نے پیے ہیں؟ سالار صاحب تو سگریٹ نہیں پیتے۔" ملازمہ بے حد حیران تھی۔

امامہ کچھ دیر بول نہیں سکی۔ ملازمہ جیسے سالار کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔ یعنی وہ واقعی عادی نہیں تھا جو ایک آدھ سگریٹ وہ بھی کبھی کبھار پیتا ہو گا، اسے ملازمہ کسی مہمان کا پیا ہوا سگریٹ سمجھ لیتی ہو گی۔

"اوہ! ہاں... اس کے کچھ دوست آئے تھے، مجھے یاد ہی نہیں تھا۔" امامہ نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، ڈور بیل بجی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" امامہ اس سے کہہ کر باہر نکل آئی۔

"لانڈری کولیکٹ کرنے آئے ہیں۔"

دروازے پر ایک لڑکا سالار کے کچھ ڈرائی کلینڈ اور دھلے ہوئے کپڑوں کے ہینگرز لیے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی طرف ایک بل کے ساتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"کپڑے چیک کرلیں۔"

بل کے ساتھ لانڈری کے لیے بھیجے گئے کپڑوں کی لسٹ بھی تھی۔ امامہ نے ہینگرز لاؤنج میں لانے کے بعد باری باری لسٹ اور کپڑوں کو ملانا شروع کیا، کپڑے پورے تھے۔

ملازمہ تب تک باہر نکل آئی تھی۔ امامہ بل کے پیسے لینے اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے ملازمہ کو دروازے پر لانڈری بوائے کو ایک لانڈری بیگ تھماتے ہوئے دیکھا۔ جس کے اوپر ایک لسٹ چسپاں تھی۔ یقیناً" وہ ان کپڑوں کی لسٹ تھی جو لانڈری کے لیے دیے جا رہے تھے۔ لانڈری بوائے ایک رائٹنگ پیڈ پر کچھ اندراج کر رہا تھا۔

"باجی! آپ نے بھی دینے ہیں کپڑے؟" ملازمہ نے اسے آتے دیکھ کر کہا۔

"نہیں، میں یہ بل دینے آئی ہوں۔" امامہ نے بل کی رقم اس لڑکے کی طرف بڑھائی۔ اس نے جواباً" ایک رسید اس کی طرف بڑھا دی۔

"بل تو مہینے کے شروع میں اکٹھا ہی جاتا ہے۔" ملازمہ نے اسے روکا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آگئی۔ امامہ نے رسید پر نظر ڈالی۔ وہ سالار کے کپڑوں کی لسٹ تھی جو وہ لے کر گیا تھا۔

"تم نے لانڈری کے کپڑے کہاں سے لیے ہیں؟" امامہ نے اس لسٹ کو پڑھتے ہوئے ملازمہ کو روکا۔

"سالار صاحب کپڑے بیگ میں ڈال کر اوپر لسٹ رکھ جاتے ہیں۔ لانڈری میں ہی رکھتے ہیں بیگ۔" ملازمہ یہ کہہ کر دوبارہ اندر چلی گئی۔

امامہ نے بل پر نظر ڈالی۔ لانڈری تو وہ خود بھی کر سکتی تھی۔ ہر ہفتے اتنے پیسے اس پر خرچ کرنا فضول خرچی تھی، اس نے سوچا۔

ملازمہ ابھی وہیں تھی جب ایک آدمی وہ پردے لے کر آیا تھا جو اس نے بننے کے لیے دیے تھے۔

"باجی! آپ نے کوئی پردے بننے کے لیے دیے ہیں؟"

ملازمہ نے انٹرکام کی بیل بجنے پر ریسیور اٹھا کر ان سے پوچھا۔

امامہ کچھ حیران ہوئی۔ "ہاں... کیوں؟"

"وہ نیچے گیٹ پر ایک آدمی لے کر آیا ہے، گارڈ انٹرکام پر پوچھ رہا ہے۔ ہاں! بھیج دو، باجی نے پردے بنوائے ہیں۔" ملازمہ نے اس کو بتا کر ریسیور پر گارڈ سے کہا۔ ریسیور رکھ کر وہ دوبارہ لاؤنج صاف کرنے میں لگ گئی تھی۔

کچن کاؤنٹر پر گلاس سیٹ کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے امامہ کو عجیب طرح کا احساس کمتری ہوا۔ اس نے اتنے دنوں وہاں چلتے پھرتے کئی بار انٹرکام کو دیکھا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس انٹرکام کی وہاں کیا افادیت ہے، جبکہ دروازہ اتنا قریب تھا۔ ملازمہ اس گھر کی ہر چیز کو اس سے زیادہ ذہانت، پھرتی اور سہولت کے ساتھ استعمال کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سالار! لاؤنج اب اچھا لگ رہا ہے نا؟"

سالار نے لاؤنج کی کھڑکیوں پر لگے نئے پردوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے گھر آیا تھا۔ امامہ نے بے حد خوشی کے عالم میں آتے ہی اسے اطلاع دی۔ وہ نہ بھی دیتی تب بھی لاؤنج میں پہلا قدم رکھتے ہی وہ اس "واضح" تبدیلی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"بہت۔" اس نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے فخریہ انداز میں پردوں کو دیکھا۔

وہ آج بھی افطاری راستے میں ہی کر آیا تھا۔ امامہ نے افطاری فرقان کے گھر پر کی تھی اور اب وہ دونوں ایک ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔

"تو جناب کا آج کا دن کیسا گزرا؟"

کھانا شروع کرتے ہوئے سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ اسے پورے دن کی ایکٹوٹیز بتانے لگی۔ آج ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔ سالار نے اسے دن میں دوبار' ایک یا ڈیڑھ منٹ کے لیے کال کی تھی مگر بات صرف حال احوال تک ہی رہی تھی۔

"یعنی آج بہت کام کرنا پڑا۔" سالار نے اس کے دن کی تفصیل سن کر کہا۔

"کیا کام... ؟میں نے کیا کیا... ؟میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" امامہ نے اس کی بات پر کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"جتنا بھی کیا ہے بہت ہے۔"

"میں تمہاری لانڈری خود کر دیا کروں گی اگلے ہفتے سے۔" امامہ نے سالار کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"اور پریس بھی کر دیا کروں گی۔"

"میں تمہیں کپڑے دھونے کے لیے نہیں لے کر آیا۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔

"مجھے پتا ہے لیکن میں فارغ ہوتی ہوں سارا دن اور پھر مجھے اپنے کپڑے بھی تو دھونے ہیں تو تمہارے بھی دھو سکتی ہوں۔"

"تم اپنے کپڑے بھی کیوں دھوؤ گی۔ لانڈری وین ہر ہفتے آتی ہے۔ تم اپنے بھی دے دیا کرو۔" سالار نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر کہا۔

"پیسے ضائع ہوں گے۔" اس نے بے اختیار کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" سالار نے اسی انداز میں کندھے اچکا کر کہا۔

امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اور میں سارا دن کیا کروں؟"

"وہی جو دوسری عورتیں کرتی ہیں۔ سویا کرو' ٹی وی دیکھو' فون پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاؤ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے کوئی دوست نہیں ہیں۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔

سالار نے کچھ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ "کوئی تو ہو گا... ؟"

"نہیں' کوئی بھی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

وہ کھانا کھاتے کھاتے کچھ سوچنے لگی تھی' پھر اس نے کہا۔

"کالج اور یونیورسٹی میں تو میں اتنی خوف زدہ رہتی تھی کہ کسی کو دوست بنانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ دوستی ہوتی تو پھر سوال ہوتے... میرے بارے میں... فیملی کے بارے میں... پھر اگر کوئی گھر آتا اور ابو کی فیملی کو کوئی پہلے ہی سے جانتا ہوتا تو... یا سعیدہ اماں کو ہی... دوستی اس وقت بڑی مہنگی چیز تھی میرے لیے... میں افورڈ نہیں کر سکتی تھی... پھر آفس جاب میں کولیگز کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ ہوتی تھی لیکن مجھے اکیلے رہنے کی اتنی عادت ہو گئی تھی کہ میں لوگوں کے ساتھ کبھی بھی کمفوٹیبل نہیں رہتی تھی۔ میں ان کے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتی تھی... ان کے گھر نہیں جا سکتی تھی... اپنے گھر نہیں بلا سکتی تھی... کیسے دوستی ہوتی پھر... اسی لیے مجھے کتابیں پڑھنا اچھا لگتا تھا... پینٹ کرنا اچھا لگتا تھا۔"

"لوگوں سے میل جول ہونا چاہیے' دوست ہونے چاہییں۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تمہیں تھوڑا سوشلائز کرنا چاہیے۔ اب تمہارا گھر ہے' تم کولیگز کو انوائٹ کر دیا کم از کم ان سے فون پر ہی بات کر لیا کرو۔" وہ اسے بڑی سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

"تم خود سوشل ہو' اس لیے کہہ رہے ہو۔" امامہ نے جواباً" کہا۔

"ہاں' میری جاب کی ضرورت ہے سوشل ہونا۔ ماہ رمضان کے بعد کچھ فنکشنز ہیں... ڈنر بھی ہیں کچھ... تمہیں ملواؤں گا کچھ دوستوں سے بھی... اچھا لگے گا تمہیں۔" وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے تمہارے ڈیسک پر دیکھے ہیں' افطار ڈنرز کے کارڈز۔ تم میری وجہ سے نہیں جا رہے؟" امامہ نے کہا۔

"نہیں' میں افطار پارٹیز یا ڈنرز میں نہیں جاتا۔" سالار نے سرسری انداز میں کہا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ پارٹیز ماہ رمضان کی اسپرٹ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ میں ماہ رمضان میں کسی کے گھر افطار پر نہیں جاتا۔"

"لیکن تم فرقان کے گھر تو جاتے ہو۔" امامہ نے بے ساختہ کہا' وہ مسکرا دیا۔

وہ اس وقت بھی فرقان کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔

"میں فرقان کے گھر ماہ رمضان سے پہلے بھی کھانا کھاتا رہا ہوں اور اگر وہ مجھے افطار یا ڈنر کے لیے بلاتا ہے تو کھانے میں کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو اس کے گھر میں عام دنوں میں پکتا ہے لیکن عام دنوں میں اس کے گھر میں یہ نہیں پکتا۔" سالار نے ٹیبل پر پڑی تین چار چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر... ؟" وہ مزید حیران ہوئی۔

"یہ سارا اہتمام فرقان اور بھابھی تمہارے لیے کر رہے ہیں کیونکہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے تو تمہارے لیے سحری اور افطاری میں بھی اہتمام ہو رہا ہے' ورنہ تو ہم سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ ماہ رمضان میں ہم لوگ اپنے کچن کے لیے گروسری پر عام مہینوں کی نسبت آدھا خرچا کرتے ہیں اور آدھے پیسوں سے ہم کسی اور فیملی کو پورے مہینے کا راشن منگوا دیتے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارا۔" سالار نے اسے متوجہ کیا' وہ خود کھانا ختم کر کے اب میٹھا کھا رہا تھا۔

یہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی روایت تھی۔ ماہ رمضان میں ان کے گھر آنے والا راشن آدھا ہو جاتا تھا۔ گھر کے دو ملازموں کے ماہ رمضان کا راشن اس باقی راشن کی قیمت سے آتا تھا۔

"امامہ!" سالار نے پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔

وہ کھانا کھانے لگی۔ سالار میٹھا بھی ختم کر چکا تھا اور اب منتظر تھا کہ وہ کھانا ختم کر لے۔ وہ خود ساتھ ساتھ سیل پر مسلسل میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کس حد تک بدل گیا تھا اور اس کے اندر آنے والی تبدیلی کس حد تک ڈاکٹر صاحب کی مرہون منت تھی اور کس حد تک اس کی اپنی سوچ کی' اندازہ لگانا مشکل تھا... وہ کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ اس کے کھانا شروع کرنے کا انتظار کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس کی پلیٹ میں ضرور رکھتا تھا اور اس کے کھانا ختم کرنے کے بعد ہی کھانے کی ٹیبل سے اٹھتا۔ وہ یہ باتیں نوٹس نہیں کرنا چاہتی تھی' لیکن وہ یہ نوٹس کیے بغیر بھی رہ نہیں سکتی تھی۔ وہ عجیب تھا۔ "عجیب؟" اس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ امامہ کے ذہن میں نہیں آیا۔

ڈنر کے بعد وہ رات کو کچن کا سودا سلف خریدنے کے لیے گئے تھے۔ امامہ نے اگر سالار کی یہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو یقیناً" وہ کچن کے لیے ایک لمبی چوڑی لسٹ بنائے بیٹھی تھی' لیکن اس نے خریداری کرتے ہوئے' بہت احتیاط

سے کام لیا۔ خریدی جانے والی زیادہ تر اشیا کنٹینرز اور جارز ہی تھے۔ کھانے پکانے کا سامان اس نے بہت کم خریدا تھا۔

آج انہوں نے ایک اور جگہ سے کافی پی تھی۔

"تمہارا وہ پرابلم حل ہو گیا؟" امامہ کو گاڑی میں اچانک یاد آیا۔

"کون سا پرابلم؟" سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"وہ جس کی وجہ سے تم کل رات پریشان تھے۔" امامہ نے اسے یاد دلایا۔

وہ بے اختیار بڑبڑایا۔ "کاش ہو جاتا۔"

"یعنی نہیں ہوا۔" امامہ متفکر ہوئی۔

"ہو جائے گا۔" سالار نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔

"پرسوں میں کراچی جا رہا ہوں۔" سالار نے بات بدلی۔

"کتنے دن کے لیے؟" وہ چونکی۔

"صبح جاؤں گا اور رات کو آ جاؤں گا۔ میں مہینے میں دو تین بار جاتا ہوں کراچی..... تم چلو گی ساتھ.....؟" وہ ہنسا۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ایک دن کے لیے؟"

"ہاں....."

"تم آفس کے کام سے جا رہے ہو' میں کیا کروں گی وہاں؟"

"تم انیتا کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جانا' وہ تمہیں گھمائے پھرائے گی کراچی۔ کبھی گئی ہو پہلے وہاں؟" سالار پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" وہ کچھ ایکسائیٹڈ ہونے لگی تھی۔ سمندر اسے پسند تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے سمندر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

"انیتا سے ٹائی اپ کرتا ہوں پروگرام..... میں آفس میں تم میری بہن کے ساتھ بازاروں میں..... ہم تو اسی طرح کا ہنی مون منا سکتے ہیں فی الحال۔" وہ اسے پھر چھیڑ رہا تھا۔

وہ ہنس پڑی..... وہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ جس زندگی کو وہ گزار کر آئی تھی' اس کے مقابلے میں یہ آزادی اسے جنت جیسی محسوس ہو رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا ہے؟"

وہ خریدا ہوا سودا سلف' جارز اور کنٹینرز میں ڈالنے میں مصروف تھی جب سالار اپنے اسٹڈی روم سے ایک لفافہ لے کر کچن ایریا میں آیا۔

"اس میں تمہاری چیک بک ہے۔" سالار نے اسے بتایا اور لفافہ کاؤنٹر پر رکھ کر چلا گیا۔

امامہ نے لفافہ کھول کر اندر موجود چیک بک نکالی۔ اس کے ساتھ ایک پے سلپ بھی نکل آئی۔ وہ تیس لاکھ کی تھی۔ امامہ کو لگا کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے سلپ کو دوبارہ دیکھا۔ وہ واقعی تیس لاکھ ہی کی تھی۔ اس نے اس کے اکاؤنٹ میں تیس لاکھ کیوں جمع کروائے؟ یقیناً "اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

وہ لفافہ پکڑے اسٹڈی روم میں آ گئی۔ سالار اپنے کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

"سالار! تمہیں پتا ہے تم نے کتنا بڑا بلنڈر کیا ہے؟" امامہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔

"کیسا بلنڈر؟" وہ چونکا۔

امامہ نے اس کے قریب آ کر پے سلپ اس کے سامنے کی۔

"اسے دیکھو ذرا..... یہ کیا ہے؟"

"پے سلپ ہے۔" سالار نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے دوبارہ ڈیسک ٹاپ پر نظر دوڑانا شروع کر دی۔

"کتنی رقم جمع کروائی ہے تم نے میرے اکاؤنٹ میں؟"

"تیس لاکھ۔" وہ حیران ہوئی۔

"ابھی کچھ رہتی ہے' سات لاکھ اور کچھ..... چند ماہ میں وہ بھی دے دوں گا۔"

وہ کچھ ٹائپ کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔

"لیکن کیوں دو گے مجھے.....؟ کس لیے؟" وہ حیران تھی۔

"تمہارا حق مہر ہے۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔

"میرا حق مہر دو لاکھ روپے ہے۔" امامہ کو لگا کہ شاید وہ بھول گیا ہے۔

"وہ آمنہ کا تھا' میں تمہیں زیادہ حق مہر دینا چاہتا ہوں۔" سالار نے کندھے اچکا کر کہا۔

"لیکن یہ تو بہت ہی زیادہ ہے سالار۔" وہ یک دم سنجیدہ ہوئی۔ "تم سے کس نے کہا ہے' مجھے اتنی رقم دو.....؟"

"تم نے خود مجھے لکھ کر دی تھی یہ رقم۔"

سالار نے اس بار مسکراتے ہوئے مانیٹر سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

"میں نے کب.....؟" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "وہ فگر تم اس لیے لکھوا رہے تھے.....؟" اسے یاد آ گیا۔

"ہاں۔" اس کی لاپروائی اب بھی برقرار تھی۔

"تم پاگل ہو۔" امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی۔

"شاید۔" سالار نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا' میں ایک ارب لکھ دیتی تو کیا کرتے؟" وہ اب طنز کر رہی تھی۔

"تو ایک ارب بھی دے دیتا۔" کیا فیاضی تھی۔

"کہاں سے دیتے.....؟ فراڈ کرتے؟" وہ بے ساختہ ناراض ہوئی۔

"کیوں کرتا.....؟..... کما کر دیتا۔" سالار نے اس کی بات کا برا مانا۔

"ساری عمر کماتے ہی رہتے پھر؟"

"اچھا ہوتا' ساری عمر تمہارا قرض دار رہتا۔ واقعی اچھا ہوتا' تو ایک ارب چاہیے کیا.....؟"

وہ تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ امامہ کو کئی سال پہلے والے سالار کی جھلک نظر آئی۔

"کیوں دے رہے ہو؟" اس نے سنجیدگی سے کچھ دیر اسے دیکھ کر کہا۔

"بیوی ہو تم' اس لیے۔"

"اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟"

"امامہ! میری سیونگز ہیں یہ۔" سالار نے بے حد تحمل سے کہا۔

"سیونگز ہیں تو مجھے کیوں دے رہے ہو؟" وہ کچھ خفا ہوئی۔

"میرا دل چاہتا ہے' میں تمہیں دوں۔ اگر یہ پوری دنیا میری ہوتی تو میں یہ ساری دنیا تمہیں دے دیتا۔ میں کما رہا

ہوں اور روپیہ آجائے گا میرے پاس۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔" کیا شاہانہ انداز تھا۔
"لیکن اتنی زیادہ رقم۔" سالار نے اس کی بات کاٹی۔
"میں اتنی زیادہ رقم نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تمہاری مرضی کا حق مہر دینا چاہتا تھا اس لیے تم سے ایک فگر لکھنے کو کہا۔ تمہیں پتا ہے، جو فگر تم نے لکھی تھی، اس دن میرے اکاؤنٹ میں ایگزیکٹ اتنی ہی اماؤنٹ تھی۔" وہ اب رقم دہراتے ہوئے ہنس رہا تھا۔
"اب اس کو تم کیا کہو گی اتفاق۔۔۔؟ مجھے اتفاق نہیں لگا، مجھے لگا وہ رقم میرے پاس تمہاری امانت تھی۔۔۔ یا حق تھا۔۔۔ اس لیے تمہیں دے رہا ہوں۔ تیس لاکھ دیا ہے، کچھ رقم کا ادھار کر لیا ہے تم سے۔۔۔ ورنہ اگلے دو تین ماہ ادھر ادھر سے مانگ رہا ہوتا۔ اس لیے تم آرام سے رکھو یہ پیسے، مجھے اگر کبھی ضرورت ہوئی تو تم سے مانگ لوں گا۔ اب میں تھوڑا سا کام کر لوں؟"
امامہ نے کچھ نہیں کہا تھا، وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر وہ ایک بار پھر اس پے سلپ کو دیکھنے لگی۔ وہ اس شخص کو کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔۔۔ وہ لاابالی نہیں تھا۔۔۔ کم از کم اتنے دن میں اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا۔۔۔ لیکن وہ سمجھ دار بھی نہیں تھا۔۔۔ کم از کم وہ پے سلپ اسے یہی بتا رہی تھی۔۔۔ وہ اگر اسے خوش کرنا چاہتا تھا۔۔۔ تو وہ نہیں ہوئی تھی۔۔۔ احسان مند دیکھنا چاہتا تھا تو ہاں، اس کے کندھے جھکنے لگے تھے۔۔۔ ایسی چاہ اس نے زندگی میں کسی اور شخص سے چاہی تھی۔۔۔ ایسی نوازشات کی طلب اسے کہیں اور سے تھی۔۔۔ اس کے وجود کو گیلی لکڑی وہ پیسہ نہیں بنا رہا تھا، بلکہ وہ فیاضی بنا رہی تھی جو وہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس سے برابری چاہ رہی تھی۔۔۔ برابر نہیں ہو پا رہی تھی۔۔۔ اس شخص کا قد لمبا نہیں ہو رہا تھا، بلکہ اس کا اپنا ہی وجود سکڑنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امامہ! ہم کل صبح کے بجائے، آج شام کو جا رہے ہیں۔ رات کراچی میں رکیں گے اور پھر کل رات کو ہی واپس آجائیں گے۔ سات بجے کی فلائٹ ہے۔ میں شام ساڑھے پانچ بجے تمہیں پک کروں گا، تم پیکنگ کر لو۔"
اس نے بارہ بجے کے قریب فون کر کے آفس سے کراچی کا نیا پروگرام بتایا تھا۔ وہ یک دم نروس ہونے لگی۔ اتنی جلدی پیکنگ، ٹھیک ہے وہ ایک رات کے لیے جا رہے تھے۔ پھر بھی۔۔۔ وہ اب اسے اپنے ان کپڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو وہ ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔ وہ پیکنگ کرتے ہوئے بے حد بولائی ہوئی تھی۔
وہ ساڑھے پانچ بجے وہاں موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے گاڑی میں روزہ افطار کر لیا ہو گا، لیکن پھر بھی وہ ایک باکس میں اس کے لیے کھانے کی چند چیزیں اور جوس لے کر آئی تھی۔ ایئرپورٹ تک کی ڈرائیو میں وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ وہ چیزیں بھی کھاتے رہے۔
وہ ساڑھے چھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچے، بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس سے سفر کر رہے تھے۔ اسی لیے ٹریفک کی وجہ سے کچھ لیٹ ہونے کے باوجود سالار مطمئن تھا۔
ایگزیکٹو لاؤنج سے جہاز میں سوار ہوتے ہوئے سالار کی فرسٹ کلاس کے کچھ اور پسنجرز سے سلام دعا ہوئی۔ چند ایک سے اس نے امامہ کا بھی تعارف کروایا۔ وہ سب کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتے تھے یا پھر سالار کے کسٹمرز تھے۔
جہاز کے ٹیک آف کے چند منٹوں کے بعد کسی دوسری کمپنی کا کوئی ایگزیکٹو، سالار سے کوئی معاملہ ڈسکس کرنے کے لیے اس کے پاس آیا۔ چند لمحے اس سے باتیں کرنے کے بعد سالار اس سے معذرت کر کے اس

ایگزیکٹو کے ساتھ اس کی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے انتظار میں بیٹھی رہی، پھر کچھ بور ہو کر اس نے ایک میگزین اٹھا لیا۔
سالار کی واپسی، لینڈنگ کے اعلان کے پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ "سوری" کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔
"تم بور تو نہیں ہوئیں؟"
"نہیں۔۔۔ مجھے تو بہت مزہ آرہا تھا۔" اس نے بے حد خفگی سے جواب دیا۔
اس نے میگزین سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ سالار نے بڑے آرام سے اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر پاس سے گزرتی ایئرہوسٹس کو تھما دیا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی۔
"یہ بدتمیزی ہے۔" امامہ نے اس کے جانے کے بعد کچھ دبی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔
"ہاں۔۔۔ ہے تو سہی، لیکن تم مجھے دیکھ نہیں رہی تھیں۔" اس نے اطمینان اور ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے خفا ہو یا ہنسے۔
"جتنی باتیں تم ان لوگوں سے کر رہے تھے، تم نے مجھ سے کبھی نہیں کیں۔"
وہ اس کے شکوے پر ہنسا۔ "بینک کے کسٹمرز ہیں۔ یہ ان باتوں کے پیسے دیتے ہیں۔"
اس نے کچھ ملامت بھری نظروں سے سالار کو دیکھا۔ "تم کتنے materialistic (مادہ پرست) ہو۔"
"ہاں، وہ تو ہوں۔" اس نے آرام سے جواب دیا۔
"میں بھی دے سکتی ہوں تمہیں پیسے۔" وہ اس کے جملے پر چونکا۔
"ارے، میں تو بھول ہی گیا تھا، فی الحال تو تم مجھ سے زیادہ امیر ہو۔ میرے بینک کی کسٹمر بھی ہو اور میں تمہارا قرض دار بھی ہوں، تو تم سے باتیں کرنا تو فرض ہے میرا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"بینکرز۔۔۔" وہ کچھ کہنے لگی تھی۔ سالار نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے روکا اور کہا۔
"میں اپنا ٹرپ خراب نہیں کرنا چاہتا امامہ۔۔۔! تم سے واپسی پر سنوں گا کہ بینکرز کیسے ہوتے ہیں۔" اس نے یک دم کچھ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس میں سنجیدہ ہونے والی کیا بات تھی، اس نے سوچا۔ ایئرپورٹ پر ہوٹل کی گاڑی نے انہیں پک کیا تھا۔
"میں نے سوچا تھا کہ ہم انیتا کے گھر پر ٹھہریں گے۔" امامہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
"میں کبھی انیتا کے گھر نہیں ٹھہرا، میں ہوٹل میں رہتا ہوں۔" سالار نے اسے بتایا۔ "کراچی اکثر آتا جاتا ہوں میں۔" وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ "بعض دفعہ تو یہاں آکر انیتا سے بات تک نہیں ہو پاتی۔"
امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ مسلسل سیل پر کچھ میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ ساتھ ساتھ اسے سڑک کے دونوں اطراف آنے والے علاقوں کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔
"پھر مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے۔۔۔"
سالار نے اس کے اچانک اس طرح کہنے پر اسے ٹوکا۔
"تمہیں ساتھ لے کر آنا مجھے اچھا لگ رہا ہے اور تمہیں انیتا کی فیملی سے ملوانے کے لیے یہاں لے کر تو آنا ہی تھا مجھے۔" امامہ نے اس کا چہرہ غور سے پڑھنے کی کوشش کی۔

"سچ کہہ رہا ہوں۔" اس نے امامہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟" سالار نے یک دم اس سے پوچھا' وہ مسکرا دی۔

"آپ اپنی وائف کے ساتھ پہلی بار یہاں ٹھہر رہے ہیں۔"

ہوٹل میں چیک ان کرتے ہوئے ریسپشن پر موجود لڑکے نے مسکراتے ہوئے سالار سے کہا۔

اس فائیو اسٹار ہوٹل کے چند کمرے مستقل طور پر سالار کے بینک نے بک کیے ہوئے تھے اور ان کمروں میں باقاعدگی سے ٹھہرنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا' لیکن آج وہ پہلی بار اس کی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

سالار نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور سائن کرنے لگا۔ وہ لڑکا اب امامہ سے کچھ خوشگوار جملوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کے گرد موجود ساری سلاخیں گرا رہا ہو۔ وہ باہر کی اس دنیا سے مسحور ہو رہی تھی' جس سے وہ سالار کی وجہ سے متعارف ہوئی تھی۔

بیچ لگژری پر انیتا اور اس کی فیملی نے ان کے لیے ڈنر ارینج کر رکھا تھا۔ وہ لوگ آدھے گھنٹے میں تیار ہونے کے بعد تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے وہاں پہنچے۔ انیتا اور اس کے شوہر کے علاوہ اس کے سسرال کے بھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ یہ سالار اور اس کے بیوی کے لیے ایک فیملی ڈنر تھا۔ اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا۔ اس کی گھبراہٹ ابتدائی چند منٹوں کے بعد ختم ہونا شروع ہو گئی۔ وہ کافی لبرل فیملی تھی اور ان دونوں کی شادی کے حوالے سے ہونے والی رسمی گفتگو کے بعد گفتگو کے موضوعات بدل گئے تھے۔ امامہ چیف گیسٹ تھی لیکن وہاں کسی نے اسے ٹیلی سکوپ کے نیچے نہیں رکھا تھا اور اس چیز نے امامہ کے اعتماد میں اضافہ کیا۔ کھانا ابھی سرو نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈرنکس لیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ امامہ گفتگو میں ایک مسکراتے ہوئے خاموش سامع کا رول ادا کر رہی تھی۔ اس کی زیادہ توجہ بیچ لگژری ویو کے گرد نظر آنے والے سمندر اور شہر کی روشنیوں پر تھی۔ وہ لوگ اوپن ایر میں تھے۔ کراچی میں لاہور جیسی سردی نہیں تھی لیکن یہاں اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ سالار نے آنے سے پہلے اسے گرم شال لینے کا نہ کہا ہوتا تو یقیناً" اس وقت اس کے دانت بج رہے ہوتے۔ وہاں موجود تمام خواتین سویٹرز کے بجائے اسی طرح کی شالیں اپنے کندھوں پر ڈالے ہوئے تھیں۔

"سالار! میں وہاں آگے جا کر نیچے سمندر دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے سالار کی طرف جھکتے ہوئے مدھم آواز میں سرگوشی کی۔

"تو جاؤ۔" سالار نے اطمینان سے کہا۔

"میں کیسے جاؤں...؟ اس طرح اکیلے... تم ساتھ آؤ میرے۔" اس نے اس کے مشورے پر جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں' تم خود جاؤ... دیکھو... اور بھی لوگ کھڑے ہیں' تم بھی جا کر دیکھ آؤ۔" سالار نے اس سے کہا۔ وہ اب اس کی گود میں پڑا بیگ اٹھا کر نیچے زمین پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اس لمبی ٹیبل کے گرد موجود افراد پر نظر ڈالی' وہ سب گفتگو میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کچھ ہمت پاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بائیں طرف بیٹھی انیتا اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"وہاں سے جا کر دیکھو' وہاں سے زیادہ اچھا ویو ہے۔" انیتا نے اشارے سے اسے گائیڈ کیا۔ امامہ نے سر ہلایا۔

وہاں اس وقت ان کے علاوہ اور بھی کچھ فیملیز موجود تھیں اور سالار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی وقتاً" فوقتاً" اٹھ کر اسی طرح اس عرشہ نما جگہ کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھنے لگتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نروس تھی لیکن پھر وہ نارمل ہونا شروع ہو گئی۔

سالار وہیں بیٹھا کولڈ ڈرنک پیتے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ امامہ نے دوبارہ پلٹ کر کچھ نروس ہو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں بار مسکرا دیا۔ یہ نو سال پہلے کی وہ پر اعتماد لڑکی نہیں تھی جو آدھی رات کو اپنے گھر کی دیوار کود کر اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ اس سے شادی کی تھی' پھر گھر سے چلی گئی تھی۔

وہ وسیم کی اس بہن کے بارے میں وسیم سے بہت کچھ سن چکا تھا لیکن پچھلے دس دنوں سے وہ جس لڑکی کو دیکھ رہا تھا' یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ وقت نے جتنی توڑ پھوڑ اس کی زندگی میں پیدا کی تھی اس سے زیادہ توڑ پھوڑ اس نے عرشے کی طرف جاتی ہوئی اس لڑکی کی زندگی میں پیدا کی تھی۔ اس کی انداز اطوار ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ نو سال اگر کسی شخص کو اس کے گھر والوں سے الگ کر دیا جائے خوف اور دباؤ کے ساتھ چند جگہوں تک محدود کر کے باقی دنیا سے کاٹ دیا جائے تو وہ کس حد تک کنفیوزڈ' ڈبل مائنڈڈ' غیر محفوظ اور ڈیپینڈنٹ ہو سکتا ہے۔ وہ اس کا عملی مظاہرہ امامہ کی اس حالت میں دیکھ رہا تھا اور یہ چیز اسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ وہ کم از کم اسے اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"سالار... سالار..." وہ انیتا کی آواز پر بے اختیار چونکا۔

اس نے پوری قوت سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

"یا تو اسے وہاں بھیجتے نہ' اب بھیج ہی دیا ہے تو دو چار منٹوں کے لیے کسی اور چیز کو بھی دیکھ لو۔" وہ اب اسے ڈانٹ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔ اس کا بہنوئی عفران اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

ہوا امامہ کے بالوں کو بکھیر رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار کانوں کے پیچھے کر کے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن انہیں کھلا چھوڑ کر آنے پر پچھتا بھی رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں وہ شیفون کے دوپٹے کو سر پر ٹکانے کی کوشش چھوڑ چکی تھی' ہاں وہ پشمینہ شال اس کی مہین شیفون کی قمیص کو اڑنے سے تو روک نہیں پا رہی تھی لیکن اس کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپے رکھنے میں موثر تھی۔ وہ کئی سالوں میں آج پہلی بار کسی پبلک پلیس پر سر ڈھانپے بغیر کھڑی تھی۔ اسے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ اگر وہ سالار کے ساتھ نہ ہوتی تو کبھی بھی ایسی حالت میں کسی کھلی جگہ پر کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دس دن پہلے تک تو وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنا چہرہ بھی چھپاتی تھی۔ وہ واحد گیٹ اپ تھا جس میں وہ خود کو بے حد محفوظ سمجھتی تھی۔ سالار سے شادی کے بعد اس نے چہرہ چھپانا چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔

تاریک سمندر میں نظر آتی روشنیوں کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر گردن کے گرد لپٹے دوپٹے کو سر پر لینے کی کوشش شروع کی۔ یہاں اس کوشش کو نوٹس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ کام اس ہوا میں شال' دوپٹے اور کھلے بالوں کے ساتھ آسان نہیں تھا۔

"میں بال سمیٹ دوں تمہارے؟" وہ جیسے کرنٹ کھا کر پلٹی پھر جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" اس نے سالار کو اپنے عقب میں دیکھ کر بے اختیار کہا۔ وہ کس وقت آیا تھا' اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"تم میرا دوپٹا پکڑو گے؟" اس نے سالار کی اوٹ میں آتے ہوئے اپنا دوپٹا اسے پکڑا دیا۔ وہ اب وہاں کھڑی دوسروں کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

"تمہیں مجھ کو بتانا چاہیے تھا کہ یہاں اتنی تیز ہوا ہو گی' میں بال تو کھلے چھوڑ کر نہ آتی۔" وہ اپنے بالوں کو ڈھیلے جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے اس سے شکایتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اب اپنی شال اتار کر اسے دیتے ہوئے' دوپٹا اس سے لے رہی تھی۔

"یہ کون سا کلر ہے؟" وہ دوپٹے کو اپنے سر اور گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے اس کے سوال پر ٹھٹکی۔

"کرمزن.... کیوں؟"

سالار نے شال اس کے کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا تھا تم اس کلر میں بہت اچھی لگتی ہو۔" اس نے اس کے بائیں گال کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے بہت آہستہ سے چھوا تھا۔

امامہ کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی۔ اگلے لمحے سالار کو یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اس کا لباس زیادہ قرمزی تھا یا اس کا چہرہ' وہ بے اختیار گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"اب تم اتنی سی بات پر بھی یوں بلش ہوا کرو گی تو معاملہ جان لیوا ہو جائے گا۔ مار دو گی تم بڑی جلدی ہی مجھے۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

وہ تقریباً" اڑھائی بجے واپس اپنے ہوٹل میں آئے تھے۔ امامہ کو اتنی نیند آرہی تھی کہ اس نے جیولری اتار دی چہرہ بھی دھو لیا لیکن کپڑے تبدیل کیے بغیر سو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سالار صبح کب آفس کے لیے نکلا' امامہ کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تقریباً" دس بجے اٹھی۔ جب تک وہ اپنا سامان پیک کر کے تیار ہوئی' تب تک انیتا اسے لینے کے لیے آچکی تھی۔

وہ لوگ تقریباً" ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے نکلے' اس کے بعد وہ انیتا کے ساتھ کراچی کے مختلف مالز میں گھومتی پھرتی رہی۔ انیتا نے اسے سالار کے دیے ہوئے کریڈٹ کارڈ کو استعمال کرنے ہی نہیں دیا۔ اس دن وہی اس کو شاپنگ کرواتی رہی۔

شاپنگ کے بعد انیتا اسے اپنے گھر لے گئی' اس نے وہاں افطار کیا۔ ساڑھے سات بجے وہ گھر سے ایرپورٹ کے لیے نکلی اور اسی وقت سالار سے اس کی فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی ایرپورٹ کی طرف جارہا تھا۔

وہ سالار کی نسبت جلدی ایرپورٹ پہنچی۔ بورڈنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایگزیکٹو لاؤنج میں پہنچتے ہی ایک بار پھر وہ کسی نہ کسی سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔ یہ وہ فلائٹ تھی جس سے وہ عام طور پر کراچی سے واپس آیا کرتا تھا اور اس کی طرح باقی لوگ بھی ریگولر ٹریولر تھے لیکن وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ اس نے سالار کی توجہ کسی اور طرف ہونے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

وہ خوش تھی' یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا اور سالار کو اس کی یہ خوشی حیران کر رہی تھی۔

"یہ تمہارا کریڈٹ کارڈ اور پیسے۔"

اس نے لاؤنج میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی اپنے بیگ سے دونوں چیزیں نکال کر سالار کو تھما دیں۔

"انیتا نے مجھے بل پے کرنے نہیں دیے۔ اسی نے سارے بلز دیے ہیں۔ تم اسے پے کر دینا۔" امامہ نے اسے بتایا۔

"کیوں....؟ کوئی بات نہیں اگر اس نے پے کیے ہیں.... اسے ہی کرنے چاہیے تھے۔"

سالار نے کریڈٹ کارڈ اپنے والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسے اس نے واپس امامہ کے بیگ میں ڈال دیے تھے۔

"لیکن ہم نے تو اسے یا اس کی فیملی کو کچھ بھی...."

سالار نے اس کی بات کاٹی۔ "تم نیکسٹ ٹائم آؤ گی تو لے آنا کچھ اس کے لیے.... دو چار ہفتے تک وہ ویسے بھی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو رہی ہے۔ تو تمہیں اچھا لگا کراچی آکر....؟" سالار نے موضوع بدلا۔

امامہ کا چہرہ ایک بار پھر چمکنے لگا.... وہ اسے ان جگہوں کے بارے میں بتا رہی تھی جہاں وہ انیتا کے ساتھ گئی تھی۔

سالار مسکراتے ہوئے اسے سنتا رہا۔ وہ بچوں جیسے جوش و خروش کے ساتھ اپنی شاپنگ کی تفصیل بتا رہی تھی۔

"میں نے ابو' آنٹی اور سعیدہ اماں کے لیے بھی کچھ گفٹس لیے ہیں۔" وہ بتا رہی تھی۔

"اچھا!" سالار نے دلچسپی لی لیکن گفٹس کی نوعیت نہیں پوچھی۔

"فرقان بھائی کی فیملی۔ اور تمہارے پیرنٹس کے لیے بھی۔"

"امامہ! صرف میرے پیرنٹس نہیں ہیں وہ' تمہارا بھی کوئی رشتہ ہے ان سے۔" سالار نے اعتراض کیا۔

وہ اب بھی اس کے ماں باپ کا ذکر اسی طرح کرتی تھی۔ اس وقت یک دم امامہ کو احساس ہوا کہ اس نے سالار کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔ یہ بھول تھی یا لاپروائی' لیکن اسے شاپنگ کے دوران سالار کا خیال تک نہیں آیا۔ اسے بے حد ندامت ہوئی۔

"کیا ہوا؟" سالار نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کچھ شرمندگی سے کہا۔

"سالار! مجھے تمہارے لیے کچھ خریدنا یاد نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں' تم نے اپنے لیے شاپنگ کی ہے تو سمجھو' تم نے میرے لیے ہی خریدا ہے۔" سالار نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا کندھا تھپک کر جیسے تسلی دی۔

"پھر بھی مجھے تمہارے لیے کچھ لینا چاہیے تھا۔" امامہ مطمئن نہیں ہوئی۔ "لیکن مجھے تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔"

اس کا محبوب ظالم تھا' وہ جانتا تھا۔ "کوئی بات نہیں' جب خیال نہیں آیا تو کیسا تحفہ....؟ تحفہ تو ان کو دیا جاتا ہے جن کا خیال آتا ہو۔" سالار کے لہجے میں گلہ نہیں تھا لیکن امامہ کو گلہ لگا۔ وہ نادم سی ہو کر خاموش بیٹھ گئی۔

"اور کیا کیا لیا؟" اس کی ندامت محسوس کرتے ہوئے سالار نے دوبارہ اس سے بات شروع کی۔

"مجھے انیتا اچھی لگی ہے۔" امامہ نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

"چلو اچھا ہے' کوئی تو اچھا لگا تمہیں۔ میں نہ سہی' میری بہن ہی سہی۔"

امامہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا سالار کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی' وہ سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

"اور پتا ہے میں نے کیا کیا لیا ہے؟" وہ پھر بولنے لگی۔

سالار بے اختیار مسکرایا۔ اگر اسے' اس سے اپنے لیے کسی اظہار کی توقع تھی' تو غلط تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن امامہ بہت اچھے موڈ میں رہی' اسے ہر بات پر کراچی یاد آجاتا۔ اس کی یہ خوشی سالار کو حیران کرتی رہی۔ اس کا خیال تھا اسے وہ شہر پسند آیا ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ بات شہر کی نہیں تھی' وہ اگر امامہ کو نواب شاہ بھی لے جاتا تو بھی وہ اسی ٹرانس میں واپس آتی۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو رہی تھی اور ایک لمبے عرصے کے بعد گھٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ جینے کے بعد کچھ دیر تک تو انسان ایسے ہی گہرے سانس لیتا ہے' جیسے وہ لے رہی تھی۔

اگلے دن وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ وہ سالار کے ساتھ خوش تھی' یہ بات اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی البتہ سعیدہ اماں نے پھر بھی کچھ احتیاطی تدابیر کے تحت سالار کو سامنے والوں کے لڑکے کی آمنہ کے لیے دیوانہ وار محبت کا ایک اور قصہ سنانا ضروری سمجھا' جسے سالار نے بے حد تحمل سے سنا۔ اس بار امامہ نے دوران گفتگو سعیدہ اماں کو ٹوکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی' سعیدہ اماں کا خیال تھا' سالار کو ایک اچھا' تابع دار شوہر

بنانے کے لیے اس طرح کے لیکچرز ضروری ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ماضی میں کسی عورت کے ساتھ وابستہ رہ چکا ہو' امامہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ سعیدہ اماں کو اپنے اور سالار کے تعلق کے بارے میں کیسے بتائے' اسے خدشہ تھا کہ اس انکشاف کے بعد سعیدہ اماں خود اسی سے ہی ناراض نہ ہو جائیں۔ اسے فی الحال اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اسلام آباد جانا ضروری ہے؟"

وہ جمعہ کی رات ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی' وہ جانا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ ایک عجیب سے خوف کا شکار بھی تھی۔

"بہت زیادہ ضروری ہے۔" سالار بیڈ پر بیٹھا اپنے لیپ ٹاپ پر ای میل چیک کرنے میں مصروف تھا۔

"تمہیں کیا کام ہے وہاں....؟" امامہ نے ہاتھ میں پکڑا ناول بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنی کے بل ٹیک لگائے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے' اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے گاؤں جانا ہے۔" وہ اسکرین پر نظریں جمائے اپنا کام کرتے ہوئے بولا۔

"کون سے گاؤں....؟" وہ چونکی۔

"اسلام آباد سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔" اس نے نام بتاتے ہوئے کہا۔ "میں وہاں ایک اسکول اور چند دوسرے پروجیکٹس چلا رہا ہوں۔ اسکول کی بلڈنگ میں کچھ ایکس ٹینشن ہو رہی ہے' اسی کو دیکھنے جانا ہے مجھے۔ جانا تو لاسٹ ویک تھا لیکن جا نہیں سکا۔"

وہ الجھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی طویل خاموشی اور خود پر جمی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے سالار نے اسے دیکھا۔ امامہ سے نظریں ملنے پر اس نے کہا۔

"تم ساتھ چلنا اور دیکھ لینا۔" وہ دوبارہ اسکرین کو دیکھنے لگا۔

"تم اکیلے چلے جاؤ۔" امامہ نے کہا۔

"میں تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔" اس نے اصرار کیا۔

"ویسے بھی پاپا نے کہا ہے آنے کے لیے... ہاں' اگر تم گاؤں نہیں جانا چاہتیں تو مت جاؤ لیکن اسلام آباد تو چلنا ہے تمہیں۔" سالار نے جیسے قطعی انداز میں کہا۔

امامہ نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کچھ خفگی کے عالم میں ناول کھول لیا۔

"کیا اسٹوری ہے اس ناول کی؟"

سالار کو اس کے بگڑتے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ امامہ نے جواب نہیں دیا۔

"ہیرو ہیروئن کے کپڑوں کی زیادہ تعریف کرتا ہے اس میں یا خوب صورتی کی؟" وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا۔

امامہ نے اسے نظر انداز کیا۔ یہ اتفاق تھا کہ جو صفحہ وہ پڑھ رہی تھی اس میں ہیرو' ہیروئن کی خوب صورتی ہی کی تعریف کر رہا تھا۔ امامہ کو ہنسی آگئی تھی۔ ناول سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے تاثرات دیکھے۔ سالار نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا' وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

☼ ☼ ☼

"خواتین و حضرات توجہ فرمائیے' ہم اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکے ہیں۔ اس وقت یہاں شام کے

سات بج رہے ہیں اور یہاں کا درجہ حرارت...."

جہاز کے کیبن عملہ میں سے کوئی انگلش کے بعد اب اردو میں رسمی الوداعی کلمات دہرا رہا تھا۔ جہاز ٹیکسی کرتے ہوئے ٹرمینل کے سامنے جا رہا تھا۔ بزنس کلاس کی ایک سیٹ پر بیٹھے سالار نے اپنا سیل فون آن کرتے ہوئے اپنی سیفٹی بیلٹ کھولی۔ امامہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے گم صم تھی۔

"کہاں گم ہو؟" اس نے امامہ کا کندھا تھپکا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اپنی سیفٹی بیلٹ کھولنے لگی۔ سالار اب لگیج کمپارٹمنٹ سے اپنے بیگز نکال رہا تھا۔ ایک فلائٹ اسٹیورڈ نے اس کی مدد کی۔ دونوں کے درمیان چند خوش گوار جملوں کا تبادلہ ہوا۔

وہ اس فلائٹ پر آنے والے ریگولر پیسنجرز میں سے ایک تھا اور فلائٹ کا عملہ اسے پہچانتا تھا۔

جہاز کی سیڑھیوں کی طرف جانے سے پہلے سالار نے مڑ کر اس سے کہا۔

"تمہیں کوئی کوٹ وغیرہ لے کر آنا چاہیے تھا' سویٹر میں سردی لگے گی تمہیں۔"

"یہ تمہارا ہی نہیں' میرا بھی شہر ہے۔ میں پیدا ہوئی ہوں یہاں' بیس سال گزارے ہیں میں نے یہاں۔ مجھے پتا ہے' کتنی سردی ہوتی ہے' یہ سویٹر کافی ہے۔" امامہ نے بڑے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

جہاز کی سیڑھیوں سے باہر آتے ہی سرد ہوا کے پہلے جھونکے نے ہی اسے احساس دلا دیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے دانت بجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سالار نے کچھ کہے بغیر اپنے بازو پر پڑی جیکٹ اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے بڑی فرماں برداری سے کچھ نادم ہو کر جیکٹ پہن لی۔ اسلام آباد بدل گیا تھا۔ اس نے خجل ہو کر سوچا۔

ارائیول لاؤنج کی ایگزٹ کی طرف بڑھتے ہوئے سالار چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

"ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گیا امامہ...." اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" وہ مسکرائی۔

"پاپا کو یہ پتا نہیں ہے کہ ہم آج اسلام آباد آرہے ہیں۔" امامہ کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

سالار نے اسے رکتے دیکھا تو وہ بھی رک گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سالار نے اپنے کندھے پر اس کے بیگ کی بیلٹ ٹھیک کی۔ شاید ٹائمنگ غلط ہو گئی' ٹیکسی میں بتانا زیادہ بہتر تھا اور اب اگر اس نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا تو.... وہ دل ہی دل میں فکر مند ہوا۔

وہ پلکیں جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسی طرح دیکھتا رہا۔ یہ ڈھٹائی تھی لیکن اب وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے بالآخر امامہ کی آنکھوں کی بے یقینی کو غصے میں بدلتے دیکھا' پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ وہ مسلسل دو ہفتوں سے اسے سکندر عثمان کے اسلام آباد بلانے کا کہہ رہا تھا۔ یہ سکندر عثمان کا بلاوا نہ ہوتا تو وہ صرف سالار کے کہنے پر تو کبھی وہاں نہ جاتی اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ سکندر عثمان کے نہ بلانے کے باوجود وہاں جانے کا کیا مطلب تھا' اس کا اندازہ وہ کر سکتی تھی اور اس وقت وہ بری طرح پریشان ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ لاؤنج سے باہر نکلنے سے ہی انکار کر دے۔ اسے سالار پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"سوری!" سالار نے اطمینان سے کہا۔

وہ چند لمحے مزید اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ارد گرد دیکھا' پھر سالار نے اسے جیکٹ اتارتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہاں کھڑی بے بسی کے عالم میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کر سکتی ہے۔ اس نے جیکٹ اتار کر تقریباً" پھینکنے والے انداز میں سالار کو دی۔

”تھینک یو۔“ سالار نے جیکٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔
اس نے شکر ادا کیا کہ جیکٹ اس نے اس کے منہ پر نہیں دے ماری۔ وہ اب بے حد غصے میں ایگزٹ ڈور کی طرف جارہی تھی۔ سالار کو حیرت ہوئی اس نے اس سے اپنا بیگ کیوں نہیں لیا تھا۔ اصولی طور پر یہ اس کا دوسرا رد عمل ہونا چاہیے تھا۔
”میرا بیگ دو۔“ ایگزٹ ڈور سے نکلنے سے پہلے ہی امامہ نے پلٹ کر تقریباً ”غراتے ہوئے“ اس سے کہا تھا۔
سالار نے آرام سے بیگ اسے پکڑا دیا۔
ٹیکسی میں بیٹھنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ پورا راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی' سالار نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے مخاطب نہ کرنا مناسب تھا۔ وہ اب گھر پر سکندر عثمان اور طیبہ کے رد عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگلی بجلی ان پر گرنے والی تھی۔
گاڑی ان کے گھر کی بائی روڈ کا موڑ مڑ رہی تھی۔ امامہ کو اپنا پورا جسم سرد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ سردی نہیں تھی' یہ خوف بھی نہیں تھا' یہ کچھ اور تھا۔ وہ نو سال کے بعد اپنے گھر کو' اس سڑک کو اور اس موڑ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے' آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ سالار سے ساری ناراضی' سارا غصہ جیسے دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ خوشی تھی' کیا تھا جو وہ گاڑی کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھ کر محسوس کر رہی تھی۔
اس کے گھر کا گیٹ سالار کے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہ صرف یہ اندازہ کر پائی تھی کہ گیٹ بند تھا' گھر کی بیرونی لائٹس آن تھیں۔
گاڑی کے ہارن پر گارڈ نے باہر دیکھا پھر اس نے گارڈ روم سے باہر نکل کر گیٹ کھول دیا۔ سالار تب تک اس کے ساتھ گاڑی سے نکل کر ڈگی سے بیگز نکال رہا تھا۔ امامہ نے اس بار اپنا بیگ خود تھامنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔
گارڈ نے سامان لینے کی کوشش نہیں کی۔ سالار اپنا سامان خود اٹھانے کا عادی تھا لیکن اس نے سالار کے ساتھ آنے والی اس لڑکی کو بڑی حیرت اور دلچسپی سے دیکھا تھا' جو گیٹ سے گھر کے اندر آنے تک ان ہمسایوں کے گھر کو دیوانہ وار دیکھتی آرہی تھی جن کے ساتھ سکندر عثمان کا میل ملاپ بند تھا۔
دھند کے باوجود امامہ نے گھر کی بالائی منزل کے کچھ بیڈ رومز کی کھڑکیوں سے آتی روشنی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے اپنے بیڈ روم میں بھی روشنی تھی۔ اب وہاں کوئی اور رہتا ہو گا... وسیم... یا سعد... یا اس کا کوئی بھتیجا یا بھتیجی... اس نے آنکھوں میں امڈتے سیلاب کو صاف کرتے ہوئے ان کھڑکیوں میں جیسے کسی سائے' کسی ہیولے کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔
”اندر چلیں...؟“ اس نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کی نرم گرفت محسوس کی۔ امامہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے سر ہلایا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہے لیکن اس نے اسے رونے سے روکا نہیں تھا' اس نے بس اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔
سکندر عثمان اس وقت لاؤنج میں فون پر کسی دوست کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے طیبہ کا انتظار کر رہے تھے جو اپنے بیڈ روم میں کوئی چیز لینے کے لیے گئی تھیں۔ اگر سکندر کو آفس سے آنے میں دیر نہ ہو گئی ہوتی تو' وہ دونوں اس وقت کسی افطار ڈنر میں جا چکے ہوتے۔
لاؤنج میں سالار اور امامہ کا سامنا سب سے پہلے انہیں سے ہوا تھا۔ کسی بھوت کو دیکھ کر سکندر عثمان کا وہ حال نہ ہوتا' جو اس وقت ان دونوں کو دیکھ کر ان کا ہوا تھا۔ وہ فون پر بات کرنا بھول گئے تھے۔
”جبار! میں بعد میں فون کرتا ہوں تمہیں۔“ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنے دوست سے کہا اور سیل بند

کر دیا۔ غصہ بے حد معمولی لفظ تھا جو انہوں نے اس وقت سالار کے لیے محسوس کیا۔ وہ لاہور میں اس الو کے پٹھے کو نہ صرف اسلام آباد امامہ کے ساتھ نہ آنے کی تاکید کر کے آئے تھے' بلکہ پچھلے کئی دن سے مسلسل فون پر ہر بار بات کرنے کے دوران یہ بات دہرانا نہیں بھولے اور وہ ہر بار فرماں برداری سے ”او کے“ کہتا رہا۔ نہ یہ فرماں برداری ان سے ہضم ہوئی تھی' نہ اتنا سیدھا او کے۔ ان کی چھٹی حس اس کے بارے میں سگنل دے رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں میں بہت بدل گیا تھا' بے حد فرماں بردار ہو گیا تھا۔ ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا' بہت کم ان کی کسی بات سے اختلاف کرتا یا اعتراض کرتا لیکن وہ ”سالار سکندر“ تھا' ان کی وہ ”چوتھی اولاد“ جس کے بارے میں وہ سوتے میں بھی محتاط رہتے تھے۔
صرف سالار ہی نے نہیں' بلکہ امامہ نے بھی سکندر عثمان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دور ہی سے بھانپ لیا تھا۔
”ڈونٹ وری... پاپا مجھے کچھ ذلیل کریں گے لیکن تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ دور سے اپنی طرف آتے' سکندر کی طرف جاتے ہوئے' وہ خود سے چند قدم پیچھے چلتی امامہ کی طرف دیکھے بغیر بے حد مدھم آواز میں بڑبڑایا تھا۔
امامہ نے سر اٹھا کر اپنے ”شوہر“ کا ”اطمینان“ دیکھا' پھر تقریباً ”دس میٹر کے فاصلے پر آتے اپنے ”سسر“ کا ”انداز۔“ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر زیادہ خوف زدہ ہوئی تھی کہ سکندر عثمان' سالار کی انسلٹ کرنے والے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مسئلہ یوں تو قدرے ٹیڑھا تھا مگر دھیان اور پیار کی نظر سے سمجھا جاتا تو سلجھنے کو سمجھو تیار ہی تھا۔ عذرا جب سے لڑکی دیکھ کر لوٹی تھیں، چھوٹی سی الجھن پکڑے، اپنی ہی سوچ کی انگلی مار مار کر وہم کے دھاگے کا ڈھیر لگائے بیٹھی تھیں۔ بچے تو خیر ہونے والی ماہی میں ابھی اس قدر "انٹرسٹڈ" نہ تھے۔ فرہاد کو البتہ اپنی سترہ برس کی گہری سہیلی جیسی بیوی کے چہرے نے ہی بہت کچھ بجھا دیا تھا۔

"کیا بات ہے یار! خیریت تو ہے نا؟" تنہائی میسر آتے ہی انہوں نے بیگم کی نبض پہ گویا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے فرہاد! جیسے امی جی نے احتشام کی منگنی میں کچھ زیادہ ہی جلد بازی کر دی ہے۔ کیا تھا جو وہ ہمارے حج سے واپس آنے کا انتظار ہی کر لیتیں۔"

سرہانے رکھی "آب گم" کے صفحات بلاوجہ آگے پیچھے کرتے ہوئے ان کے لہجے میں کچھ تاسف سا در آیا تھا۔

"کیوں بھئی کیا ہوا۔ آپ کو لڑکی پسند نہیں آئی یا اس کے گھر والے۔" فرہاد نے بھی اپنے ہاتھ میں پکڑی "یادوں کی بارات" کو سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں خیر! لڑکی تو ماشاء اللہ بے حد خوب صورت ہے اور گھر، خاندان بھی۔۔۔"

اب کے ان کے لفظوں میں نرمی تھی۔ "تو پھر مسئلہ کیا ہے جناب من!" شریک حیات کو ان کی الجھن نے بے سکون کر دیا ہے۔ عذرا کو یہ محسوس کر کے گونہ سکون ملا تھا۔ وہ مسکرائیں۔

"اچھا تو اب سمجھا۔ دراصل ہمارے پیارے سالے صاحب کی سب سے بڑی آپا جی کو اپنے اکلوتے بھائی کی منگنی میں شرکت نہ کر سکنے پر کوئی انا و خودداری کو ٹھیس، عزت و وقار کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔" فرہاد کا لہجہ شرارتی تھا۔

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کبھی رشتوں میں انا اور خودداری کو نہیں ملایا ورنہ تو۔۔۔" عذرا نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔ فرہاد ان کی بات پھر بھی سمجھ ہی گئے تھے۔

اب وہ دھیرے دھیرے انہیں ساری بات بتا رہی تھیں اور وہ بغور سن بھی رہے تھے۔

عذرا اپنے میاں کے ساتھ دو برس سعودی عرب گزار کر لوٹی تھیں۔ اسی دوران احتشام کے رشتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ اسکائپ پہ تو روز ہی اماں سے بات کرتیں۔ چھوٹی تینوں بہنیں بھی انہیں آنے والے رشتوں کے کوائف "تفصیلاً" بتاتیں۔ جن پہ سنجیدگی سے بحث ہوتی اور یوں ایک بہت ضروری فرض محض فضول سے اعتراضات و خدشات میں تعطل کا شکار ہونے لگا۔

کبھی کبھی تو فرہاد کو احتشام کے صبر پہ ترس آنے لگتا، اور وہ عذرا کو سمجھاتے۔

"بیگم صاحبہ! کچھ اللہ پر بھی چھوڑ دیا کرتے ہیں، وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ آپ تو سارے کا سارا وزن خود ہی اٹھانے میں خوامخواہ ہلکان ہوتی ہیں۔"

"آپ نہیں جانتے ہیں بہو گھر میں لانا کیسی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ارے بابا! اپنا گھر خاندان ہی کیا۔ اگلی ساری آنے والی نسل اسی کے اوپر ہوتی ہے، اچھی طرح چھان پھٹک نہ کی تو عمروں اور نسلوں کا روگ لگ جاتا ہے اور میری امی جی نے تو پھر ایک ہی بھولانی ہے کون سا تین چار بیٹے ہیں کہ چلو کسی نہ کسی کی تو اچھی نکل ہی آئے گی۔"

عذرا کے پاس ہمیشہ تفصیلی وضاحت ہوتی تھی۔

سعودیہ سے واپسی کے دنوں میں ہی انہیں اللہ نے حج کی سعادت کا موقع دیا اور ادھر حالات کچھ یوں ہوئے کہ احتشام کی منگنی ان کی غیر موجودگی میں ہو گئی۔ امی ابو نے خود ہی استخارہ کیا تھا اور مثبت جواب کے بعد ہی فیصلہ ہوا۔ اس کے بعد تو عذرا کو بھی کسی قسم کا اعتراض نہ رہا تھا۔ انہوں نے امی ابو اور احتشام کو فون پر بہت ساری مبارک باد دی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد آج وہ پہلی بار ثنا سے مل کر آئی تھیں اور اپنے ساتھ واپسی پر اس الجھن کو بھی ساتھ لے آئی تھیں۔

چار بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر والی ثنا نے پچھلے برس ہی انٹر کیا تھا۔ اس سے بڑے بھائی فوج میں۔ بڑی بہن تو۔۔۔ میٹرک کے بعد ہی اپنے گھر سدھار چکی تھی۔ چھوٹا بھائی غالباً "مڈل میں تھا۔ محکمہ انہار میں ار ی گیشن آفیسر ثنا کے ابا کو کچھ عرصہ سے ہیپاٹائٹس سی کا مسئلہ تھا۔ جب ہی وہ جلد از جلد اپنے فرائض پورے کرنے میں لگے تھے۔

"مگر اس سارے بیک گراؤنڈ میں "مسئلہ" نامی کوئی چیز مجھے تو نظر نہیں آئی بھئی۔" فرہاد کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو عذرا کو ٹوک ہی دیا۔

"فرہاد پلیز! آپ میری پوری بات تو سن لیں نا۔" وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ میرے دادا، دادی علیگ تھے اور میری امی جی نے اس وقت اپنا ایم اے مکمل کیا تھا، جب میں اور بشریٰ اسکول بھی جانے لگ گئی تھیں۔ علم سے محبت اور کتاب دوستی ہمارے خون میں رچی بسی ہے۔ ماہنامہ حور اور "زیب النسا" کے زمانے کے رسالے تو ہمارے گھر باقاعدگی سے آتے رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے "پھول" سے لے کر آج تک کے سارے بچوں کے رسالے۔ یہاں باقاعدگی سے لائے اور پڑھے جاتے ہیں اور وہ دادا جی کی ذاتی لائبریری جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ آپ تو خود اس کی بہت ساری پڑھ چکے ہیں۔" عذرا نے فرہاد کا کندھا ہلایا۔

"میرا خیال ہے کہ اب میں سو ہی جاؤں تو بہتر ہے۔"

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجلاہٹ
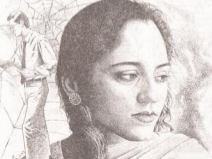
ہونے لگی تھی۔ سو وہ رخ موڑ کر لیٹ گئے۔
"پلیز فرہاد! آپ سن تو لیں۔"
میاں کا بے زاری والا لہجہ انہیں برا لگا تھا۔ سو وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ کا ذرا سا دباؤ دے کر پھر سے اپنی جانب متوجہ کرنے لگیں۔
"یار! اتنی دیر سے میں تمہیں سن ہی تو رہا ہوں اور یہ ساری باتیں تو میں اپنی شادی سے بھی پہلے سے جانتا ہوں' پھر اس وقت یہ سب دہرانے کا مقصد؟ اچھا خاصا پڑھ رہا تھا اور تم نے اپنی بات شروع کر دی۔ پتا بھی ہے تمہیں کہ جب تک رات کو میں چند صفحے کسی اچھی کتاب کے نہ پڑھ لوں ۔ سو نہیں سکتا۔"
فرہاد نے مزید اپنے منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے عذرا کی طرف کروٹ لے لی تھی۔
"دیکھا۔ بس یہی بات ہے، جو میں اتنی دیر سے آپ کو سمجھانے میں لگی ہوں۔"
عذرا کے چہرے پہ وہ فاتحانہ مسکراہٹ آگئی جو اپنا کوئی بڑا مسئلہ اچانک حل ہو جانے پہ بے اختیار آجاتی ہے۔
"کیا مطلب؟" فرہاد کو اب عذرا کی بات میں کچھ دل چسپی ہوئی۔
"میں نے ثنا سے پوچھا' تمہارا پسندیدہ مصنف کون ہے' شاعری کس کی زیادہ شوق سے پڑھتی ہو تو اس نے پتا ہے کیا کہا؟" عذرا نے بچوں کی طرح انہیں جواب دینے پر اکسایا تھا۔
"اُفوہ بابا اب بتا بھی دو نا۔" فرہاد پھر جھنجلانے لگے۔
"کہنے لگی' میں کتابیں نہیں پڑھتی ہوں۔ اتنا ہی کہتی تو خیر تھی۔ وہ تو بڑے مزے سے یہ بھی کہنے لگی کہ اتنی مشکل سے تو نصاب کی کتابوں سے جان چھوٹی ہے اور پھر سے کتابیں' اوئی اللہ! مجھے تو اگر کبھی سزا دینی ہو نا کسی نے تو بس کوئی کتاب دے کر بٹھا دو مجھے۔ یہی نہیں میں تو یہ رسالے' ڈائجسٹ وغیرہ بھی بس کبھی کبھار ہی پڑھتی ہوں۔ وہ بھی اپنے ابو جی سے چھپ چھپا کر اور پھر ہی ہی کر کے دانت نکالنے لگی۔" فرہاد نے کوئی جواب نہ دیا۔
"فرہاد! آپ تو سچ مچ سو گئے ہیں۔" عذرا نے آنکھیں بند کر کے بڑے سکون سے لیٹے ہوئے فرہاد کا کندھا پھر سے ہلایا۔
"جی جناب! میں بالکل سو چکا ہوں' کافی گہری نیند ہے۔ خبردار! جو کسی نے ہمیں دوبارہ جگایا۔"
فرہاد نے اسی طرح بند آنکھوں سے لیٹے لیٹے ہی شہادت کی انگلی اٹھا کر عذرا کو ذرا بھاری سی آواز میں تنبیہہ کی تھی۔
ان کا لہجہ ایسا تھا کہ عذرا کو بھی ان کی تھکن کا اندازہ کر کے ہنسی آگئی اور وہ۔۔۔ "جو حکم بادشاہ سلامت۔" کہتے ہوئے خود بھی وہاں سے اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز اتوار تھا اور حسب معمول وہ لوگ بچوں کے ساتھ جوائے لینڈ آئے ہوئے تھے۔ بچے جھولوں پر تھے اور وہ دونوں ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔ عذرا کا پسندیدہ قلفہ بہت تیزی سے پگھل رہا تھا' تب ہی فرہاد نے پلیٹ میں سے ایک بڑا چمچہ خود اٹھا لیا اور ان کے ذرا نزدیک ہو کر کہا۔
"تم ایسا کرو ایک بار پھر لڑکی والوں کے گھر جاؤ اور بغور اس کا جائزہ لو۔"
"فی الحال تو میں اس بات کا جائزہ لے رہی ہوں کہ آپ نے میرا قلفہ چرانے کی کامیاب کوشش کر ڈالی ہے اور اب یہ کیس ذرا۔"
عذرا نے فرہاد کے سامنے رکھی ان کی پلیٹ اٹھا کر اس میں موجود سارے کا سارا قلفہ اپنی پلیٹ میں ڈال لیا تھا۔ فرہاد کی ایک ذرا سی شرارت نے عذرا کی ساری پریشانی اڑن چھو کر دی تھی۔ اب وہ بڑی رغبت سے قلفہ کھانے میں مگن تھیں۔
"ویسے آپس کی بات ہے یار! آج تم پرسوں سے زیادہ حسین لگ رہی ہو۔" فرہاد نے ہاتھ بڑھا کر عذرا کے سامنے رکھی پلیٹ کو تھوڑا سا اپنی طرف کھسکایا اور پھر اپنے چمچے سے اسی پلیٹ میں سے کھانے لگے تھے۔

"اچھا کل سے زیادہ کیوں نہیں۔" فرہاد کی "حرکت" پر ایک ہلکی سی گھوری ڈال کر عذرا نے ان سے پوچھا تھا۔
"وہ کل تم کو میں غور سے دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ میری عینک خراب تھی نا۔"
فرہاد نے معصومانہ جواز پیش کیا' جس پر عذرا کی بے ساختہ ہنسی نے ساتھ والی دوسری ٹیبل تک سفر کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بری کے زیورات اور کپڑوں کے سلسلے میں مشورے کے لیے امی نے عذرا اور فرہاد کو گھر بلایا ہوا تھا۔ بلایا تو چاروں بہنوں کو ہی تھا۔ مگر سمیعہ کی ساس کی طبیعت کچھ خراب تھی' سو اس نے معذرت کر لی۔ ہاں ثانیہ اور بشریٰ اپنے شوہروں سمیت موجود تھیں۔ تینوں بہنوں نے مل جل کر کھانے کا بالکل دعوت سا انتظام بھی کر ڈالا۔ امی ابو کے چہروں پر بہت ہی سکون بھری مسکراہٹیں اتری ہوئی تھیں۔
"عذرا بیٹا! میرا قہوہ وہاں اسٹڈی میں ہی لے آنا۔"
ابو جی کھانے کے بعد فوراً" ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بشریٰ اور سمیعہ مل کر برتن وغیرہ دھونے لگیں اور تینوں داماد صاحبان ٹی وی کے آگے جم گئے۔ سب کو سبز قہوہ دے کر عذرا اپنا اور ابا جی کا کپ لیے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئیں۔
"اُف اللہ ابو جی! کتنی مٹی ہے شیشوں پر۔" عذرا انہیں قہوہ دے کر بچوں سے اشتیاق کے ساتھ کتابوں کی الماریوں کی طرف بڑھی تھیں۔
"بس بیٹا! تمہاری امی جان میں اب اتنی ہمت ہی نہیں کہ وہ یہ سب کچھ دیکھ سکیں۔ نوکرانی بھی اپنی مرضی سے ہی صفائی کرتی ہے۔ بس۔"
"نہیں ابو جی! یہ تو غلط بات ہے۔ آپ خود کھڑے ہو کر اس سے کام کروائیں۔"
اپنی عزیز ترین کتابوں کا یہ حشر دیکھ کر عذرا کو واقعی بہت دکھ ہوا تھا۔ شادی سے پہلے وہ خود اس حصے کی دیکھ بھال میں ہر وقت لگی رہتی تھیں بلکہ صرف وہی نہیں' وہ چاروں بہنیں اور خود امی بھی۔
کتاب سے پیار کریں۔
کتاب کی عزت کریں۔
جیسے "اشتہار" نما کاغذات اپنے ہاتھ سے موٹے مارکر سے لکھ کر مختلف جگہوں پر گھر میں لگا رکھتے تھے' جنہیں پڑھ کر ابا جی تو اکثر ہنس پڑتے تھے۔
"تم لوگوں نے تو گھر کو پبلک لائبریری بنا دیا ہے۔" وہ اکثر کہتے۔
"اچھا تم یہ سب چھوڑو اور ادھر آؤ ذرا۔" عذرا جو خود ہی کپڑا لے کر گرد صاف کرنے لگ گئی تھیں' ابا جی نے آواز دے کر انہیں بلایا۔ انہوں نے ممتاز مفتی کی "تلاش" ان کے سامنے رکھ دی۔
"شکریہ ابو جی!" عذرا نے فوراً" ہی ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھا لی۔
"ویسے ایک بات تو بتائیں ابو جی! اگر آپ کی آنے والی بہو آپ کی اس روایت کو سنبھال کر چلنے والی خوبی سے محروم ہوئی تو پھر۔۔۔؟"
عذرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کیا تھا۔
وہ ان کی بات سن کر مسکرا دیے تھے۔ بالکل یوں جیسے بڑے کسی نادان بچے کی بات سن کر مسکراتے ہیں۔
"بیٹا جی! یہ جو خوبیاں ہوتی ہیں نا' بالکل خوشبو جیسی ہوتی ہیں۔ ہر خوبی سے وابستہ ایک خوشبو' تو اگر ہماری بہو میں یہ خوبی نہ ہوئی تو کیا پتا اس کی ذات میں کوئی ایسی خوشبو ہو۔"
انہوں نے آنکھ کے اشارے سے پہلے عذرا کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اور پھر اپنے سامنے رکھے قہوے کے مگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔
"یعنی کہ بہت اچھا کھانا پکانا جانتی ہو تو چلے گا۔ ہے نا؟"
عذرا نے اپنا قہوے کا کپ خالی کر کے میز پہ واپس رکھتے ہوئے کہا۔
"ارے بابا! سرپٹ دوڑے گا' تم دیکھنا ان شاء

اللہ۔"

ابا جی نے بہت پیار سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تھا' اور وہ دونوں باپ بیٹی ہنس دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

شادی والے دن تو اس جوڑی کی شان ہی نرالی تھی۔ دیکھنے والے باربار تعریفی جملے کہتے اور عذرا دل ہی دل میں ماشاء اللہ کا ورد کیے جاتی تھیں۔

"یا اللہ! یہ لڑکی میرے ماں باپ کے گھر میں بہترین انعام بن کر داخل ہو۔ ہمارے گھر' ہماری نسل اور ہمارے خاندان کے حق میں خیر بن کر آئے۔ جتنی خوب صورتی تو نے اسے دی ہے' اس کی سیرت و اخلاق کو اس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت بنا دے۔ میرا ہر خوف' ہر خدشہ اپنی رحمت کے صدقے دور کردے۔ میرے مولا' یارحیم یا کریم!"

شادی کی رات نماز کے بعد یہ دعا بار بار ان کے لبوں سے نکل کر اپنے خالق کے حضور پیش ہوتی تھی۔

فرہاد نے انہیں مڑ کر ایک بار دیکھا اور چپکے سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ عبد اور معبود کے درمیان مجازکی فی الحال جگہ نہ تھی۔

آج سے سترہ برس قبل جب عذرا بیاہ کر تحصیل جلال پور جٹاں کے گاؤں مونگا والا آئیں تو حالات مختلف تھے۔ فرہاد کے گھر اور عذرا کے خیالات میں مشرق مغرب والا فرق تھا۔ مسئلہ کام کاج کا تھا اور نہ ہی پہننے اوڑھنے کا۔ فارغ وقت میں جب عذرا کی دونوں جٹھانیاں' چھوٹی نند اور ساس فیملی گوسپ میں مصروف ہوتیں یا پھر کڑھائی سلائی میں تو عذرا اپنی عزیز ترین شے یعنی کتاب لے کر بیٹھ جاتیں اور پھر یہی بے ضرر معصوم مشغلہ' آہستہ آہستہ بڑا مسئلہ بننے لگا۔

سچ تو یہ تھا کہ عذرا کی ماں کی تربیت کچھ ایسی تھی کہ کبھی ہنڈیا جلی اور نہ ہی کبھی فرہاد کے جوتے کپڑے ڈھونڈنے میں مشکل ہوئی۔ وہ ہر کام وقت پر اور بہترین انداز میں کرتی تھیں ہاں مگر.....

"آپ کی یہ آٹھ دس پڑھی ہوئی جاہل عورتیں کیا جانیں کتاب کی قدر اور اسے پڑھنے کا مزا۔"

وہ یہ بات فرہاد سے اکثر کہہ دیا کرتی تھیں۔

"تمہارا مطلب کیا ہے بھلا یہ بات کرنے کا۔" آخر ایک رات فرہاد کو غصہ آہی گیا تھا۔

"ہاں تو اور کیا۔ جب میں آپ کی ماں بہنوں کے سامنے اشفاق احمد' ممتاز مفتی' مستنصر حسین تارڑ اور مشتاق احمد یوسفی کا نام کبھی لے لوں تو وہ سب مجھے ایسے دیکھتی ہیں جیسے میں نے کسی..." عذرا کی بے ساختہ ہنسی ایک مذاق اڑاتے قہقہے میں بدل جاتی تھی۔

"میں نے کسی نامحرم کا نام لے لیا ہو۔ اف اللہ اتنی جہالت۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا عذرا بیگم! آپ کو ان سب کی تحریریں جتنی مرضی پسند ہوں —— یہ بات تو سچ ہی ہے نا کہ شرعی طور پر وہ سب آپ کے نامحرم ہی ہیں۔"

فرہاد کے کڑے جواب نے عذرا کو چپ ہی کروا دیا تھا۔ وہ دم بخود تھیں۔

بہرحال اقبال بیگم ایک سمجھ دار خاتون تھیں۔ اپنے بہت پڑھے لکھے بیٹے کے لیے عذرا جیسی اعلا تعلیم یافتہ خاتون کو بیوی بنا کر انہوں نے پوری برادری میں واہ واہ سمیٹی تھی۔ اب اس واہ واہ کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بہو کو اس کی مرضی کا ماحول دیا جائے۔ فرہاد کو انہوں نے بڑی آسانی سے شہر میں الگ گھر خرید دیا اور پھر دو سال بعد ہی وہ بیوی بچوں سمیت سعودی عرب جا بسے۔ صرف وہی نہیں' عذرا کے سب ہی سسرال والے بہت کم ہی ان کے ہاں آیا کرتے۔ اجنبیت کی نامحسوس سی ایک دیوار کھنچی تھی' جسے عذرا ہمیشہ اپنا فخر اور مان سمجھتی آئی تھیں۔

احتشام کے ولیمے کے ٹھیک تیسرے دن ہی فرہاد ایک ماہ کی ٹریننگ پر اسلام آباد چلے گئے۔ عذرا کے تو کام کئی گنا بڑھ گئے۔ دونوں بچوں کو اسکول اور کالج لانے اور چھوڑنے کی ڈیوٹی اور پھر شام کو ٹیوشن کے لیے اکیڈمی لانا' لے جانا۔ وہ تو امی ابو کی طرف جانے سے بھی رہ گئیں۔ بس فون پر ہی تھوڑی بہت بات ہوتی تھی۔

آخر ایک اتوار وہ بغیر بتائے ہی میکے پہنچ گئیں۔ جہاں ان کی حیرت کے بڑے خوب صورت سامان میسر تھے۔

ساگوان کی بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر بچھا بہت خوب صورت کروشیے سے بنا میز پوش۔ امی ابو کے کمرے کی دونوں تپائیاں بھی کروشیے کے کور والی میرون چھوٹی گدیوں سے ڈھک دی گئی تھیں۔ ہر طرف صفائی ستھرائی' سلیقے کی چمک اور ان سب سے بڑھ کر امی ابو کے چہروں سے چھلکتا گہرا اطمینان اور احتشام کا خوشی سے دمکتا چہرہ۔ انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہو چلا تھا۔

ابو جی اپنی لائبریری میں کسی بادشاہ کی طرح بیٹھے تھے۔

"آؤ تمہیں کچھ دکھاؤں۔"

چہرے پر بچوں سی خوشی اور دبا دبا جوش لیے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک لماری کی طرف بڑھے۔ جس کے پٹ کھلنے پر ایک اور سرپرائز عذرا کا منتظر تھا۔

صحیح بخاری اور ترمذی شریف کا مکمل سیٹ' بے حد خوب صورت' کروشیے سے بنے بک کور میں ملفوف' تفسیر القرآن کی تمام جلدیں الگ الگ' مگر ایک ہی انداز کے کور میں ملفوف سب سے اوپر کے خانے میں رکھی تھیں۔

ابو جی کی اتنی عزیز کتابوں کو اتنا پیارا انداز دینے والی اس لڑکی پر عذرا کو بے ساختہ ہی بہت سا پیار آگیا تھا۔ انہوں نے شرمگیں مسکراہٹ والی ثنا کو گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا۔

بہت ہی مزے دار اور پرتکلف کھانے کے بعد جب ثنا سب کے لیے قہوہ بنانے چلی گئی تو امی ابو اور احتشام کے منہ سے اس کی تعریفوں کا جو سلسلہ شروع ہوا' وہ اس کے آنے پر ہی تھما۔ عذرا کے دل کی خوشی' دھیرے دھیرے کہیں غائب ہونے لگی تھی۔ اس کی جگہ ایک بے نام اداسی اترنے لگی تھی۔

"یہ لیں آپی! میں نے شادی سے پہلے ہی بنا کر رکھی تھی صرف اور صرف آپ کے لیے۔"

گھر واپسی سے پہلے ثنا نے کروشیے سے بنی ایک پیاری سی چادر انہیں بطور تحفہ دی تھی۔

آنے والے دو دن وہ بہت کچھ سوچتی رہی تھیں اس لڑکی کے بارے میں' جسے اس گھر میں آئے ابھی چند دن ہوئے تھے۔ مگر سب لوگ اس کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اتنی تعریف جو ان سترہ سالوں میں بھی ان کے سسرال کے کسی ایک فرد نے بھی ان کی نہیں کی تھی۔ انہیں لگا' زندگی میں پہلی بار وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سی لڑکی' ایک چھوٹے سے کروشیے کے ہنر سے لوگوں کے دل فتح کر چکی تھی اور خود عذرا کیسی بے ہنر تھیں کہ علم جیسی دولت ہاتھ میں ہونے کے باوجود کسی کو بھی اپنا بنا نہیں پائی تھیں۔ علم کے غرور نے انہیں محبت کرنے اور محبت بانٹنے کے ہنر سے محروم کر دیا تھا۔

"ہیلو فرہاد! میں کہہ رہی تھی کہ آپ کے واپس آنے پر کیوں نا ہم کچھ دن گاؤں جا کر رہ آئیں۔ بچوں کی بھی چھٹیاں ہوں گی۔"

عذرا نے بالکل عام سے انداز میں کہا' جیسے وہ اکثر ہی وہاں آتی جاتی ہوں۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" دوسری طرف فرہاد بس اتنا ہی کہہ سکے تھے۔

"اور ہاں واپسی پر ہم امی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے' وہ یہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ ٹھیک ہے نا فرہاد؟"

اب عذرا کے لہجے میں ایک مان بھرا استحقاق تھا۔

دوسری طرف فرہاد بس سر ہلا کر ہی رہ گئے۔ اپنی بیوی کے منہ سے یہ ایک جملہ اس انداز میں سننے کے لیے انہوں نے کتنے برس انتظار کیا۔ یہ بس ان کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ آج دل سے خوش تھے۔

عذرا نے فون بند کیا تو وہ جانتی تھیں' فرہاد اس لمحے کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ آخر ان کی عذرا کو دل جیتنے اور خود سے وابستہ رشتوں کو جوڑنے کا بے مثل ہنر آہی گیا تھا۔

☼

"اگر تمہارا ارادہ بیرون ملک سفر کا ہے تو اسے ملتوی کر دو' ان پندرہ دنوں میں اگر تم نے پاکستان سے قدم باہر نکالا تو ساری زندگی واپس نہیں آسکو گی۔"

اس نے نائیجر ندی کے کنارے پہ کھڑے ہو کے وہی بات سوچی جو وہ راستے بھر سوچتی آئی تھی پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ام ہانی نے قدم نکال لیا تھا پاکستان سے اور اب افریقہ کا تاریک براعظم اس کے قدموں کے نیچے تھا۔ ندی کے راستے وہ "مالی" کے قبیلے "ڈوگون" میں پہنچے تھے۔

نیشنل پریس آف پاکستان کی جانب سے وہ تین لوگ افریقہ کے لوگوں کے حالات اور وہاں کی آمریت کے بارے میں ڈاکو منٹری بنانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس سفر کی اسے کبھی اجازت نہ ملتی اگر عبید ساتھ نہ ہوتا۔ گو کہ عبید بھی اس کے جانے کے حق میں نہیں تھا پر وہ اس سے ہمیشہ اپنی بات منوالیتی تھی۔

"دو ماہ بعد شادی ہے۔ تم بلیک باربی بن جاؤ گی ہنی!"

اسے لگا تھا کہ شاید خوب صورتی کے حوالے سے وہ مان جائے پر وہ ڈٹی رہی۔

"میرا دل نہیں مان رہا کہ تم جاؤ... مجھے لگتا ہے کہ میں تمہیں کھو دوں گا۔" وہ واقعی پریشان تھا۔

"یہ وہم تو تمہیں انگیجمنٹ سے بھی پہلے کا ہے۔" وہ اسے بالکل سیریس نہیں لے رہی تھی اور پھر وہ بالآخر مان ہی گیا اور پاپا کو منانے کا سہرا بھی اسی کے سر تھا۔ پریشان وہ تب بھی نہیں ہوئی تھی جب اردو بازار میں بیٹھے اس نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر اسے خبردار کیا تھا۔ وہ ایک آزاد خیال اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں پہ اسے یقین نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے یہ بات کسی کو بتائی تھی۔ پر یہ سچ تھا کہ یہ بات اس کے ذہن سے نہیں نکلی تھی۔

"چلیں ڈیر!" عبید نے اس کے پاس آکر کہا۔

"ہاں چلو۔" وہ سوچوں کے بھنور سے نکلی۔

احسن اور گائیڈ دونوں ان کے پیچھے تھے۔ ننگ دھڑنگ بچے حسرت و بے بسی کی تصویر بنے انہیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ خلائی مخلوق ہوں۔

اس پر پہلی مرتبہ کھلا کہ افریقہ کو تاریک براعظم کیوں کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں کے باسیوں کا مقدر تاریک ہے۔ ان کے کالے جسموں اور پیلی آنکھوں کو دیکھ کر ان کی قسمت کا اندازہ ہوتا تھا۔

"یہاں کے سردار کو آپ کی آمد کی اطلاع کر دی گئی ہے۔ وہ رات کے کھانے پر آپ سے ملیں گے۔"

گائیڈ احسن کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ ان کے پیچھے بار بردار حبشی تھے جنہوں نے سامان اٹھایا تھا۔

"تیس سال کی عمر میں منتخب ہونے والے وہ سب سے کم عمر سردار ہیں۔ ڈوگون کے لوگ انہیں کسی دیوتا کی طرح پوجتے ہیں۔ صرف یہی نہیں' انہیں آٹھ زبانوں پر مکمل عبور بھی حاصل ہے۔" گائیڈ کا "سردار نامہ" جاری تھا اور وہ متاثر ہوئی تھی۔ گائیڈ بھی یہاں کا مقامی تھا پر اس کی انگلش کافی شستہ تھی۔ وہ ہر بات کے شروع اور آخر میں اپنے سیاہ بڑے ہاتھوں کو ہوا میں

لہراتا۔
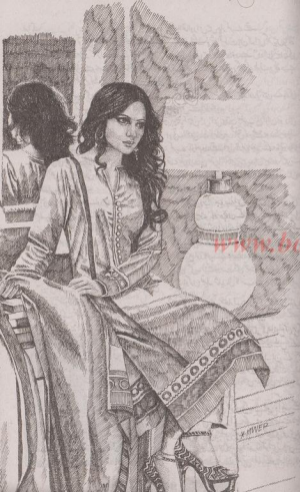
"سردار صاحب تو کافی متاثر کن شخصیت کے مالک ہیں۔" اس نے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی میڈم... کافی سے بہت زیادہ متاثر کن۔" اس نے بھی جواباً" مسکرا کر کہا۔

"وہ صاحب کتاب بھی ہیں' ان کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب the curtain Behind (پردے کے پیچھے) نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔" تھوڑے توقف کے بعد اس نے بتایا۔

"رئیلی!" وہ ایک جھٹکے سے کہتے ہوئے مڑی۔ عبید نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"وہ شخص تو دیکھنے لائق ہے... ہے نا عبید؟" اس نے توصیفی انداز میں کہا۔

"ہنی... ہم یہاں صرف نو دن کے لیے ہیں بہتر ہو گا ہم اپنے کام پر توجہ دیں۔" وہ مسکرا دی' اسے پتا تھا' عبید بہت جلد جیلس ہو جاتا تھا اکثر اسے تنگ کرنے کے لیے وہ جھوٹ موٹ دوسرے مردوں کی تعریف کرتی۔ پر اس ان دیکھے سردار سے جس کا وہ نام نہیں جانتی تھی' واقعی متاثر تھی۔

"وہ بھی ہمارے کام کا حصہ ہے' میں ایک فلم تو اس کی لائف پہ ضرور بناؤں گی۔"

اس نے ایک نظر سامنے آبادی پہ ڈالی۔ تمام گھر چکنی مٹی سے بنے ہوئے لگتے تھے۔ اسے لگا جیسے وہ پاکستان کے کسی دیہات میں آگئی ہو۔ پر وہاں کے باشندوں نے اس کے خیال کی نفی کی۔ ان کے پورے بدن پر جو ایک چیز سفید تھی' وہ ان کے دانت تھے۔ وہاں دھول اور مٹی کی بہتات تھی۔

"آلو... آلو۔" ایک عورت اپنے بھاری پیٹ کو سنبھالتے ہوئے ایک لاغر سے بچے کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

"یہ آپ کے عارضی قیام کے لیے آپ کی رہائش گاہ ہے۔" گائیڈ ویسے ہی کچے مکان کے سامنے رک گیا جیسے وہ دیکھتی آرہی تھی۔ دروازہ لکڑی کا تھا۔ صحن کافی بڑا تھا اور اس میں چار کمرے تھے۔

"آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ اس گھر میں باتھ روم اور پانی کی سہولت موجود ہے۔" وہ ان تینوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا جو بغور گھر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"بہت شکریہ مسٹر میکا!" عبید اور احسن نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔

"پاکستان میں اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی ہوتی۔" اس نے آسمان پر شفق کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ کمرے آرام دہ تھے۔ اس کا کمرہ عبید کے ساتھ والا تھا۔ ضرورت کی تقریباً" تمام چیزیں وہاں موجود تھیں۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے اپنا سٹیلائیٹ فون ہاتھ میں پکڑا اور عبید کو بتا کر باہر نکل آئی۔

"پتا نہیں مجھے آنا چاہیے تھا یا نہیں۔" مالی کی تاریک گلیوں میں پھرتے ہوئے اس نے سوچا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ ماما کو اپنی خیریت بتا کر اس نے سارہ کو کال ملائی۔ نجومی کو ہاتھ دکھاتے وقت وہ اس کے ساتھ تھی اور اس کے جانے کے حوالے سے کافی پریشان تھی۔ اچھے دوست بھی نعمت خداوندی ہوتے ہیں۔ ڈوگون قبیلہ شاید مالی کا سب سے پسماندہ قبیلہ تھا۔ بجلی حال ہی میں متعارف ہوئی تھی' سو کہیں کہیں 60 واٹ کے زرد بلب اندھیرے سے نبرد آزما تھے۔ پھرتے پھراتے وہ کافی گلیاں مڑ چکی تھی۔ سامنے ہی ایک مقامی شخص ایک گھر کے باہر لگے بلب کے نیچے کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

"ہیلو... میں ٹھیک ہوں ڈیر... بس ابھی پہنچی ہوں۔" بات کرتے کرتے وہ اس مقامی کی جانب بھی دیکھ لیتی جو بالکل مگن تھا۔

"نو نو نو بلیک بیوٹی' اونلی بلیک... میں تو ایک گھنٹے میں ہی اکتا گئی ہوں... ایک عجوبہ میرے سامنے بیٹھا ہے... بخشو بابا کی بھینس بھی اس سے تھوڑی گوری ہی ہو گی۔" بات کے اختتام پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ اس کے ایسے ہنسنے پہ سیاہ فام نے نظریں اٹھا کے دیکھا اور پھر ویسے ہی مگن ہو گیا۔

"نہیں' نہیں یہاں اردو کوئی نہیں سمجھتا۔" پھر اس نے دو چار باتوں کے بعد اللہ حافظ کہہ دیا اور واپسی کے لیے چل پڑی۔ اسے سردار سے ملنے کی جلدی تھی۔ وہ واقعی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ رات کے کھانے کے لیے تیار ہونا تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں؟" عبید اس کا منتظر تھا۔

"بس یہیں تھی' میں تیار ہو لوں۔"

"اوں ہوں... خوب صورت لڑکیوں کو تیار ہونے کی کیا ضرورت۔" وہ اس کے روم میں تھا۔

"یہ تمہاری محبت ہے' خیر تم اور احسن بھی چینج کر لو۔" اس نے ڈریس منتخب کرتے ہوئے کہا۔

"ہنی تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟ تم میرا خیال رکھتی ہو میرے لیے پریشان ہوتی ہو پر مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔" یکدم ہی اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"عبید! مجھے نہیں پتا محبت کیسے کی جاتی ہے' میں نے کبھی نہیں کی لیکن میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں'۔ جلدی بتاؤ' یہ بلیو والا پہنوں یا پھر پنک والا؟" عبید نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے واقعی اس کی محبت کی پروا نہیں تھی۔

"کوئی سا بھی پہن لو... تم پہ ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔" وہ چپ چاپ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے ایسے ہی مایوس کرتی تھی۔ اس کے ہر سوال کے جواب میں ام ہانی کا ایک ہی ٹالنے والا انداز ہوتا۔

"عبید! پتا نہیں محبت کیا ہے۔"

"مجھے نہیں پتا کہ خاص جذبات کیسے دل میں ابھرتے ہیں۔"

"مجھے تمہاری فکر ہے۔ تم سمجھ لو۔ یہی محبت ہے۔"

وہ اس کی منگیتر تھی اور دو ماہ بعد ان کی شادی تھی' پر ہنی کا رویہ اس کے لیے بہت مایوس کن تھا۔ چینج کر کے وہ باہر آیا۔ سامنے وہ بالکل تیار اپنے موبائل اور پکچر کے ساتھ صحن میں ٹہل رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکی۔

"عبید! میں..."

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" احسن نے کمرے سے نکلتے ہوئے اس کی بات کاٹی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہ پوچھنے والی تھی۔" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیونکہ ہر لڑکی تیار ہو کے یہی پوچھتی ہے۔" عبید نے جواب دیا تھا۔

دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ وہ بھاگ کر کھولنے کے لیے گئی پر عبید نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کیا بہت بھوک لگی ہے...؟"

"نہیں' مجھے سردار سے ملنے کی جلدی ہے۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ احسن دروازہ کھول چکا تھا۔ باہر ایک تنومند سیاہ فام انہیں لے جانے کے لیے کھڑا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارے سردار کا...؟" اس نے سیاہ فام سے پوچھا۔

"میڈم! ان کا نام ہے سون جاہ تو۔"

"سون جاہ تو۔" اس نے نام دہرایا۔

"اس کا مطلب کیا ہے۔" اس نے ایک اور سوال کیا۔

"اس کا مطلب افریقہ کا نجات دہندہ۔" وہ سوال پوچھ رہی تھی اور وہ ایسے جواب دے رہا تھا جیسے وہ روبوٹ ہو۔ ہر سوال کا جواب اس کی طرف دیکھے بغیر فوراً اسے پیش کر دیتا۔ آخر کار وہ سردار کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ انہیں بہت احترام کے ساتھ کھانے کی میز پر لایا گیا۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے... ہے نا عبید۔" اس نے تائید چاہی تھی۔ جواباً وہ خاموش رہا۔ کھانا ان کے سامنے میز پر چنا جا رہا تھا۔ اردگرد نگاہ دوڑانے سے لگتا نہیں تھا کہ یہ قبیلے کے سردار کا گھر ہے۔

"ایکسکیوزمی... یہ کون سی ڈش ہے؟" اس نے کھانا لانے والے سے ایک ڈش کے بارے میں پوچھا جس میں اسے مکئی لگ رہی تھی۔

"حیلی میل۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"حیلی میل..." اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے دہرایا۔

"عبید... مجھے نہیں کھانا، چلو چلتے ہیں۔" اس کا خوب صورت چہرہ ایسے ہو گیا جیسے ابھی ابکائی آ جائے گی۔

"خاموش بیٹھی رہو، آنے کی بھی جلدی تھی تمہیں اور اپنے چہرے کے تاثرات ٹھیک کرو۔" عبید کے گھرکنے پہ وہ چپ ہو کے بیٹھ گئی۔

"سردار آ گئے ہیں۔" کھانا لانے والے کی آواز پر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور نظریں وہیں اٹک گئیں۔ سامنے وہی سیاہ فام تھا جو تھوڑی دیر پہلے کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ مضبوط جسم اور لمبے قد کا سیاہ فام تھا اور تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ آبنوسی مجسمہ ام ہانی نے بغور اس کی جانب دیکھا، اس کا رنگ کالا ضرور تھا لیکن نقوش وہاں کے لوگوں کے برعکس تیکھے تھے۔ اونچی ستواں ناک اور بڑی بڑی گہری آنکھیں اسے ان سے الگ کر رہی تھیں۔ اس نے احسن اور عبید سے ہاتھ ملایا اور ام ہانی کو سر کے اشارے سے سلام کیا۔ پھر اس نے خوش آمدید کے دو تین رسمی جملے بولے اور انہیں کھانے کے لیے کہا۔ اس دوران وہ اپنے پالش زدہ ناخنوں کو دیکھتی رہی۔

"کھائیں پلیز۔" اس نے حیلی میل کی ڈش اس کے سامنے رکھی۔

"سوری۔ میں یہ نہیں کھا سکتی۔" اس نے ہاتھ سے پلیٹ پیچھے کی۔

"مگر کیوں...؟" اس کے سیاہ چہرے پہ حیرت پھیل گئی۔

"مجھے اس کا نام پسند نہیں ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے کہ صرف نام کی وجہ سے آپ نے اسے چکھنے سے انکار کر دیا ہے۔" بات کے آخر میں وہ تھوڑا سا ہنسا جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ کافی روانی سے انگلش بول رہا تھا۔ احسن اور عبید دلچسپی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

"میرے لیے اس بات سے زیادہ عجیب اس ڈش کا نام ہے۔" اس نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ! تو پھر آپ کو یہ ضرور پسند آئے گی۔" اس نے روٹی والی پلیٹ اس کے سامنے کی۔ اس کے پاس کھانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ احسن اور عبید تو تقریباً ساری ڈشز ہی چکھ رہے تھے۔ وہ کھاتے ہوئے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیتی۔

"گائیڈ نے بتایا تھا کہ آپ کو آٹھ زبانوں پر عبور حاصل ہے۔" احسن نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

"جی مسٹر احسن... آپ کو سچ بتایا گیا ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بہت عمدہ... ذرا بتائیں گے کہ کون کون سی زبان۔" احسن کے دوبارہ پوچھنے پر وہ تینوں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اردو۔" اس نے ام ہانی کی طرف بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس کا سانس جیسے حلق میں اٹک گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے اس کے لیے کتنے نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے اور اس کے دیکھنے پر وہ سمجھی کہ شاید قہقہے نے اسے متوجہ کیا ہے۔ اس کے تاثرات احسن اور عبید

سے تو چھپ گئے تھے پر اس تیسرے بندے سے نہیں چھپ سکے تھے۔ اس نے بمشکل سانس لی — اور ہونٹ دانتوں تلے دبا کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"ویری گڈ... آپ اردو سمجھ سکتے ہیں...؟" عبید کو اس بات نے بہت ایکسائیٹڈ کر دیا تھا۔

"جی ہاں، بہت اچھے سے سمجھ اور بول سکتا ہوں۔" بات کرتے کرتے اس نے ایک بار پھر ام ہانی کی طرف دیکھا اور اب کے جواب بھی اردو میں ہی دیا تھا۔

"اس کے علاوہ اور کون سی زبانیں ہیں...؟" عبید نے پُرجوش ہو کے پوچھا۔ "اس کے علاوہ رونگا، پرتگالی، سواحلی..." وہ کیا بتا رہا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شرمندگی کے باعث وہ نظریں نہیں اٹھا پا رہی تھی۔ اب وہ سب ہی اردو میں بات کر رہے تھے۔

"میری فیانسی تو بغیر دیکھے ہی آپ سے بہت متاثر ہو چکی تھی... ہنی! یاد ہے نا تم کتنی اتاؤلی ہو رہی تھیں ان سے ملنے کے لیے۔" عبید کا جوش تو کسی بھی طرح سے ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

"فیانسی، ویری نائس بہت بہت مبارک ہو آپ کو مسٹر عبید! آپ کی فیانسی بہت خوب صورت اور "مہذب" لڑکی ہے۔" اس نے گہری نظروں سے ام ہانی کی طرف دیکھتے ہوئے بظاہر مسکرا — کے کہا۔

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ عبید کے شکریہ کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ تینوں اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

"عبید! میں جانا چاہتی ہوں۔" اس نے میز پہ پڑا ہوا موبائل اور کلچ اٹھا لیا۔

"ہنی! بیٹھ جاؤ۔ ابھی یہ بات کر رہے ہیں۔" اس نے شرمندہ نظروں سے سون جاہ تو کی طرف دیکھا۔

"میں نے کہا ہے کہ مجھے ابھی جانا ہے۔" اب کے غصہ اس کی آواز سے عیاں تھا۔

"بیٹھ جائیں مس ام ہانی! اس علاقے میں آپ میرے سائن کیے ہوئے پرمٹ کی وجہ سے داخل ہوئے ہیں، اگر آپ لوگ تسلی سے اپنا کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ یہاں کے باقی باشندوں کی طرح میرے احکامات پر عمل کریں۔" ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اس نے چند جملوں میں اپنا مقام یاد دلایا تھا۔

وہ جس جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی، اسی جھٹکے سے بیٹھ گئی۔ موبائل اور کلچ زور سے میز پر پٹخا۔ چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔

"مجھے امید ہے کہ آپ لوگ یہاں کے امن و امان کو قائم رکھیں گے۔ علاقے کی حدود ختم ہوتے ہی ایک گلاس فیکٹری ہے جس کے اونر مسٹر فرینک ہیں۔ یہاں انہیں سستے مزدور مل جاتے ہیں، سو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔" اس نے ساری بات اردو میں کی تھی۔

"آپ لوگوں کے لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے، کہ آپ مسٹر فرینک اور وہاں کے دوسرے منتظمین سے دور رہیں۔" بات کے آخر میں اس نے تینوں کی جانب دیکھا۔

"کیا آپ لوگ کچھ کہنا چاہیں گے...؟" سون جاہ تو نے پھر سے باری باری تینوں کی جانب دیکھا۔

"مجھے کہنا ہے۔" اس کے بولنے پر عبید نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"جی ضرور مس ام ہانی... ہم سب کو آپ کی بات سننے میں دلچسپی ہے۔" وہ تھوڑا سا مسکرا کر اس کی جانب جھک کر بیٹھ گیا۔

"آپ یہاں کے سردار ہیں، آپ کے احکامات یہاں کے باشندوں پر لاگو ہوتے ہیں، یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ ہم یہاں کے باسی نہیں مہمان ہیں۔ آئندہ میرے ساتھ تحکمانہ انداز میں بات کرنے سے ذرا گریز ہی کیجیے گا۔ نیشنل پریس آف پاکستان میں میرے پاپا کے دس فیصد شیئرز ہیں اور اس وقت ان کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہے کہ وہ "ڈوگون" جیسے دو قبیلے خرید سکتے ہیں مجھے امید ہے کہ آئندہ بات کرتے ہوئے آپ میری حیثیت کو مدنظر رکھیں گے۔" ٹھہر ٹھہر کے اور چبا چبا کے بولتے ہوئے اس نے پوری بات

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کی۔

"آپ کے پاپا کی دولت کے بارے میں جان کر بہت مرعوب ہوا ہوں وہ سچ میں بہت بڑے آدمی ہیں اور میں معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو میری بات بری لگی۔ رات کا کھانا آپ روزانہ یہیں تناول کیا کریں گے۔ اب آپ سے کل اسی وقت ملاقات ہوگی۔ امید ہے، آپ لوگوں کی رات اچھی گزرے گی۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارا بولنا تو بے کار ہی گیا' وہ تو تم سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔" احسن نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

"مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اس کالے بھینسے کو متاثر کرنے کی۔" اس نے منہ بنا کر کہا اگرچہ اسے غصہ آرہا تھا کہ وہ واقعی ذرا بھر بھی متاثر نہیں ہوا۔ ایک سیاہ فام نے انہیں گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی مگر انہوں نے انکار کردیا۔ وہ راستہ بخوبی سمجھ گئے تھے۔

"تمہیں اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تو بہت خوش اخلاق آدمی ہے یار! اور دیکھو تم اس نے تمہاری باتوں کا بالکل بھی برا نہیں مانا۔" وہ تینوں احسن کے روم میں تھے اور ڈنر کو ڈسکس کر رہے تھے۔

"پر اس نے ہر بات مجھے جتا جتا کے کی' اس نے طنزاً کہا تھا کہ وہ پاپا کی دولت سے بہت متاثر ہوا ہے اور میں مہذب ہوں۔" وہ کسی بھی طرح اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"ہنی! تم پاگل ہو گیا۔ وہ تم پر بھلا کیوں طنز کرے گا۔" اس کی بات نے دونوں کو حیرت میں مبتلا کردیا تھا۔ جواب میں اس نے ساری بات بتادی اور اب وہ دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی غصے سے دونوں کو دیکھتی رہی۔

"اب تم ایک چھوٹا سا کارڈ بناؤ اور معافی نامہ لکھ کے اسے دے دو۔"

احسن کا مشورہ برا نہیں تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا کارڈ بنایا اور اس کے اوپر ایک دو پونیوں والی خوب صورت بچی بنائی جو ہاتھ جوڑ کے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اوپر "آئی ایم ساری" کے الفاظ لکھے اور نیچے اپنا نام لکھ دیا۔

صبح احسن کی کال نے اسے نیند سے جگایا۔ فریش ہو کے وہ عبید کے روم میں پہنچی تو وہ ناشتے کے لیے اس کے منتظر تھے۔

"ناشتہ کس نے بھیجا؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اسی نے جس کے ساتھ تمہاری لڑائی ہے' اب تم کھاؤ گی یا پھر خود سے بناؤ گی...؟" احسن نے اسے چھیڑا۔ اس نے جواباً" اسے گھور کر دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک عورت صفائی کرنے کے لیے پہنچ گئی۔ وہ بھی تھوڑی بہت انگلش سمجھتی تھی۔ عبید نے کام بانٹ دیا تھا۔ اس کے ذمے آج افریقہ کے "ہاؤس ہولڈ" کی ڈاکومینٹری تھی۔ وہ عورت وہیں تھی۔ اس نے اپنی ساری چیزیں لاک کردیں اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

"تمہارا نام کیا ہے۔" اس نے بریسلیٹ پہنتے ہوئے اس عورت سے پوچھا۔

"سارٹینا۔" عورت نے جواب دیا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے عورت کی آنکھوں میں دیکھا۔ اداسی' ملال' حسرت' بے بسی کیا کچھ نہیں تھا' اس کی سیاہی مائل زرد آنکھوں میں۔ یہ آنکھیں بھی اللہ نے کیا خوب بنائی ہیں۔ نفرت' محبت دکھ درد کوئی بھی جذبہ ہو ان سے چھلک چھلک پڑتا ہے۔

"یہ لو سارٹینا... یہ تم پہن لو۔" اس نے جیولری باکس سے ایک خوب صورت انگوٹھی اٹھا کے اسے دی۔ عورت نے ہچکچاتے ہوئے رنگ اپنی کالی بھدی انگلیوں میں پہن لی۔ ایک عجیب سی خوشی اس کے چہرے پہ آگئی تھی۔

"اوکے۔ پھر مجھے اب چلنا ہو گا۔" اس نے کیمرہ گلے میں لٹکایا اور کارڈ بھی ہاتھ میں پکڑ لیا اور باہر نکل آئی۔ پھرتے پھراتے اس نے کھیلتے ہوئے بچوں کی تصویریں بنائیں۔ اسے کارڈ دینا تھا پر "سون جاہ تو" کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

گائیڈ احسن اور عبید کے ہمراہ تھا۔ وہ اکیلی ہی پھرتی رہی۔ کارڈ ابھی بھی اس کے پاس تھا پر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

"بات سنیں... آپ کا سردار اس وقت کہاں ہو گا؟" اس نے ایک عورت کو روک کر پوچھا۔ عورت نے جواباً" بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ اس وقت کھیتوں میں ہوتا ہے۔" ٹوٹی پھوٹی انگلش نے اسے سمجھا دیا تھا۔

"اور کھیت کس طرف ہیں؟"

"وہاں' اس طرف۔" عورت نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"اوکے' شکریہ۔" وہ فوراً" چل پڑی۔

"رکو' میری بات سنو۔" عورت نے اسے آواز دی۔ وہ جو ابھی چند قدم چلی تھی پھر سے واپس آگئی۔

"جو عورت اس پہ مرتی ہے' وہ مر جاتی ہے۔" عورت کا لہجہ پُراسرار سا ہو گیا۔

"کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔" اس نے الجھن بھری نظروں سے عورت کو دیکھا۔

"مطلب اس کے عشق میں مبتلا ہونے والی ہر عورت کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔" عورت نے اپنے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

"کیونکہ میں کچھ دیکھ رہی ہوں تم میں۔" عورت نے بائیں ہاتھ میں پکڑی ٹوکری دائیں ہاتھ میں منتقل کی۔

"تم کون ہو...؟" وہ ایک دم ہی پریشان سی ہو گئی تھی۔

"میں ایک کاہنہ ہوں۔" عورت نے جواب دیا اور وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے عبید سے وعدہ کیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری ایڈونچر ہو گا۔ اور شادی کے بعد وہ جاب وغیرہ سب کچھ چھوڑ دے گی۔ مگر اب اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے غلطی کی ہے۔

"میں قسمت کا حال بتاتی ہوں' اور کسی بیماری کے

لیے پانی پہ دم کر کے دوں تو وہ بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے، میرے پڑھے ہوئے میں اثر ہے۔" شاید وہ زیادہ بولنے کی عادی تھی۔

"تمہارے بارے میں مجھے ایک عورت نے صبح بتایا تھا کہ ایشیا کی ایک حسینہ آئی ہے، تب ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے خبر ہو گئی کہ کچھ غلط ہونے والا ہے، آؤ ذرا میں تمہارا حساب لگاؤں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑی دور بنے ایک جھونپڑے میں لے آئی۔ خوف کا شدید احساس اس پہ طاری ہو گیا تھا اور وہ ایسے آ گئی تھی جیسے مکمل طور پر اس کے بس میں ہو۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔" عورت نے اسے ایک چٹائی پہ بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنا سامان اٹھا کے اس کے پاس آ گئی۔

"اس پانی کو پیو۔" پانی کا بھرا ہوا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے پی کر اسے واپس کر دیا۔ بچے ہوئے پانی پہ وہ کچھ پڑھ کے پھونک مارنے لگی۔ دو تین پھونکیں مارنے کے بعد اس نے غور سے پانی کی طرف دیکھا۔

"اور گو بو گو بو!" عورت کی آنکھوں اور آواز دونوں سے ہی دہشت نمایاں تھی۔ اب اس نے پانی کا پیالہ رکھ کر کاغذ اور پنسل اٹھا لی تھی۔ اس کا نام اور تاریخ پیدائش پوچھنے کے بعد اب وہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی اور حساب لگانے کے بعد اس کا رد عمل پہلے جیسا تھا۔

"کیا ہوا... مجھے بتائیں پلیز۔" وہ جو اپنے اعتماد کے لیے مشہور تھی اور اب اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"تم کبھی واپس نہیں جا پاؤ گی۔" عورت کی آواز دہشت زدہ تھی۔

"یا اللہ۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"صرف یہی نہیں، تمہاری وجہ سے ڈوگون پہ کوئی مصیبت نازل ہو گی، وہ مصیبت کیا ہے، کچھ پتا نہیں۔"

دو آنسو اس کے گالوں پہ بہہ نکلے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر آہستہ سے اٹھ گئی۔

"رکو، میں تمہیں پانی دم کر کے دیتی ہوں۔" اسے اپنے پیچھے عورت کی آواز سنائی دی پر وہ چپ چاپ چلتی رہی۔

"یا اللہ میری مدد کر.... مجھے واپس اپنے پیاروں میں پہنچا دے اور میرے دل کو سکون دے۔" وہ بے آواز روتی اور بغیر لب ہلائے دعا کرتی رہی۔

"رونے کے لیے دن تو بالکل اچھا نہیں ہے، لوگ اکثر سب سے چھپ کر رات کو روتے ہیں۔"

سون جاہ تو کی آواز پہ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل اس کے پاس کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے وہ "after Earth" کے ہیرو جیسا لگا۔

"نہیں، شاید میں غلطی پر ہوں۔ ہو سکتا ہے، مہذب لوگوں کو دن میں رونے کی عادت ہو۔" کہتے ہوئے وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے اس طنز پہ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ جن احساسات کا شکار تھی اسے طنز محسوس ہی نہیں ہوا۔ سو وہ چپ چاپ کھڑی آنکھیں صاف کرتی رہی۔

"آپ لوگوں سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھیں...؟" اس کے چپ رہنے پہ سون جاہ تو نے پھر بات کی۔

"میں نے تو بس ایک عورت سے پوچھا تھا۔" اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ جواباً اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آئی ایم سوری!" کہتے ہوئے اس نے کارڈ آگے کی طرف بڑھا دیا۔

"Accepted" کارڈ کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کہیں بیٹھ سکتے ہیں۔" اسے کھڑے ہونا محال لگ رہا تھا۔ وہ اسے لے کر ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے آ گیا۔ جہاں ایک قدیم طرز کی بڑی سی چارپائی پڑی تھی۔ اب تک ان کی ساری بات چیت اردو میں ہی تھی۔

"آپ یہاں کے لگتے نہیں ہیں۔" اس نے کیمرہ اتار کر چارپائی پر رکھ دیا اور سینڈل اتار کر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

"کیوں... کیا میرا رنگ یہاں کے لوگوں سے تھوڑا سفید ہے۔" طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ آ گئی۔

"میرا نہیں خیال کہ آپ کو ایک بات بار بار دہرانی چاہیے جبکہ میں شرمندگی کا بھرپور اظہار کر کے معافی مانگ چکی ہوں۔" اسے غصہ آیا اور اس نے اپنے تاثرات بالکل بھی نہیں چھپائے تھے۔

"مجھے ان لوگوں کی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے جو صرف کالے رنگ کی وجہ سے مجھے کمتر سمجھتے ہیں۔ پچھلے سال میری شائع ہونے والی کتاب پر اعزازی تمغہ صرف اسی وجہ سے نہیں مل سکا کہ میں "بلیک" ہوں۔ میں نے اس کتاب کا لکھا ہوا اصل نسخہ، جو کہ میری لکھائی میں تھا۔ نائیجر دریا میں بہا دیا تھا۔" دکھ اس کی آواز سے ہی نہیں اس کے چہرے اور آنکھوں سے بھی عیاں تھا۔

"اوہ.... آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن آپ کے نقوش یہاں کے لوگوں سے نہیں ملتے، میرا مطلب آپ کی ناک اور ہونٹ موٹے نہیں ہیں اور نہ ہی آپ کی آنکھیں زرد ہیں۔" اسے اپنا جواب جاننے کی جلدی تھی۔

"میری ماں انڈین تھی، وہ سیاحت کے لیے یہاں آئی تھی اور یہیں کھو گئی، میرا باپ بتاتا ہے کہ وہ بہت برے حال میں اسے ملی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی، شاید تمہارے جیسی ہو گی، میرے باپ کے اخلاق، شرافت اور محبت نے اس کا دل جیت لیا اور اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔" وہ آہستہ آہستہ اسے بتا رہا تھا۔

"میں نے سنا تھا کہ افریقہ کے لوگ وحشی اور آدم خور ہوتے ہیں، پر یہاں ایسا نہیں ہے، یہاں ان گلیوں میں مجھے بھوک، حسرت اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں ملا، مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اس قبیلے کے سردار ہیں۔ اگر میں سچ بتاؤں تو آپ کو سردار کے روپ میں دیکھ کر مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی۔"

"اگر آپ ایک صدی پہلے آتیں تو شاید حال ویسا ہی ہوتا، مگر اب افریقی تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں۔ ڈوگون قبیلے میں چار لاکھ سے زائد افراد تھے۔ فرانس کی مداخلت نے انہیں وہاں سے اٹھ آنے پر مجبور کر دیا اور چند گھرانے یہاں آباد ہو گئے۔ آپ کا فیانسی کیسا ہے؟" بات کرتے کرتے اس نے اچانک پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے۔"

"مجھے آپ دونوں کا تعلق ایسا نہیں لگتا جیسا کہ منگنی شدہ جوڑے کا ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب، میں سمجھی نہیں۔" اس نے حیران ہو کے پوچھا۔

"اس لڑکی کی طرف دیکھ رہی ہیں...." اس نے سامنے جاتی ہوئی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو شاید کھیتوں سے آ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت اور پسینے نے مل کر اس کا برا حشر کیا ہوا تھا۔

"ہاں دیکھ رہی ہوں...." لڑکی ان دونوں کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

"اس کی منگنی کو دو سال ہو گئے ہیں، وہ اپنے منگیتر کے بچے کی ماں بن چکی ہے، ہو سکتا ہے۔ شادی سے پہلے وہ ایک اور بچے کو جنم دے دے۔" اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا، غصے سے چہرہ جیسے انگارہ بن گیا ہو، کتنی غلط بات کہی تھی اس نے۔

"کون کہتا ہے کہ افریقی تھوڑے تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں وہ اب بھی ویسے ہی ہیں۔ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں۔ شادی سے پہلے منگیتر کے دو تین بچوں کو جنم دینے کا رواج افریقہ میں ہو گا، پاکستان میں نہیں ہے، آٹھ زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد بھی آپ اتنی سی بات نہیں جانتے۔" اسے غصہ آ گیا تھا۔

"ایک منٹ... آپ نے کہا کہ آپ مسلمان ہیں۔" اس نے ایسے اطمینان سے پوچھا کہ جیسے اس کی باتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو۔

"آپ کو شک کس لیے ہے؟" اس نے کیمرہ زور

سے چارپائی پہ پھینکا جو اس نے ابھی اٹھایا تھا۔

"معاف کیجئے گا" آپ مجھے مسلمان نہیں لگتیں، میں ایک سیاہ فام ہوں، مجھے بتانا نہیں پڑتا، پہلی نظر دیکھتے ہی کوئی بہت کم سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی جان جائے گا کہ میں افریقی ہوں، وہ سامنے گدھا بندھا ہوا ہے، اسے بتانا نہیں پڑ رہا کہ میں گدھا ہوں، آپ کے معاملے میں شک اس لیے ہے کہ آپ کو بتانا پڑ رہا ہے۔ اور غضب تو یہ کہ بتانے کے بعد بھی یقین تمہیں آ رہا۔" اس نے ام ہانی کی ٹائٹ جینز، سلیو لیس شرٹ اور گلے میں جھولتے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کتنے ہی پل وہ اسے بے یقین نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کا کہا ایک ایک لفظ درست تھا۔ وہ حقیقتاً لاجواب ہوئی تھی۔ پر وہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھی۔

"جو بھی ہے، مجھے تم سے اپنے مسلمان ہونے کی سند نہیں لینی ہیں تم سے، بہرحال بہتر ہوں۔"

وہ سینڈل پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بد تہذیب شخص سے وہ الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہرا دکھ اور تاسف تھا۔

"میری بلا سے تم جہنم میں جاؤ۔" اس نے نفرت سے ہنکارا بھر کے کہا اور تیز تیز قدموں سے چل دی۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کارڈ کو تاسف سے دیکھا۔ عجیب لڑکی تھی وہ اور سوری کرنے کا طریقہ بھی تو بہت عجیب تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنے کے لیے لوگوں سے اس کا پتا پوچھ رہی تھی اور جب وہ اسے مل گیا تو پہلے سے زیادہ بدتمیزی کر کے چلی گئی۔ وہ سوچ کر ہلکا سا مسکرایا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ اپنے باپ کی طرح رحم دل اور خوش اخلاق نہ ہوتا۔

باقی دن اس نے بہت بددلی سے گزارا۔ احسن اور عبید کے ساتھ سارا دن کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ دوپہر کا کھانا بھی گول کر دیا۔ گرم ہوا اور مٹی نے اس کی جلد پر اثر کیا تھا۔ پر زیادہ اثر کاہنہ اور سون جاہ تو کی باتوں کا تھا۔ اس نے وہاں کے رہن سہن کو بغور دیکھا۔ ہر گھر میں دو تین گنبد نما کمرے ضرور تھے۔ ایک عورت سے پوچھنے پر اسے پتا چلا کہ ایک گنبد نما کمرہ صرف مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ جس میں وہ اپنا سامان رکھتے ہیں اور دوسرا عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔ جس میں ان کا زیور اور دوسری اس قسم کی اشیا ہوتی ہیں اور اسی طرح کا ایک کمرہ اناج کے لیے ہوتا ہے۔ ایک گھر میں اس نے لکڑی کی ایک مورتی دیکھی جو عورت کی تھی۔ اسی قسم کی دوسری مورتیاں وہ دوسرے گھروں میں بھی دیکھ چکی تھی۔ شاید وہ لوگ اس فن میں ماہر تھے۔

سارا دن وہ کاہنہ کی باتوں کو بھلانے میں لگی رہی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ دل ہی دل میں وہ کئی بار اللہ کو پکار کر دعا کر چکی تھی۔ اس نے گھر فون کر کے اپنی خیریت کی اطلاع بھی دی۔ اور شام کو تھک ہار کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئی۔ عبید اور احسن بھی آ چکے تھے۔ کھانا کھانے میں ابھی وقت تھا، سو اس نے چائے بنا کر ان دونوں کو پیش کی۔

"تم نے کارڈ دے دیا تھا؟" احسن نے پوچھا۔

"ہاں! دے دیا تھا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کیا ہوا؟ ٹھنڈی آہیں کیوں بھر رہی ہو.... کیا اس نے معافی قبول نہیں کی۔" وہ شرارتی ہنسی ہنسا اور جواب میں اس نے دوپہر کا سارا واقعہ سنا دیا اور ہنسی کا ایک فوارہ تھا جو ان دونوں کے منہ سے ابل پڑا۔

"کیا چیز ہو تم ہنی! قسم سے بل پڑوا دیے ہیں پیٹ میں۔" عبید نے بمشکل ہنسی روک کے کہا۔ جواباً وہ غصے سے ان دونوں کو گھورتی رہی۔

"تم نے آتے ہوئے کارڈ جھپٹ لینا تھا یار.... اب تمہیں رات کو بیٹھ کے پھر بنانا پڑے گا۔" احسن کی ہمدردی کی ایکٹنگ کو وہ خوب سمجھتی تھی۔

"ڈوب مرو تم دونوں.... اتنی پریشان ہوں میں اور تم لوگوں کی ڈرامے بازی نہیں ختم ہو رہی۔" اس نے سلگ کر کہا۔

"ویسے اس میں اتنے غصے والی کیا بات تھی، تم کہہ دیتیں کہ پاکستان میں منگیتر اتنے ہی فرینک ہوتے ہیں

کہ ہاتھ پکڑ کر آئی لو یو بول سکیں بس۔" عبید نے کندھے اچکا کر کہا۔

"یہ بات تم بتا دینا اسے، مجھے ضرورت نہیں ہے اس کے منہ لگنے کی۔"

"ہاں، وہ بے چارہ کالا جو ہے۔" احسن نے رونے والا منہ بنا کے کہا۔

"شٹ اپ احسن!" اس نے غصے سے کہا اور احسن منہ پر انگلی رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گیا پر وہ اس کی شرارتی آنکھوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے کھانے کے لیے سوٹ منتخب کرنا تھا۔ اس نے پرپل کلر کی لمبی فراک جو کہ ٹخنوں تک آتی تھی نکال لی بازو چاک دار تھے اور پورے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جب تک وہ یہاں ہے سلیو لیس نہیں پہنے گی۔ عبید نے کہا تھا کہ وہ کھانے کے لیے خود ہی آ جائیں گے کسی مقامی کو نہ بھیجا جائے۔ وہ تیار ہو کے کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ آسمان صاف تھا اور چاند نکلا ہوا تھا۔ سارے دن کا ایک ایک پل اس کے ذہن پہ نقش تھا۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچتی رہی جب بھی وہ سوچتی ایک آہ کے ساتھ دعا اس کے لبوں سے نکل جاتی۔ پتا نہیں قسمت میں کیا لکھا تھا۔

"واؤ، ہنی یہ تم ہو.... مجھے لگا کسی قدیم سلطنت کی شہزادی کھڑی ہے۔" عبید کو روایتی کپڑوں میں وہ ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی تھی۔

"ارے تم جا رہی ہو....؟" احسن نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواباً اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا کہے گا سردار کہ اس لڑکی کے منہ پہ تو ناک ہی نہیں ہے.... رہنے دو تم میں تمہارے لیے تھوڑا سا کھانا چوری کر لاؤں گا۔" احسن نے چھیڑنے والے انداز میں بمشکل ہنسی روک کے کہا۔

"مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے اور اب اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔"

آج بھی حسب معمول انہیں ہمیشہ کی طرح احترام کے ساتھ بٹھا کر کھانا چنا گیا۔ سون جاہ تو کے آتے ہی احسن نے ام ہانی کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ وہ غصہ ضبط کر کے بیٹھی رہی۔ سون جاہ تو نے عبید اور احسن سے ہاتھ ملایا اور سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کھانا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کل کی طرح روٹی والی پلیٹ اٹھا کے اس کے سامنے کر دی۔ اسے یاد تھا کہ کل اس نے کچھ اور نہیں کھایا تھا۔ ایسا کرنے پر احسن کے کھانسنے اور پھر گلاس اٹھا کر پانی پینے کی حرکت نے اسے خوب تپ چڑھائی۔

احسن اور عبید سے وہ ان کے کام کے بارے میں پوچھتا رہا پر اسے بالکل مخاطب نہیں کیا تھا۔ ایک دو بار اس نے نظریں اٹھا کے اس کی جانب دیکھا تو اسے اپنی جانب گہری نظروں سے دیکھتے پایا۔ دوبارہ اس نے نظریں میز پر سے نہیں ہٹائیں۔ کھانے کے دوران وہ ایسے پوز کرتی رہی جیسے اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ اور پھر ایسے ہی پورے تین دن گزر گئے۔

ان تین دنوں میں اس کی ملاقات کھانے کے علاوہ اس سے نہیں ہوئی۔ ہر مرتبہ کھانے کے موقع پر وہ اسے سر کے اشارے سے سلام کرتا اور روٹی والی پلیٹ جہاں بھی پڑی ہوتی اٹھا کے اس کے آگے رکھ دیتا اور دو تین بار بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ لیتا۔ سارٹینا کی زبانی اسے سون جاہ تو کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ مثلاً "یہ کہ وہ اپنے گھر میں اکیلا ہے۔ اپنے کھیتوں پر خود محنت کرتا ہے اور یہ بھی کہ سارٹینا اس کے عشق میں مبتلا ہے۔ یہ بات سن کر وہ کافی دیر ہنستی رہی۔

"تمہیں اس میں کیا نظر آیا جو تم اس سے محبت کر بیٹھیں....؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"میں نے اسے اندر تک جان لیا ہے، کوئی بھی عورت ایسا کرے تو اس سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔" بات کرتے ہوئے اس کے سیاہ ہونٹ مسکراتے رہے۔

"اور اس نے نمائئی کو انکار کیا تھا، اسے انکار کرنا

مردوں کے لیے مرجانے کے برابر ہے۔"
"نمائنی کون ہے۔" اسے حیرت ہوئی تھی کہ افریقہ میں بھی کوئی قاتل حسینہ ہے۔
"نمائنی ایک طلاقت ہے' وہ ایک قدم چلتی ہے تو ہزاروں دلوں کی دھڑکن بند کروا دیتی ہے۔ اب وہ مستقل طور پر مسٹر فرینک کے ساتھ ہے۔ سون جاہ تو کو دیکھ کر دل ہار بیٹھی تھی۔" وہ بہت پیار سے اس کا نام لیتی تھی۔
"وہ خود کو کیا سمجھتا ہے' مجھے اس سے نفرت ہے' ہو سکتا ہے وہ مشہور ہونے کے لیے عورتوں کو انکار کرتا ہو۔"
"اگر تم واقعی اس سے نفرت کرتی ہو تو مجھے تمہارے عورت ہونے پہ شک ہے۔" شاید اپنے محبوب کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنا اسے برا لگا تھا۔
وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔ اور پھر اس سے سوری بھی کی۔ پر صرف سارٹینا کے لیے وہ اس شخص کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتی تھی۔ اسے واقعی سون جاہ تو سے نفرت تھی۔ ان کے جانے میں چار دن رہ گئے تھے۔
"میں مسٹر فرینک سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ایک ڈاکو مینٹری کے لیے۔" کھانے کی میز پر اس نے جیسے اعلان کیا تھا۔
"میرے نظریے کے مطابق وہ کوئی اچھا انسان نہیں ہے اور شاید وہ ڈاکو مینٹری بنانے کی اجازت بھی نہ دے۔" ان تین دنوں میں شاید پہلی مرتبہ وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔
"اور میرے نظریے کے مطابق توڈوگون میں کوئی بھی اچھا انسان نہیں ہے' اس کے سامنے میں یہی ظاہر کروں گی کہ میں میڈیا کے ذریعے بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح سے وہ ڈوگون کے لوگوں کو روزگار فراہم کر رہا ہے پر بعد میں' میں فرنچ امپریل ازم کے نام سے دنیا کے سامنے لاؤں گی۔" بات سن کر وہ ہلکا سا مسکرایا جبکہ احسن اور عبید نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔
"مسلمانوں کی مقدس کتاب میں عورتوں کے مکر کا ذکر ہے۔" مسکرا کر بات کرتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح زہر لگا۔ احسن نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔
"ایک مسلمان ٹورسٹ نے مجھے یہ بات بتائی تھی' لیکن مجھے یہ فارمولا سب عورتوں پہ اپلائی نہیں کرنا چاہیے" اس کے غصے سے دیکھنے پر وہ وضاحت دینے لگا پر انداز ہنوز طنزیہ ہی تھا۔
"آپ صبح تیار رہیے گا' میرا گائیڈ آپ کو وہاں پہنچا دے گا۔" اب کے اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے درمیان اور کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔
عبید نے ساتھ جانے کا کہا مگر وہ نہیں مانی۔ اس نے وعدے کے مطابق گائیڈ کو بھیج دیا تھا۔
"آپ تھوڑا محتاط رہیے گا.... وہ بہت خرانٹ آدمی ہے۔" گائیڈ نے اسے نصیحت کی تھی۔
"بے فکر رہیں مسٹر میکا' میں خرانٹ لوگوں سے بہت اچھے سے نپٹتی ہوں۔"
"وش یو گڈ لک' یہ گارڈ آپ کو ان کے آفس تک پہنچا دے گا آپ کے آنے کی اطلاع انہیں دے دی گئی تھی۔" گائیڈ اسے چھوڑ کے واپس چلا گیا تھا۔ گارڈ کے ہمراہ وہ مسٹر فرینک کے آفس تک آئی۔ سون جاہ تو وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔
مسٹر فرینک چپٹی ناک والا سفید فام تھا۔ سون جاہ تو اور وہ ساتھ بیٹھے بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن کا کمرشل لگ رہے تھے۔ وہ سون جاہ تو سے بالکل مخاطب نہیں ہوئی اور رسمی جملوں کے بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔
"میں خوب صورت عورتوں کو انکار نہیں کرتا' یا یوں سمجھ لیں کہ اتنی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔" مسٹر فرینک نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پہ جما کے مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً" وہ مسکرا دی۔ سارٹینا ٹھیک کہتی تھی۔ خوب صورت عورتوں کو انکار کرنا مردوں کے لیے شاید موت کے برابر ہے۔
"عورت میں بس ایک ہی خوبی ہونی چاہیے کہ وہ خوب صورت ہو' اگر ایسا نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ

وہ مرجائے۔" مسٹر فرینک نے بہت جذب کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سون جاہ تو کی طرف دیکھا جیسے اس سے تائید چاہ رہا ہو۔
"مرد میں بھی بس ایک ہی خوبی ہونی چاہیے کہ وہ مضبوط کردار کا مالک ہو' اگر ایسا نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ وہ مرجائے۔" سون جاہ تو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے چبا چبا کر مسٹر فرینک کو جواب دیا اور پھر بہت طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے میں ہی اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ سون جاہ تو اپنی ہنسی روکنے یا پھر چھپانے کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔
وہ سارا دن اس نے وہیں گزارا۔ فیکٹری کے ملازمین کی حالت بہت بری تھی۔ گدھوں میں اور ان میں شاید شکل و شباہت کا ہی فرق تھا۔ سون جاہ تو سارا دن تقریباً" اس کے ساتھ ہی رہا۔ ناراضی کی شدت میں تھوڑی کمی آئی تھی۔ شام تک تھک ہار کر وہ وہاں سے نکلی۔ وہ اس کے ہمراہ تھا۔
"یہ مت سمجھنا کہ تم سے دو چار باتیں کر کے میں تمہیں اچھا سمجھنے لگوں گی' میرے خیالات اب بھی تمہارے بارے میں ویسے ہی ہیں۔" اس نے ساتھ چلتے ہوئے سون جاہ تو سے کہا۔
"کیسے....؟" پتا نہیں وہ ہمیشہ اس سے بات کرتے ہوئے مسکراتا کیوں تھا۔
"یہی کہ تم اجڈ ہو' جنگلی ہو اور بدصورت بھی۔"
"شکریہ' یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے ام ہانی؟" وہ قدم بالکل اسی کے برابر میں رکھ رہا تھا۔
"کیا.... ؟ یہ سارا کام....؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔
"نہیں نہیں' کام نہیں' میرا مطلب یہ لڑنا جھگڑنا اور ایسے جواب دینا' دراصل مجھے مسٹر فرینک کی شکل یاد آگئی ہے۔"
وہ خوب دل کھول کر ہنسی اور جتنی دیر وہ ہنستی رہی وہ اسے دیکھتا رہا۔
"اوہ' میری سینڈل ٹوٹ گئی۔" اس کی سینڈل ایک سائیڈ سے پوری کھل گئی تھی اور زمین ابھی تک کافی گرم تھی۔ گو کہ شام ہو گئی تھی اور وہاں مٹی بھی بہت تھی۔ پر اسے پتا تھا کہ یہ مہمان نواز بندہ اسے اپنا جوتا دے دے گا اور اس نے ایسے ہی کیا۔ ٹوٹے ہوئے سینڈل اس نے وہیں چھوڑ دیے۔ وہ بھاری مردانہ جوتا اس کے پاؤں میں بہت کھلا تھا۔ مگر رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔
"میں یہ سارٹینا کے ہاتھ بھیج دوں گی۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ آئی۔ وہ ابھی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لاغر' کمزور' سیاہ بچہ۔ اس کے بال چھوٹے اور گھنگھریالے تھے۔ شاید وہ ایک عرصے سے نہایا نہیں تھا۔ بچے نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا جس میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کاغذ پکڑا اور اس کی واحد تہہ کو کھولا۔
دو سطریں لکھی تھیں۔
وہ نہ سمجھ میں آنے والی کوئی زبان تھی۔ اس نے دو تین بار پڑھا پر اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ کاغذ بہت بوسیدہ سا تھا پر لکھائی تازہ لگ رہی تھی۔ اس نے ارد گرد دیکھا' وہاں کوئی نہیں تھا وہ بچہ بھی نہیں۔ اس نے کاغذ کو تہہ کر کے کلچ میں رکھا اور اندر داخل ہو گئی۔
رات تک وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پر بے سود۔ اس بات کا تذکرہ اس نے عبید اور احسن سے نہیں کیا۔ البتہ انہیں ہمیشہ کی طرح سارے دن کی روداد ضرور سنائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مسٹر سون جاہ تو کہاں ہیں....؟" کھانے کی میز پر بیٹھتے ہی اس نے ملازم سے پوچھا۔
"وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہیں' امید ہے آپ کے کھانا شروع کرنے سے پہلے آجائیں گے۔"
"کیا میں ان کا گھر دیکھ سکتی ہوں....؟" اس نے پوچھا۔

"جی میڈم ضرور..... آئیں میرے ساتھ۔" ملازم بہت مودب تھا۔
"نہیں' میں اپنے طور پر دیکھنا چاہتی ہوں میرا مطلب اکیلے۔" اس نے ملازم کو منع کیا۔
"میں بھی ساتھ آتا ہوں ہنی!" عبید کھڑا ہو گیا۔
"نہیں تم احسن کے ساتھ رکو..... میں بس تھوڑی دیر میں آئی۔" وہ کہہ کر جلدی سے نکل آئی۔ اسے یقین تھا کہ کاغذ کا وہ ٹکڑا اسی کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ گھر میں واقعی کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئی شاید وہ کچن تھا۔ وہاں پڑے برتن' چولہا اور کوئلوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا۔ اس نے آہستہ سے کوئلوں کو ہاتھ لگایا وہ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ اس نے ایک کوئلہ اٹھا کر کچی دیوار پر

I hate you Mr.othello

لکھ دیا (میں تم سے نفرت کرتی ہوں مسٹر اوتھیلو) ایسا کرنا کافی اچھا لگا تھا۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ وہ شاید اس کا اسٹڈی روم تھا۔ دیوار کے اندر ہی کچی اینٹوں کی ایک الماری بنائی گئی تھی' جس میں کتابیں نفاست سے چنی گئی تھیں۔ اس نے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک کتاب کھینچ کر نکالی۔ اس نے ٹائٹل پڑھا۔ کتاب کافی بوسیدہ اور پرانی تھی۔ رائٹر کا نام بھی تھوڑا نیچے کر کے لکھا تھا "Degal Arim" اور سن اشاعت 1854ء تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا کہ وہ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے۔ پر وہاں تو کوئی بھی مسلمان نہیں تھا۔ اس کا تجسس عروج پہ پہنچ گیا تھا۔ اس نے کتاب واپس اس کی جگہ پر رکھ دی۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر لکڑی کی میز کے نیچے پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے باکس کی طرف گئی۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ باکس نکال لیا۔ باکس کافی پرانا تھا اور اس پہ تالا نہیں تھا۔ باکس کا ڈھکن اٹھاتے ہی اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ اندر اس کے ٹوٹے سینڈل تھے۔ ان پر مٹی کی ایک باریک سی تہہ بھی نہیں تھی۔ جبکہ اتارتے وقت اس نے دیکھا تھا کہ وہ بہت زیادہ گرد آلود تھے۔ اس کا تو یہی مطلب تھا کہ انہیں بہت اچھے طریقے سے صاف کر کے رکھا گیا ہے۔ وہ دو تین لمحوں تک حیرانی سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر انہیں دوبارہ باکس میں رکھ کر باکس میز کے نیچے کر دیا۔ اب اس نے لکڑی کی میز کی واحد دراز کو کھولا۔ اندر کچھ کاغذات تھے۔ کاغذات کو الٹ پلٹ کرتے اس کے ہاتھ "سوری" کا وہ کارڈ لگا جو وہ اسے دے چکی تھی۔ مگر وہ ہرگز ایسا نہیں تھا جیسے دیا گیا تھا۔ اس پر انگلش میں "ام ہانی" اتنی مرتبہ لکھا تھا' جتنی مرتبہ لکھا جا سکے۔ اس کارڈ پر کوئی بھی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں اس کا نام نہیں لکھا تھا۔ حیرانی سے اس کارڈ کو تکتے ہوئے اس نے کئی پہلوؤں پر سوچا "کیا؟ اور کیوں؟" اس کے سامنے دو سوال تھے۔ کئی لمحوں تک وہ ہل بھی نہیں سکی تھی۔ اچانک قدموں کی چاپ ابھری۔ اس نے جلدی سے کارڈ رکھ کر دراز بند کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کوئی ملازم تھا جو آگے بڑھ گیا تھا۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ واپس کھانے کی میز پر آ گئی۔ سون جاہ تو ابھی نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے تاثرات نارمل رکھے اور عبید کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئی۔ مگر دماغ کے اندر جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ جو بھی ہوا تھا یا ہونے جا رہا تھا' وہ بالکل ٹھیک نہیں تھا۔ کم از کم اسے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔
"مسٹر سون جاہ تو آج کھانے پر نہیں پہنچ پائیں گے' وہ آپ سب سے معذرت خواہ ہیں۔" ملازم کے اطلاع دینے پر ان لوگوں نے کھانا شروع کر دیا۔ مگر وہ تو کہیں اور پہنچی ہوئی تھی۔ عبید نے اسے ایک دو بار ٹوکا کہ ٹھیک سے کھاؤ۔ احسن اس کا مذاق اڑاتا رہا کہ روٹی سامنے نہیں رکھی گئی۔ اس وجہ سے وہ برا مان گئی ہے۔ وہ رات بہت عجیب گزری تھی۔ سوتے جاگتے اس نے کئی مرتبہ ان سب واقعات کو سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھی۔ اسے تسلی تھی کہ واپس جانے میں صرف دو دن ہیں۔ دروازے سے

نکل کر وہ ایک ہی گلی مڑی ہو گی کہ سامنے سے وہ آتا دکھائی دیا۔ وہ وہیں ٹھٹک کر رک گئی۔ رات ہونے والے انکشافات اتنے معمولی نہیں تھے کہ ذہن سے محو ہو سکتے۔
"میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ام ہانی نے پُرسوچ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اسے ہمیشہ آپ کہتا تھا۔
"کیوں خیریت.....؟" اس نے جان بوجھ کے لہجے کو تیکھا کیا۔
"نہیں' خیریت نہیں ہے۔" مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اسے وہ زہر لگا۔
"کیوں..... کیا قیامت آ گئی ہے۔" ام ہانی نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے لفٹ نہیں کروائے گی۔
"ہانو' قیامت ہی آ گئی ہے۔" اس کی ہنسی ہنوز برقرار تھی۔
"جلدی بولو' میرے پاس وقت نہیں ہے اور اب دانت اندر کر کے بات کرنا مجھ سے۔" اس نے پہلے والے انداز میں ہی کہا تھا۔
"میں یہاں کا سردار ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ مہمان نوازی میں' میں نے کوئی کوتاہی کی ہے' تمہیں مجھ سے تھوڑا تو عزت سے پیش آنا چاہیے۔" وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"میں نے کہا ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے' اس لیے بہتر ہو گا کہ آنے کا مقصد بیان کرو۔"
"ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ چلو' تمہیں کچھ دکھانا ہے۔" وہ جیسے سمجھ گیا تھا کہ اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔
"مثلاً "کیا.....؟" وہ بالکل متوجہ تھی۔
"کہا نا کہ بتانے والی چیز نہیں ہے صرف دکھانے والی ہے۔" وہ کہتے ہوئے چل پڑا اور وہ اس کے پیچھے چل دی۔ شاید وہ خود بھی اسے کھوجنا چاہتی تھی۔ راستے میں ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ ٹائیجر ندی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔

ام ہانی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔
"یہ دیکھو' یہ میری بوٹ ہے' اچھی ہے نا؟" اس نے کشتی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
"جلدی آؤ..... لاؤ ہاتھ دو۔" بیٹھ کر اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا' وہ حیرت کی تصویر بنی اسے دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔
"یہ میں نے مسٹر فرنیک سے خریدی تھی۔" بوٹ نے ایک ہچکولا سا لیا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔
"تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو۔" ام ہانی نے وہی سوال کیا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔
"تھوڑی دیر میں پتا چل جائے گا۔" اس نے بوٹ کی رفتار سیٹ کرتے ہوئے کہا' ماہی گیر اب نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ وہ کافی آگے تک آ گئے تھے۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی ہے۔ وہ ایک سیاہ فام پر کیسے بھروسا کر سکتی ہے۔ اور عبید اور احسن کو بھی نہیں پتا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔ اردگرد سمندر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ رونے والی ہو گئی۔
"بوٹ واپس موڑو' ابھی اسی وقت۔" اس نے سون جاہ تو کا کندھا زور سے ہلایا۔
"مسٹر جاہ..... میں کہہ رہی ہوں ابھی بوٹ کو واپس موڑو۔" اس نے اب کی بار زور سے کہا۔
"اب بس تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس نے پیچھے مڑ کے اس اطمینان سے جواب دیا کہ اسے آگ لگ گئی۔ وہ کتنی پریشان تھی اور یہ..... اس کا دل چاہا کہ کوئی چیز اٹھا کے اس کے سر پر مارے۔
"کیا تم بہرے ہو..... میں تمہارا حشر برا کر دوں گی۔" ام ہانی کے لیے غصہ ہمیشہ ناقابل برداشت ہوتا تھا۔
"ہش!" سون جاہ تو نے منہ پہ انگلی رکھ کے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
"گھٹیا انسان! تم پر بالکل بھی کسی کی بات کا اثر نہیں ہوتا' میں تمہیں....." الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اسے دونوں بازوؤں

سے پکڑ کے پانی میں لٹکا دیا۔ اس کے پیر پانی کو چھو رہے تھے اور پاجامہ ٹخنوں سے اوپر تک گیلا ہو گیا تھا۔

"اب تم تھوڑی تمیز سیکھ جاؤ گی۔" سون جاہ تو کی آواز اس کی حیران سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ابھی تک بے یقینی کی حالت میں تھی کہ وہ اسے گہری ندی میں گرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"تم واقعی افریقہ کے بدتمیز اور بدصورت وحشی ہو۔" غصے سے کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے اس کے ہاتھوں پر جما لیے کہ کہیں وہ واقعی چھوڑ نہ دے۔

"تم باز نہیں آؤ گی۔" کہتے ہوئے سون جاہ تو نے اس کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا، پورے جسم کا وزن اب صرف ایک بازو پر تھا جس میں مسلسل کھنچاؤ پڑ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں تک ندی کے اندر تھیں۔ وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

"تمہارا سفید گوشت اور تازہ خون یہاں کی شارک مچھلیوں کو بہت پسند آئے گا۔" سون جاہ تو نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی چھوڑنا چاہا مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"نہیں پلیز... آئم سوری پلیز...." وہ رو پڑی تھی، اس کا ریشمی دوپٹہ گلے سے پھسل کر ندی میں گر گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی ورنہ دوپٹہ پکڑ لیتی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر کھینچ کر اوپر کر لیا۔

"م.... میرا دوپٹہ۔" اس نے روتے ہوئے دوپٹے کی طرف اشارہ کیا جو ندی میں بہا جا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں .... تم دوپٹے کا استعمال کون سا کرتی ہو، ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اطمینان سے جواب دیتے ہوئے اس نے پھر سے سیٹ سنبھال لی تھی۔

"مجھے نہیں پتا، مجھے دوپٹا چاہیے جب میں واپس جاؤں گی تو سب کیا کہیں گے، مجھے دوپٹا چاہیے بس۔" اب وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بوٹ واپس موڑ لی۔ دوپٹے کے پاس پہنچ کر ایک لمبی سی چھڑی سے دوپٹا اٹھایا اور چھڑی اس کی طرف بڑھا دی۔

اس نے چپ چاپ دوپٹہ اتار کے اپنے اردگرد لپیٹ لیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ دوپٹہ۔ رسّی کی مانند اس کے گلے سے لپٹا تھا۔ سون جاہ تو اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس کی بوٹ کافی آرام دہ تھی۔ سورج پوری طرح نکل کے اب ندی کے پانی کو چمکا رہا تھا۔ کافی آگے تک جا کے اس نے رفتار مدھم کر لی تھی۔ اس نے بوٹ کو کنارے کے ساتھ لگایا اور باہر نکل آیا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بوٹ کو باندھ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ چپ چاپ ہاتھ پکڑ کر بوٹ سے باہر نکل آئی۔ کیمرہ اس کے گلے میں تھا اور بیگ دوسرے ہاتھ میں۔ اس کا سیٹلائٹ موبائل رہائش گاہ پہ ہی رہ گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے چلتا گیا۔ ام ہانی نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ سامنے ایک چھوٹی سی کھنڈر نما عمارت تھی۔ وہ اسے لے کر وہاں چلا گیا۔ شاید وہ کوئی قدیم مندر تھا۔ سون جاہ تو نے اسے وہاں بنے چبوترے پر بٹھا دیا۔

"ہانی.... اگر میں تمہاری مورتی بنا کر یہاں رکھ دوں تو لوگ تمہیں حسن کی دیوی سمجھ کے پوجنا شروع کر دیں گے۔" اس کی اتنی جامع تعریف کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔

"مجھے کیا دکھانا چاہتے تھے .... ؟" اس نے اپنی تعریف کو نظرانداز کر کے پوچھا۔

وہ ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مندر کا غیر ضروری سامان تھا۔ وہ وہاں سے کچھ نکال رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اپنے ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔ اس کے ہاتھ میں قرآن پاک کا بہت ہی پرانا نسخہ تھا۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ اس کی جلد نہیں تھی۔ اوراق اتنے خستہ ہو چکے تھے کہ ہاتھ لگاتے ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے قرآن پاک سے نظریں اٹھا کر سون جاہ تو کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمک رہی تھیں اور ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کتنی دیر وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ وہ بہت پیار

سے قرآن پاک کے اوراق پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"تم نے کب اسلام قبول کیا ؟" کافی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

"دس سال پہلے، جب میں بیس سال کا تھا۔ مسلمان یہاں سیاحت کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اسلام کے بارے میں بتایا۔ میں حیران تھا کہ کوئی ایسا مذہب بھی ہے جسے میرے رنگ، نسل سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسلام کی محبت میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں اس کی رحمت میں آ گیا۔" اب وہ باقاعدہ رو رہا تھا۔

"اور یہ قرآن پاک... اس کے صفحات تو بہت خستہ ہو رہے ہیں۔" ام ہانی نے قرآن پاک کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"یہ بھی دس سال پرانا ہے، جب بھی ہمارے علاقے میں مسلمان آتے ہیں تو میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے پاس قرآن پاک ہو، مگر دس سالوں سے ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔" سون جاہ تو نے اسے پانی پانی کر دیا تھا۔ ان کے گھر میں کتنے ہی قرآن پاک غلافوں میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ وہ بس کبھی کبھار ہی کھلتے تھے۔ کسی کی وفات کے موقع پر۔ وہ حقیقت میں نظریں نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

"میں نے ابھی اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ مگر بہت جلد میں ایسا کر دوں گا۔ پھر میں چوری چھپے نماز نہیں پڑھا کروں گا۔ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنواؤں گا، اور ترجمے والا قرآن پاک منگواؤں گا۔ میرے پاس دعاؤں کے دو ورق بھی ہیں۔ میں انہیں صبح شام پڑھتا ہوں۔" آنسو اب اس کے گالوں پہ بہہ رہے تھے۔

"تم نے عربی پڑھنا اور نماز پڑھنا کہاں سے سیکھا؟" ام ہانی نے اس کے آنسوؤں سے تر چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب سمجھی تھی کہ وہ اتنا مہذب کیوں ہے۔

"یہاں مسلمان سیاح آتے رہتے ہیں۔ اور میں ہر مسلمان سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہوں۔" اس نے بائیں ہاتھ سے آنسو صاف کیے۔

"تم نے مجھ سے کیا سیکھا.... ؟" ام ہانی کو یقین تھا کہ وہ کہے گا کہ کچھ بھی نہیں۔

"تم نے مجھے پیار کرنا سکھایا ہانی...." سون جاہ تو نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اتنے کھلے انداز میں اظہار تو عبید کے علاوہ کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کے اس طرح اچھلنے پہ وہ تھوڑا سا ہنسا مگر ہاتھ نہیں ہٹایا۔

"اسلام لانے کے بعد، تم میری زندگی میں رونما ہونے والا دوسرا اچھا واقعہ ہو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر پھر سے آنسو صاف کیے۔ وہ بہت شکست خوردہ لگ رہا تھا۔

"تم وہ واحد لڑکی ہو جو مجھے ہر روپ میں اچھی لگتی ہے، روتے، ہنستے، چیختے، چلاتے، غصہ کرتے، میں نے تمہیں ہر روپ میں دیکھا ہے اور پھر تمہارے ایک ایک روپ کو سوچا ہے۔ مجھے پتا ہے، یہ سب باتیں میری اوقات سے بڑھ کر ہیں، میں کتاب اللہ کو ہاتھ میں لے کر تمہیں پرپوز کرتا ہوں۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت و جامد تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس کی جانب پلک جھپکے بنا دیکھ رہی تھی۔ قرآن پاک اس کے ہاتھ میں تھا، وہ کچھ بھی جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں تمہارے بغیر رہوں گا تو مر جاؤں گا.... یہ صرف جملہ نہیں ہے، یہ دیکھو، میرے ہاتھ میں مقدس کتاب ہے، مجھے شروع سے لے کر آج تک تمہاری کہی ہوئی ایک ایک بات یاد ہے، مجھے پتا ہے کہ ایسا صرف خواب میں ہی ہو سکتا ہے، پر مجھے اپنے.... رب پر بہت بھروسہ ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، وہ ہونق بنی اسے دیکھتی رہی اور اس کی باتیں سنتی رہی۔

"میں روزانہ یہاں آ کے نماز پڑھتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ تم میرے دل، دماغ سے نکل جاؤ۔ اس جگہ یہ پہلے میں صرف اللہ اور اس کی محبت کو پکارتا تھا، تم میری دوسری پکار ہو۔" ضبط کے باوجود آنسو اس کی

آنکھوں سے نکل رہے تھے۔

"اسے رکھ آؤ.... بے ادبی ہو رہی ہے۔" بہت دیر کے بعد وہ یہ لفظ بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

"او ہاں، مجھے اس بات کا خیال نہیں رہا۔" وہ روتے ہوئے تھوڑا سا مسکرایا اور پھر قرآن پاک کو اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

تم نے جو کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا میرے لیے بھیجا تھا، اس پہ کیا لکھا ہے؟"

"تمہیں کس نے بتایا۔

میں نے بھیجا ہے؟"

"اس بچے نے مجھے پکڑایا۔ اور کہا سردار۔"

"کیا اس نے واقعی یہ کہا؟"

"ہاں یہی کہا تھا۔" ام ہانی نے کندھے اچکائے۔

"ام ہانی! جھوٹ نہیں بولتے، اس بچے کو اردو نہیں آتی۔" سون جاہ تو کی آواز نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ پر اسے اس جھوٹ کو سچ تو کرنا تھا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ شاید اس نے تمہارا نام لیا تھا، ہاں اس نے کہا تھا۔ سون جاہ تو۔" اس نے اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہانی! وہ بچہ پیدائشی گونگا اور بہرا ہے۔" ام ہانی کو لگا کہ وہ کبھی اس سے نظریں نہیں ملا پائے گی۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جب سے وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ وہ ان ہی دو کاموں میں مشغول تھا۔ کبھی رو دیتا اور کبھی ہنس پڑتا۔

"اب بتاؤ، اس بچے نے کیا کہا تھا....؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا تھا، بس وہ کاغذ پکڑا دیا تھا۔" وہ کافی شرمندہ تھی۔

"شاباش، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، اب میں بھی ایک سچ بولوں....؟" اس کے کہنے پہ ام ہانی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ بچہ گونگا اور بہرا نہیں ہے۔" اس کے مسکرا کر بتانے پہ وہ رونے والی ہو گئی۔

"مجھے واپس جانا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے مجھے جواب نہیں دیا، گو کہ میں جانتا ہوں مگر تم اپنے منہ سے کہہ دو تو شاید مجھے کوئی آس نہ رہے۔" وہ بھی اٹھ گیا تھا۔

"میں بستی میں پہنچ کر بتا دوں گی، مجھے تھوڑا سوچنے دو۔"

"تم میری امیدوں کو بڑھا رہی ہو۔" وہ عجیب سی مایوسی سے مسکرایا۔

"کیا میں بوٹ کے پاس پہنچنے تک تمہارا ہاتھ پکڑ لوں۔" سون جاہ تو کا لہجہ التجا آمیز تھا وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی اور پھر ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے اس نے تھام لیا۔

"تمہارے ساتھ ایسے چلنا گویا ساری کائنات کو مٹھی میں لے کر چلنا ہے۔" وہ پھر سے دکھ بھرے انداز میں مسکرایا۔ ایک لمحے کے لیے ام ہانی کا دل کیا کہ وہ اسے ہنسنے سے روک دے۔ عجیب مایوسی اور بے بسی تھی اس کی ہنسی میں، وہ جب بھی ہنستا، اس کا دل دکھتا۔

وہ سارے راستے ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوئے تھے۔ سون جاہ تو کبھی کبھار اس کی طرف دیکھ لیتا۔ سارا سفر ایسے ہی کٹا تھا۔ بستی میں پہنچ کر اس نے اپنا کیمرہ اور کلچ اٹھایا اور بوٹ سے باہر آگئی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"تم نے جواب نہیں دیا....؟" جب وہ رہائش گاہ کے قریب پہنچ گئے تو سون جاہ تو نے پوچھا۔

"میں انکار کرتی ہوں۔" ام ہانی نے زمین کی جانب نظریں کر کے کہا تھا۔ وہ اس کے جواب سے باخبر تھا مگر پھر بھی انکار نے جیسے اسے بکھیر دیا تھا۔

"تم نے یہ بات مجھے وہاں کیوں نہیں بتائی؟" سون جاہ تو کے ایک ایک لفظ میں درد تھا۔

"مجھے لگا اگر میں وہاں انکار کر دوں گی تو تم مجھے نائیجر ندی میں پھینک دو گے۔" وہ جواب دے کر آگے بڑھ آئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ ساری رات بھی اس نے جاگ کے گزاری تھی۔ وہ اپنی ہر بات میں سچا تھا اور محبت تو آنکھوں سے چھلکتی ہے۔ عبید اور احسن کے زور لگانے کے باوجود وہ

رات کا کھانا نہیں کھانے گئی تھی' وہ اس سے دوبارہ نہیں ملنا چاہتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ تیار ہو گئی۔ اسے کاہنہ سے ملنا تھا' کیمرہ اور کلچ اٹھا کر وہ گھر سے نکل آئی۔

"کہاں جارہی ہو ہانی؟" وہ پتا نہیں کہاں سے نمودار ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ ام ہانی نے اس کی جانب دیکھا' وہ ہمیشہ کی طرح پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ آج اسے یہاں آئے آٹھواں دن تھا۔ ان سارے دنوں میں ام ہانی نے صرف ایک مرتبہ اسے لمبی شرٹ میں دیکھا تھا۔

"میں کل واپس جارہی ہوں۔" ام ہانی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔

"جانتا ہوں.... مگر کل کس نے دیکھا ہے' ہو سکتا ہے تم نہ جاسکو۔" اس کی بات سن کر وہ دھک سے رہ گئی۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو.... میں یہاں مرجاؤں گی۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

"تم چلی گئیں تو میں مرجاؤں گا.... میں قسم کھاتا ہوں۔" کاہنہ کا گھر پیچھے رہ گیا تھا' وہ دونوں بے مقصد چلتے جارہے تھے۔

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔" اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ اس کے ایسے جوابوں پہ اکثر اس کا چہرہ اتر آجاتا تھا۔ پھر اس نے اپنے کلچ سے وہ کاغذ نکالا اور اس کے سامنے کردیا۔

"اس کا مطلب نہیں بتایا تم نے؟"

"جسم کی تشفی کرنا آسان ہے مگر دل کی نہیں۔" اس نے آہستہ سے اس کا ترجمہ بتایا۔

"تم نے یہ مجھے کیوں بھیجا؟" اس نے کاغذ کو تہہ کر کے واپس کلچ میں رکھا۔

"یہ اس لمحے کی بات ہے جب مجھ پہ کھلا کہ میں تمہاری محبت میں مبتلا ہوں' اس لمحے کے بالکل اگلے لمحے میں' میں نے یہ لکھ کر تمہیں بھیج دیا' لکھتے وقت میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور یہ کاغذ مجھے بہت مشکل سے ملا تھا۔" شاید اس نے کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا ہو گا۔

"کاش تم میرے ساتھ اتنی ہی وفادار ہوتیں جتنی ڈیسڈیمونا اوتھیلو کے ساتھ تھی۔" وہ چلتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں آگئے تھے۔ ام ہانی کو پتا تھا کہ اس نے کچن میں لکھا ہوا وہ جملہ پڑھ لیا ہے۔

"تم چاہتے ہو کہ میں ویسی ہی موت مروں جیسی ڈیسڈیمونا مری تھی۔"

"نہیں' اس بار شاید اوتھیلو مرے گا۔" وہ تھوڑا سا ہنسا۔

"اللہ کرے۔" ام ہانی نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"آج کا سارا دن میرے ساتھ گزارو' میں تمہیں اپنی لائبریری دکھاؤں گا' ہم ساتھ چائے پئیں گے اور۔۔"

"سوری' مجھے اور بہت سے اہم کام ہیں۔" ام ہانی نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔

"تمہاری یاد تو بہت مہربان ہوتی ہے ہانی! تم بالکل اس کے برعکس ہو۔" وہ تنگ گلی سے نکل چکے تھے۔ وہ اکثر اس کی ایسی باتوں کے جواب نہیں دیتی تھی۔

"پیار بہت پیچیدہ ہوتا ہے' ہے نا ہانی' صرف تین دن میں اس کا انسان پہ حاوی ہو جانا کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔" وہ اس دن والی چارپائی کے پاس آکے رک گیا تھا۔ وہ بھی رک گئی مگر اس کا بیٹھنے کا ارادہ نہیں تھا سو اس نے قدم آگے بڑھا لیے۔

"تم بہت بے وقوف ہو جو یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے لیے اس دھول مٹی اور بدصورت لوگوں میں ہمیشہ کے لیے رہ جاؤں گی۔" جاتے جاتے ام ہانی نے پلٹ کر کہا تھا۔

"میں اللہ سے دعا کروں گا کہ وہ کوئی موقع پیدا کر کے تمہیں میرے لیے یہیں رہ جانے پہ مجبور کر دے۔" اس کی آواز میں آس' امید اور خوف کا تاثر تھا۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ آئی۔ مگر اس کی باتیں ام ہانی کے ذہن سے چپک کے رہ گئی تھیں۔

اس کا رونا' التجا آمیز نظریں اور اس کی دکھ بھری مسکراہٹ' وہ ان سب چیزوں کو بھلانے میں ہلکان ہو

گئی تھی۔ سارا دن وہ ڈوگون کی گلیوں میں ماری ماری پھرتی رہی اور شام کو ضد کر کے عبید کے ساتھ کھیتوں کی جانب نکل گئی۔

"عبید! پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔" مسلسل گھاس اکھیڑتے ہوئے اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہو رہا ہے ہنی....؟ ادھر دیکھو میری طرف۔" عبید نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

"مجھے پتا نہیں کیوں رونا آرہا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ بغیر آواز کے نہیں رو سکی تھی۔ عبید بہت پریشان ہو گیا تھا وہ بار بار اس سے وجہ پوچھتا اور وہ جواباً" مزید شدت سے رونا شروع کر دیتی۔ بہت دیر کے بعد اس کا دل ہلکا ہوا تو وہ چپ ہوئی۔

"تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھنا میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے' آئندہ ایسے روؤ گی تو مجھے بھی رلا دو گی۔" وہ کتنی ہی دیر اس کے آنسو صاف کرتا رہا اور اسے تسلی دیتا رہا۔

اب وہ پہلے سے کافی بہتر تھی۔ اندھیرا چھانے لگا تھا۔ انہوں نے واپسی کے لیے قدم موڑ لیے۔ اچانک اسے گھاس میں سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے عبید کی توجہ اس جانب دلائی مگر وہ لاپروائی سے چلتا رہا اور پھر کچھ ہی پل بعد اسے عبید کی چیخ سنائی دی۔ وہ اپنی ٹانگ کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"عبید! کیا ہوا....؟" اس نے چلا کر پوچھا۔

"پاؤں میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں جیسے کسی جانور نے کاٹ لیا ہو۔" درد کی وجہ سے اس سے بولنا محال تھا۔ اس سے پہلے وہ آگے ہو کر دیکھتی' عبید پیچھے کی جانب گر چکا تھا۔ وہ چیخ کر آگے بڑھی۔ وہ بالکل بے سدھ سا ہو گیا تھا۔

"کوئی ہے....؟ کوئی ہے' پلیز۔" ام ہانی نے اپنا پورا زور لگا کر مدد کے لیے پکارا تھا آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر آواز دی۔ اس مرتبہ اسے اپنی جانب دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ سون جاہ تو تھا۔ شاید وہ پاس ہی کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔

"اسے ممبا نے کاٹ لیا ہے' اس کا بچنا ناممکن ہے۔" سون جاہ تو نے زخم دیکھتے ہوئے کہا۔

"ممبا کیا....؟" عبید کا سر اس کی گود میں تھا اور وہ رو رہی تھی۔

"ممبا مطلب کوبرا ناگ۔" ام ہانی کے اوسان خطا ہوئے تھے۔

"کوئی تو طریقہ ہو گا' پلیز' میں تم سے بھیک مانگتی ہوں۔" آنسوؤں کی وجہ سے بولنا محال تھا۔

"صرف ایک ہی طریقہ ہے' بدلے میں تمہیں یہاں رہنا ہو گا' میرے پاس' ہمیشہ کے لیے۔" محبت واقعی خود غرض ہوتی ہے ام ہانی سمجھ گئی تھی۔ اس نے "ہاں" میں سر ہلایا۔

"ایسے نہیں' اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کے وعدہ کرو۔" شاید اسے اس کے مکرنے کا ڈر تھا۔

"میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کے وعدہ کرتی ہوں' پلیز' میرا یقین کرو' اسے بچالو' میں تمہارے پاس رہوں گی' میں وعدہ کرتی ہوں۔" اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس نے ام ہانی سے اس کا میٹل کا کیچو مانگا اور دندانوں سے زخم کو گہرا کیا اور پھر زخم کے اوپر اپنا منہ رکھ دیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور عبید کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی جس کی سانسیں مدہم تھیں۔ سون جاہ تو زخم سے زہر چوس چوس کر پھینکتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد مقامی سیاہ فام بھی پہنچ گئے تھے' وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد عبید کو جھنجھوڑ کے دیکھتی اور اس کی دھڑکن کو محسوس کرتی' اس کا رواں رواں جیسے دعا گو تھا۔ اب وہ ایک اور جگہ پہ زخم لگا کے ویسے ہی زہر نکال رہا تھا۔ اس کے پہلے زخم پہ مقامی لوگوں نے ایک مرہم سا لگا دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ زہر کو ہڈیوں سے نکال لاتا ہے۔ اب سون جاہ تو کی حالت غیر ہو رہی تھی اس نے بہت سارا زہر ہضم کر لیا تھا۔ عبید کی دھڑکن کچھ نارمل ہوئی تھی اور اس کے لب ہلے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد مسٹر فرینک اپنی گاڑی کے

ساتھ وہاں موجود تھے۔ ان دونوں کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے تھے۔ وہ سارے راستے روتی گئی اور اب وہ دونوں ایمر جنسی میں تھے۔ تقریباً" آدھے گھنٹے بعد احسن بوکھلایا ہوا ہسپتال پہنچا تھا۔ احسن کی ڈھیروں تسلی دینے پہ بھی وہ ویسی ہی رہی' بند کمرے میں عبید کے ساتھ کیا ہو رہا تھا' اسے خبر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کمرے سے نکلا تھا۔ وہ سفید فام تھا۔

"مبارک ہو! آپ کا مریض خطرے سے باہر ہے۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔

"کک کون سا مریض...؟" ام ہانی نے دل تھام کر پوچھا۔

"ایشین۔" ڈاکٹر کی آواز نے اسے خوش خبری سنائی' وہ جیسے مر کے زندہ ہوئی تھی۔ وہ بھاگ کر عبید کے روم میں پہنچی۔ اس کی حالت خراب تھی پر وہ ہوش میں تھا' اسے دیکھ کر وہ زارو قطار رونا شروع ہو گئی۔

"ہنی! کچھ نہیں ہو گا' ہم کل واپس چلے جائیں گے۔" عبید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اس بات پر اس نے سسکی لی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ اپنا آپ رہن رکھوا کے اس کی جان بچائی گئی ہے۔ یہاں ہمیشہ کے لیے رہنے کا خیال اسے بے موت مار رہا تھا۔ نجومی اور کاہنہ ٹھیک تھے' وہ کبھی پاکستان نہیں جا سکتی تھی' ممی' پاپا' عبید ان سب کو چھوڑنا تھا بلکہ بھولنا تھا' کاش عبید کی جگہ یہ سانپ نے اسے ڈسا ہوتا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے' سون جاہ تو کی حالت اسی طرح خراب تھی۔ بارہ بجے کے قریب ڈاکٹر نکلا اور کہا کہ مریض ام ہانی کو بلا رہا ہے۔ پتا نہیں اب اسے کیا کہنا تھا۔ وہ سوچتے ہوئے اس کی طرف بڑھ گئی۔ بیڈ پر لیٹا سون جاہ تو اسے صدیوں کا بیمار لگا۔ اس نے اشارے سے ام ہانی کو اپنے پاس بلایا اور پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا معدہ دو مرتبہ واش ہو چکا ہے' پھر بھی ڈاکٹرز پر امید نہیں ہیں' اگر میں مر گیا تو تم اس وعدے سے آزاد ہو۔" آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے' وہ خود بھی رو دی۔

"مجھے پتا ہے' اب تم میرے مرنے کی دعا کرو گی۔" وہ پھر وہی درد بھری ہنسی ہنسا۔

"تم دنیا کی سب سے خوب صورت اور اچھی لڑکی ہو' تمہارے ساتھ اس دھول مٹی میں رہنا میرے لیے جنت میں رہنے کے برابر ہو گا' میری ہر گزرتی سانس تمہارے پیار میں اضافہ کر رہی ہے' تم اگر برا نہ مانو تو یہیں میرے پاس بیٹھی رہو۔" آنسو برابر اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔

"مجھے عبید کے پاس رکنا ہے' میں دوبارہ آؤں گی۔" وہ بھی روتے ہوئے اٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا تھا' سون جاتا تو مر جائے تو اسے نجات مل جائے گی مگر پتا نہیں کیوں اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ دل میں عجیب سا درد اٹھا تھا۔

"ان کے پاس صرف چند سانسیں ہیں' وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" ڈاکٹر کی آواز پہ وہ چونکی تھی' وہ خود بھی اپنے احساسات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی' وہ واقعی مرنے والا تھا۔ ام ہانی نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے پہ پھیرا۔

"ہانی' وعدہ کرو' اچھی مسلمان بن کے زندگی گزارو گی۔" ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں سون جاہ تو نے کہا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" وہ زارو قطار رو رہی تھی۔

"ایک بار کہہ دو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔"

"میں تم سے واقعی پیار کرتی ہوں جاہ!" مسلسل رونے سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی کو مرتے دیکھ رہی تھی۔

"ہانی! مجھے کلمہ پڑھاؤ۔" سون جاہ تو کے کہنے پر اس نے آہستہ سے اسے کلمہ پڑھایا' وہ چند لمحے اسے تکتا رہا۔ زہر اس کی رگ رگ میں پھیل گیا تھا۔ وہ مسلسل روتے ہوئے اس کا ہاتھ دبا رہی تھی اور دوسرا ہاتھ اس کے چہرے پہ پھیر رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا مگر پلکیں نہیں جھپک رہا تھا۔

"سون جاہ!" ام ہانی نے اسے جھنجھوڑا' وہ اپنی زندگی میں اتنا کبھی نہیں روئی تھی۔ وہ ویسے ہی پتھرائی

آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چیخوں نے ہسپتال سر پہ اٹھا لیا تھا۔

"میڈم! اٹھ جائیں یہاں سے پلیز۔" ایک سفید فام ڈاکٹر نے سون جاہ تو کی آنکھیں بند کیں اور اسے اٹھنے کے لیے کہا۔ وہ جیسے نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

صبح کے تین بجے تھے۔ اس نے احسن سے کہا۔

"سون جاہ تو مسلمان تھا وہ اس کی نماز جنازہ پڑھائے۔"

"ہمارے پاس کفن نہیں ہے ام ہانی!" احسن بھی بہت غم زدہ تھا۔

"میرا وائٹ کاٹن کا سوٹ ہے' وہ میں نے نہیں پہنا' اس کا دوپٹا..." وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔ پھر وہ لوگ اس کی ڈیڈ باڈی کو لے کر قبیلے میں واپس آ گئے۔ قبیلے کے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ وہ خود بھی سب سے نظریں چراتی آنسو بہا رہی تھی۔ کچھ مقامی سیاہ فام کو اس کے مسلمان ہونے کا علم تھا۔ انہوں نے اس کی قبر کھودی' احسن نے اسے غسل دیا تھا اور پھر اسے ام ہانی کے سفید کاٹن کے دوپٹے میں لپیٹ کر قبر میں اتار دیا گیا۔ عبید ٹھیک نہیں تھا مگر اس نے ضد کر کے نماز جنازہ میں شرکت کی تھی۔ پانچ بج گئے تھے' انہیں نو بجے یہاں سے نکلنا تھا۔

وہ عبید اور احسن کو رہائش گاہ پہ چھوڑ کے خود سون جاہ تو کے گھر آ گئی۔

"اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ پائے گی' ساری دنیا چھان لینے کے بعد بھی۔" اس خیال نے اسے پھر سے رلا دیا تھا۔

اس کے اسٹڈی روم سے ام ہانی نے اپنا کارڈ اٹھایا اور اس کی اوریجنل رائٹنگ میں کچھ اوراق ڈھونڈنے پر اسے دعاؤں کے وہ دو ورق بھی مل گئے جنہیں وہ روز پڑھتا تھا۔ یہ چند چیزیں اٹھا کے وہ واپس آ گئی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم ڈوگون پہ مصیبت لے کے آؤ گی۔" یہ کاہنہ کی آواز تھی' وہ رو رہی تھی۔

"اس نے تمہارے لیے یہ سب کیا' وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں بچ پائے گا ممبا (کوبرا) کے زہر سے بچاؤ کا بس یہی ایک طریقہ ہے مگر بچانے والا خود مر جاتا ہے۔" کاہنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"وہ جانتا تھا کہ اس طرح سے وہ خود مر جائے گا' پھر بھی اس نے یہ سب کیا؟"

اس بات نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ اس نے واقعی پیار کا حق ادا کیا تھا۔

سارے راستے وہ اسے پڑھ پڑھ کے بخشتی رہی۔ وہ اسے کسی بھی طرح سے نہیں بھول رہا تھا' پاکستان پہنچتے ہی سارہ اس سے ملنے آ گئی۔ کتنی ہی دیر وہ اسے گلے لگائے کھڑی رہی۔

"شکر ہے' تم ٹھیک ٹھاک واپس آ گئی ہو۔ کتنا جھوٹا تھا وہ نجومی جو کہتا تھا کہ تم وہیں رہ جاؤ گی۔" سارہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ جھوٹا نہیں تھا۔" ام ہانی نے آہستہ سے کہا۔

"مطلب؟"

"میں وہیں ہوں' ڈوگون کے قبیلے میں' کچی مٹی سے بنی تازہ قبر کے پاس۔" ام ہانی کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔

☆

صبا خان

غربت

گھر سمیٹتے سمیٹتے دوپہر تک اس کی حالت برسوں کے مریض جیسی ہو جاتی۔ بکھرے بال پسینے سے شرابور جسم 'اتری رنگت اور دکھتا ہوا ہر جوڑ' ہر روز وہ نئے روز کی طرح نئے الفاظ سے اپنی زندگی کو کوستی رہتی تھی۔ حالانکہ وہ بڑے دھیمے مزاج کی عورت تھی۔

"ایک کپ چائے پی لوں' تاکہ میرے جسم کو کچھ آرام مل جائے۔ پتا نہیں کس وقت....."

وہ سر جھٹک کر کچن میں چلی گئی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کے اس چھوٹے سے کچن کو وہ بڑی نفاست اور ترتیب سے رکھتی تھی۔ ایک کپ چائے کے لیے استعمال ہونے والے برتن بھی دوسرے وقت پر نہیں چھوڑتی تھی۔ اسی لیے تو اس کا سارا دن کام کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس نے الماری سے پتیلی نکالی اور چولہے پر رکھ کر اس میں آدھا کپ پانی اور دودھ ملا کر ابلنے کے لیے دکھ دیا۔ دو چمچے چائے کی پتی ڈال دی' کیونکہ وہ ہمیشہ چائے تیز پتی تھی۔ جیسے ہی چینی کا ڈبا کھولا دھک سے رہ گئی۔ کیوں کہ ڈبا خالی تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ تو رشید کے آنے کو طوفان سمجھ رہی تھی کہ پتا نہیں کس وقت طوفان آجائے۔ یہاں تو اس کے دماغ اور جسم کو سونامی کا سامنا تھا۔ کیونکہ رشید خان کے گھر میں کسی چیز کا ختم ہونا سونامی سے کم نہیں تھا۔

"کبھی کبھی زندگی اتنی زہریلی کیوں ہو جاتی ہے' جو پل پل مارتی رہتی ہے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"چلو باقی کے ساتھ یہ زہر بھی پی لیتی ہوں' کم از کم جسم کو کچھ حرارت تو مل جائے گی۔" وہ جیسے خود کو دلاسا دے رہی تھی' آنے والے طوفان کو سہنے کے لیے۔

ایک زوردار دھکے کے ساتھ وہ دیوار سے ٹکرا گئی۔ اس کا سر بری طرح زخمی ہوا۔ وہ اپنے پلو سے سر کو گرم پھونک سے ٹکور دیتے ہوئے اٹھ گئی۔

"کتنی بار تجھ سے کہا ہے کہ روز' روز یہ تماشا نہ کیا کرو ہر روز دو' تین چیزیں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ کدھر جاتی ہیں یہ سب' کچھ بتاؤ بیچتی یا خالہ کے ہاں بھجواتی ہے بتاؤ.... بتاؤ مجھے۔" وہ اسے بالوں سے پکڑ کر مسلسل مار رہا تھا۔

خالہ صغریٰ جو اس کی واحد رشتہ دار تھیں۔ اس شہر میں اور پڑوس میں رہنے کی وجہ سے اس کی واحد غم خوار اور ہمدرد تھیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ وقت پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔

"چھوڑ دو.... چھوڑ دو رشید' کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟" خالہ صغریٰ زبردستی اس کے بال رشید سے چھڑواتے ہوئے بولیں۔

"ہاں.... ہاں پاگل ہو گیا ہوں اور اس نے بنایا ہے۔ مجھے پاگل.... سکون سے جینے نہیں دیتی یہ مجھے.... عورت نہیں چڑیل ہے' یہ مجھے مار کر ہی دم لے گی۔" وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

"ارے کچھ پتا تو چلے یہ آج پھر کس بات پر جھگڑا ہے۔" خالہ صغریٰ زچ ہوتے ہوئے بولیں' جو ان کے روز' روز کے جھگڑوں سے تنگ آچکی تھیں۔

"کتنی بار اس منحوس کو کہا ہے' یہ سودا ذرا احتیاط سے استعمال کیا کرو' مگر اس کے ہاتھوں میں برکت نام کی کوئی چیز ہی نہیں' مہینے کا راشن دس دن میں ختم کر دیتی ہے۔"

"مہینے کا راشن...." وہ طنزیہ چیخی' جو ابھی تک خود کو گرم پھونکوں سے ٹکور دے رہی تھی۔

"تم مہینے کا لاتے کب ہو۔ ترسا ترسا کے لاتے ہو اور میں پھونک پھونک کر استعمال کرتی ہوں۔"

"بند کر اپنی بکواس۔" وہ زور سے دھاڑا۔

"جانتی ہو کتنی مہنگائی ہے' مگر تم کیسے جانو.... تم تو مہارانی بن کر اڑانا جانتی ہو۔"

"مہارانی.... ہونہہ.... اڑانا۔" اس کا انداز ایسا کاٹ دار تھا کہ رشید پھر دوڑا مارنے کے لیے۔

"چھوڑ دے خالہ مجھے.... تیرا لحاظ ہے ورنہ....." وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"ارے بیٹا بیٹھ جاؤ آرام سے' کیوں خود کو پاگل بنایا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے تیرے پاس۔ لوگ تجھے دیکھ کر رشک کرتے ہیں کہ کتنی جلدی تو نے ترقی کر لی' تو پھر کیوں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے اپنی زندگی اجیرن کرتا ہے۔" خالہ کی باتیں ہمیشہ اس پر اثر کر جاتی تھیں۔ ان کی زبان میٹھی ہی اتنی تھی کہ سارے محلے والے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

"تو کیا جانے خالہ! شیدے سے رشید خان کا سفر میں نے کتنی مشکلوں سے طے کیا ہے۔" وہ پھر سے اپنی غربت کی داستان سنانے لگا۔

"جانتی ہو بیٹا... کیوں نہیں جانتی، لیکن ایک بات ہے۔"

"محنت زندگی میں بہت سے لوگ کرتے ہیں، مگر ہر ایک کو ایسا صلہ نہیں ملتا اور جس کو مل جائے اُسے شکر کرنا چاہیے اور تم لوگ جی کتنے ہو، میاں بیوی اور ایک بیٹا... بس..."

"اسی لیے تو آگے کا سوچ رہا ہوں۔" وہ اپنی بات پہ اڑا رہا۔

"اب بھی اللہ نے دیا ہے، آگے بھی دے گا ان شاء اللہ۔"

"اس کو اللہ کی ذات پر یقین کہاں... یہ دنیا تو اس کے زور بازو پہ چلتی ہے۔ سب کو یہ رزق دیتا ہے۔" وہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی، اُبل پڑی۔

"دیکھ رہی ہو خالہ! کیسا زہر اگل رہی ہے۔ اس کی اسی نخوست اور نفرت کی وجہ سے میرے گھر میں برکت نہیں۔" اور خالہ کی ڈیوٹی لگ گئی، کبھی رشید اور کبھی نزہت کو چپ کرانے کی، مگر طوفان بد تمیزی بڑھتا گیا۔

"خالہ اسے چپ کرادو، ورنہ بہت برا ہو جائے گا آج۔"

"کیا ہو گا اس سے زیادہ برا ہونا بھی باقی ہے۔"

"تیرا غلام نہیں ہوں جو تیری بکواس سنتا رہوں گا، تجھ سے ہزار درجے بہتر کو لے آؤں گا۔"

"بس یہ ہی آخری حربہ ہوتا ہے تم مردوں کا۔"

"دیکھ تو چپ ہو جا، ورنہ میرے منہ سے کچھ نکل جائے گا۔"

"تو نکال... میں بھی دیکھوں تیری مردانگی۔"

"اچھا... میری مردانگی دیکھنا چاہتی ہے۔" وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور خالہ ان دونوں کے بیچ دوڑ دوڑ کر تھک گئیں، لیکن کسی نے اپنی زبان بند نہیں کی۔

"تو پھر سن... میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔" اس نے اپنے الفاظ تین بار دہرائے اور ایک ہی پل میں برسوں کے بنائے گھونسلے کے تنکے ہوا میں بکھر گئے۔

وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے مسلسل چھت کو گھور رہی تھی۔ جانے کس سوچ میں تھی۔ اس کے پہلو میں لیٹے بیٹے نے اسے کئی آوازیں دیں، لیکن وہ مسلسل خاموش تھی اور وہ اسے "اماں اماں" کہتے ہوئے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

"خالہ! اگر تیرے بیٹے اور بہوئیں مجھ سے تنگ آجائیں تو، تو مجھے ایدھی سینٹر یا کسی دارالامان میں بھیج دینا۔" چھت کو گھورتے گھورتے بھی اس کو اندازہ تھا کہ خالہ نماز ختم کر چکی ہیں۔

"کیوں؟ کیا کسی نے تجھ سے کچھ کہا ہے؟" خالہ ایک لمبی آہ نکالتے ہوئے آکر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"نہیں... لیکن کب تک وہ رکھیں گے خالہ، ایک نہ ایک دن تو..."

"اسی لیے تو کہتے ہیں بیٹا... کہ اپنے گھر کو اجڑنے نہیں دینا چاہیے... چاہے کیسے بھی حالات ہوں..."

"وہ کوئی گھر نہیں تھا خالہ، نہ کوئی زندگی... جب انسان کے پاس دو پیسے آجائیں، تو پھر کوئی نظر نہیں آتا، چاہے وہ اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔" اس کی آواز بھرا سی گئی۔

"اللہ خیر کرے گا۔ وہ اسباب پیدا کرنے والا ہے۔ تو پریشان مت ہو... سو جا آرام سے۔" لیکن وہ کہاں آرام سے سو سکتی تھی۔

خالہ صغریٰ کے ہاں آئے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ رشید دوسری شادی کر چکا تھا۔ ایک امیر لڑکی کے ساتھ، ہر مرد کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے... کہ امیر عورت اپنے ساتھ دولت لے کر آئے گی۔ لیکن وہ صرف اپنے امیرانہ چونچلے ہی لے کر آتی ہے۔ عقل کے ماروں کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہوتی کہ بھاری جہیز کے سہارے زندگی نہیں گزرتی اور کسی کے ماہانہ خرچ کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا، چاہے وہ آپ کا امیر کبیر سسر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے رشید کی نئی شادی پانچ ماہ ہی چل سکی اور دو ناکام شادیوں کے بعد تو مرد پر وہ لیبل لگ جاتا ہے کہ راہ چلتی بھکارن بھی اپنی بیٹی کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

"دیکھو بہن صغریٰ! میں ہمیشہ صاف بات کرتی ہوں، یہ ٹھیک کہ اصغر کی بیوی مر چکی ہے اور تین بچوں کا باپ ہے، تو نزہت کون سی جوان ہے، ایک بیٹے کی ماں تو یہ بھی ہے۔ یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ غریب ہے، تو نزہت کون سا امیر گھرانے سے ہے۔ ہاں! وہ رشید جیسا کمینہ نہیں، جو آج تک بیٹے کو بھی پوچھنے نہیں آیا، یہ گارنٹی دینے کے لیے میں تیار ہوں۔" خالہ صغریٰ چپ چاپ باتیں سن رہی تھی۔

"دیکھ لو آپا بی... ایسا نہ ہو کہ یہ بے چاری بھی رشید کی طرح..."

"ارے ایسا کچھ نہیں ہو گا... ساری عمر مجھے دعائیں دو گی۔" آپا بی، خالہ صغریٰ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

☆ ☆ ☆

"میرے پاس تمہیں دینے کے لیے شاید پیسے نہ ہوں لیکن محبت اور عزت دے سکتا ہوں۔ میں شاید تمہاری بڑی بڑی خواہشات پوری نہ کر سکوں، لیکن چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا ضرور خیال رکھوں گا۔ آج سے یہ تیرے بچے ہیں اور تمہارا بیٹا میرا بیٹا ہے۔ زندگی اسی طرح ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے اور ایک دوسرے کا احترام کرنے سے گزرتی ہے۔" وہ چھوٹا سا غریب خانہ جہاں وہ بے شمار اندیشوں کے ساتھ سب کچھ اللہ پر

چھوڑ کر آئی تھی۔ اچانک، بہت بڑا اور کشادہ معلوم ہونے لگا۔ کیونکہ یہاں کے رہنے والوں کے دل بڑے تھے۔

وہ اچانک دیوار کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگا۔ جب ایک معمولی شکل و صورت کا آدمی بائیک پر گھر کے اندر داخل ہوا۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"اب تو خوب مزے کر رہی ہو گی۔" اس نے عمارت کی خستہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا کہ اچانک اندر سے آنے والی آوازوں پر وہ چونک گیا۔

"کیوں لائے میرے لیے یہ سوٹ، پچھلے ہفتے بھی لائے تھے ایک۔"

"میں نے دیکھا کہ تیرے پاس گرمی کے کپڑے کم ہیں۔ اب قیمتی نہیں دلا سکتا، تو یہ سستے تو دے سکتا ہوں۔"

"ان پیسوں سے چینی لے آتے، ختم ہو گئی ہے۔" وہ سہمے انداز میں بولی، کیونکہ چینی فوبیا اسے ابھی بھی تھا۔

"چینی ختم ہو گئی... تم نے بتایا کیوں نہیں... چلو میں کل لے آؤں گا۔"

"اس سے ذرا ایک گھونٹ پی لو۔" اس نے اپنی پیالی اس کے ہونٹوں کے قریب کی۔

"مجھے پتا ہے کڑوی ہے۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

"تم ایک گھونٹ تو لو نا۔" اس نے زبردستی اس کو ایک گھونٹ پلایا گیا۔

"اب جب بھی چینی نہ ہو تو میری چائے سے گھونٹ پیا کرو، یہ میٹھی ہو جایا کرے گی۔"

"آپ بھی نا..." وہ شرما کر اندر چلی گئی اور اصغر مسکرا کر چائے پینے لگا۔

"اچھی اور میٹھی بات بھی صدقہ ہے۔" دیوار کے ساتھ کھڑے رشید کو اس حدیث کا مفہوم آج سمجھ میں آیا۔

"تو واقعی غریب ہے شیدا... رشید خان تو کبھی بنا نہیں، کیونکہ اس کے پاس محبت کی تجوری نہیں۔ چاہتوں کا خزانہ نہیں اور اچھے الفاظ کا ذخیرہ نہیں۔ چائے، چینی پر تو پیسے لگتے ہیں، مگر اچھی بات کرنے پر تو کچھ بھی نہیں لگتا۔" اس نے بے اختیار اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ وہ لکیر جو کبھی نجومی اس کو قسمت کی لکیر بتاتے آج اسے غربت کی لکیر نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے گرم آنسو لڑھک کر اسی لکیر میں پیوست ہو گئے۔

☆

"حاضری کی اجازت ہے؟" جواد کا ایس ایم ایس آیا تھا۔ یہ فدویانہ انداز وہ خاص خاص موقعوں پر اختیار کرتا تھا اور آج کی خاص بات شامی کباب تھے۔ جس کی خوشبو یقیناً "نازی کے کچن سے نکل کر اوپر کے پورشن تک پرواز کر چکی تھی۔ جب ہی کھٹاک سے اس کا پیغام آ پہنچا۔

"کیوں نہیں جناب! یو موسٹ ویلکم"۔ نازی نے مسکراتے ہوئے جواب ٹائپ کر کے بھیجا اور مستعدی سے اپنے کام نپٹانے لگی۔ بریانی کو دم پر رکھا۔ پھر باقی کے شامی کباب جو اس نے اضافی خیال کرتے ہوئے فرز کر دیے تھے۔ دوبارہ نکال کر فرائی کرنے لگی۔

ناولٹ

کیونکہ اب کچھ ہی دیر میں وہ بوتل کا جن حاضر ہونے والا تھا اور پھر کچھ بھی اضافی نہ رہتا۔

"یہ جواد بھی نا بالکل اویس جیسا ہی ہے۔ پُر خلوص، باتونی اور کھانے پینے کا شوقین۔"

اویس کے نام پر نازی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور ماضی کی کتنی ہی خوش گوار یادیں اس کے اردگرد جگنوؤں کی طرح ٹمٹمانے لگیں۔

"خادم حاضر ہے میرے آقا!" نازی چونک کر پلٹی تو وہ دروازے میں ایستادہ گہری سانس بھر کر فضا میں رچی کھانے کی لذت بھری خوشبو اندر اتار رہا تھا۔

"کس کو یاد کر کے مسکرایا جا رہا ہے اکیلے کیلیے؟" کرسی
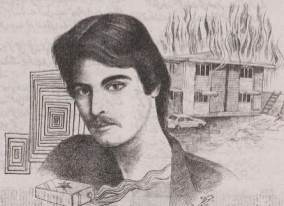
گھسیٹ کر اہتمام سے بیٹھتے ہوئے وہ نازی سے مخاطب ہوا۔

"کچھ خاص نہیں۔ بس ایسے ہی اویس کی یاد آگئی تھی۔ اسے بھی میرے ہاتھ کے کھانے بہت پسند ہیں نا۔ اب وہاں نہ جانے کیسا کھانا ملتا ہو۔" اس کے لہجے میں فکر تھی اور جواد کی نظریں پتیلے کا دم کھول کر پلیٹ میں بریانی نکالتے اس کے ہاتھوں پر۔

"ارے بھابھی جان! آپ اپنے بھائی کی فکر میں خود کو ہلکان مت کریں۔ آرمی کے میس تو قسمت والوں کے نصیب میں ہوتے ہیں۔ اویس بھی اس وقت یقیناً" کسی صحت مند سے مرغے کی ٹانگ اڑا رہا ہوگا۔" جواد نے اس کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ سامنے رکھی بریانی اور شامی کبابوں سے انصاف کرنا شروع کردیا تھا۔

"میں سمجھا' ہمارے بچارے سے بھائی کو یاد کیا جارہا ہے' ان کی پسندیدہ مٹن بریانی بنا کر...... مگر جناب عماد بھائی کے ایسے نصیب کہاں۔"

حسب عادت اس کی شوخ جملے بازی جاری تھی' لیکن عماد کے نام پر نازی کے چہرے سے ساری مسکراہٹ یک دم سمٹ گئی۔

"پسندیدہ ڈش...." اس نے زیر لب دہرایا۔ کبھی عماد کی ہر پسند و ناپسند سے وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ اس آگاہی سے اس بے خبری تک کا ایک طویل سفر تھا۔ راہ میں ان گنت موڑ' بے شمار سنگ میل آئے... نجانے کتنی صدیاں بیت گئیں اور وہ سب بھول گئی یا عماد کی پسند و ناپسند یکسر بدل کر کسی اور کے سانچے میں ڈھل گئی۔

☼ ☼ ☼

شعور کی اولین کھڑکی کھلنے پر جو پہلا منظر دیکھا تو خود کو دو کمروں اور ایک چھوٹے سے آنگن والے گھر کا مکین پایا۔ جہاں اماں اور اویس اس کے ساتھی تھے۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ ابا نے یہ گھر کب بنوایا۔ اسے تو ابا بھی یاد نہ تھے جو یہ گھر' یہ آنگن... اس کے اردگرد بسی یہ پہلی دنیا فراہم کرکے چپکے سے اپنی ابدی منزل کی طرف کب کے روانہ ہوچکے تھے۔ اماں سارا سارا دن سلائی مشین پر جھکی کچھ سیتی رہتیں۔

صحن میں کھیلتے ہوئے وہ کسی پھیری والے کی آواز پر مچل کر ان کے پاس دوڑے دوڑے آجاتی' مگر اماں کا خاموشی سے جھکا سر ہمیشہ نفی میں ہلتا۔ وہ ضد کرتی' روتی' اماں سے روٹھ جاتی' مگر کچھ حاصل نہ ہوتا۔ پانچ سال کی چھوٹی سی عمر میں وہ جان نہ سکتی تھی کہ اماں کی "نہ" کے پیچھے کتنی مجبوریاں چھپی ہیں۔ وہ کتنے جتن کرکے ان دونوں بہن بھائی کا پیٹ پال رہی تھیں۔ وہ اگر سمجھ سکتی تھی تو صرف اماں کی طرف سے ملنے والی کم توجہ اور محبت کی کمی کو۔ یہ کمی یقیناً" کسی احساس محرومی کی بنیاد رکھ دیتی۔ اگر خوشی اپنا دریچہ فراغ دلی سے وانہ کرتی۔ اس دریچے کا نام تھا عماد احمد ولد جرار احمد۔

جرار منزل کی دو منزلہ عمارت کی چھت اس کے چھوٹے سے گھر کی چھت سے اسی طرح جڑی تھی' جیسے عماد بھائی کا نام اس کے دل سے۔ یوں تو جرار منزل کے سب ہی باسی بہت اچھے تھے۔ انکل جرار' راحیلہ آنٹی' فرزانہ آپی اور سب سے چھوٹا جواد بھی' جو اسی کا ہم عمر تھا۔ مگر عماد بھائی تو صرف ایک ہی تھے' جن کی دوستی کا مان اس پانچ سالہ بچی کی زندگی کی سب سے قیمتی متاع تھا۔

☼ ☼ ☼

نازی میز پر ناشتا لگا چکی تھی' مگر عماد ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں آئے تھے۔ اس نے دیوار گیر گھڑی پر وقت دیکھا اور لاؤنج میں آکر ٹی وی آن کرلیا۔ پہلے پہل دوسری نئی نویلی بیویوں کی طرح وہ بھی آفس کے لیے تیار ہوتے شوہر کے پاس جا کھڑی ہوتی اور تیاری میں مدد کروانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر جب ان کے شفاف آسمان جیسے چہرے پر سرمئی بادلوں کے رنگ زیادہ گہرے ہونے لگے تو اس نے منظر سے ہٹنا شروع کردیا۔

"لگتا ہے آج ناشتا ٹھنڈا ہوکر رہے گا۔" کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ پھر مضطرب سی چینل بدلنے لگی۔ گھڑی نے پندرہ منٹ مزید گزرنے کا عندیہ دیا تو اسے اٹھ کر کمرے کا رخ کرنا ہی پڑا۔

عماد وارڈروب کھولے غیر استری شدہ کپڑوں والے حصے سے ایک لائننگ شرٹ نکال رہے تھے۔ اب یقیناً" اسے استری کرنے کا ارادہ بھی ہوگا۔

"لائیے میں کردیتی ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر شرٹ ان کے ہاتھ سے لے لی۔

"ویسے اس پینٹ کے ساتھ میں نے وائٹ شرٹ کل شام ہی استری کردی تھی۔"

گرے پینٹ پر بنیان پہنے کھڑے اس شخص کو نازی نے سر سے پاؤں تک یوں دیکھا' گویا کہہ رہی ہو لائننگ کے بجائے سفید قمیص زیادہ بہتر امتزاج ہے۔

"اور...... آپ کے سیاہ جوتے بھی پالش کردیے تھے۔"

"آپ نے بلاوجہ زحمت کی.... میں خود کرلیتا۔" ان کی آواز بڑبڑاہٹ سے کچھ زیادہ بلند نہ تھی۔ پھر وارڈروب کھول کر سفید شرٹ نکالنے لگے تو نازی گہری سانس بھر کر باہر چلی آئی۔

"باجی! اگر آپ غصہ نہ کریں تو میں نے ایک بات کہنی ہے۔"

تیزی سے کچن کی طرف اٹھتے اس کے قدم لاؤنج میں جھاڑ پونچھ کرتی شمیم کی آواز پر رکے تھے' اور نظریں بے اختیار گھڑی کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ جلد از جلد کچن میں پہنچ کر ناشتے کے لوازمات گرم کرکے میز پر لگا دینا چاہتی تھی۔ مگر اب..... "ہاں فٹافٹ بولو کیا بات ہے۔"

"باجی جی.... وہ میرا گھر والا ہے نا' وہ ناس پیٹا....."

شمیم ایک لمبا قصہ شروع کرچکی تھی۔ آئے دن اس کے پاس سنانے کو اپنے گھریلو جھگڑوں پر مبنی بے شمار قصے ہوتے' جن کے آخر میں چھٹی کی فرمائش یا ایڈوانس تنخواہ کا مطالبہ ہوتا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے' کرلینا کل کی چھٹی' مگر پرسوں وقت پر آجانا۔ جانتی ہو نا اتوار ہے۔ صاحب گھر پر ہوں گے اور انہیں گندگی اور پھیلاوا بالکل پسند نہیں۔"

جلدی جلدی شمیم کا معاملہ نپٹا کر کچن میں پہنچی تو عماد پہلے سے موجود تھے۔ ہاتھ میں تھاما چائے کا کپ ناشتے کے اختتامی مراحل کی گواہی دے رہا تھا۔

"ا.... رے یہ تو ٹھنڈا... لائیے چائے تو اور بنادوں۔" وہ شرمندہ ہوئی' مگر ان کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہ ہوا۔

"ضرورت نہیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں اگر کچھ منگوانا ہو یا کہیں جانا چاہیں تو جواد سے کہہ دیجیے گا' میں گاڑی بھیج دوں گا۔" انہوں نے کسی معمول کی طرح مخصوص الوداعی کلمات ادا کیے اور کچن سے رخصت ہوگئے۔ نازی تھکی سی کرسی پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کے سامنے میز پر سجے ناشتے کے لوازمات ان چھوئے پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

دوستی کے زینے پر پہلا قدم خود عماد بھائی نے رکھا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے' جب وہ خود میٹرک کے طالب علم تھے اور پورے زور و شور سے سالانہ امتحانات کی تیاری میں مصروف تھے۔ اسکول سے آکر کھانا کھانا' ایک گھنٹہ آرام اور پھر اکیڈمی کے لیے نکل کھڑے ہونا۔ ایک ایسی ہی دوپہر میں جب وہ اکیڈمی جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو برابر والی درزن خالہ کی بیٹی کو اپنے گھر کے دروازے پہ کھڑے روتے ہوئے پایا۔ اس پیاری سی بچی کو انہوں نے اکثر ادھر ادھر کھیلتے پھرتے دیکھا تھا۔ ان کے گھرانے کے درزن خالہ سے بہت خوش گوار مراسم تھے' مگر عماد بھائی کا شمار چونکہ کم گو نوجوانوں میں ہوتا تھا' پھر پڑھائی کا بوجھ... وہ کسی معاملے میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔

"ارے... ارے کیا ہوا ثریا! تم رو کیوں رہی ہو؟" عماد بھائی ایک ہاتھ میں بائیسکل کا ہینڈل تھامے اس کے پاس چلے آئے۔

"میری اماں مجھ سے بالکل پیار نہیں کرتیں، کوئی چیز لے کر بھی نہیں دیتیں۔ میں نے آج قلفی مانگی تھی مگر اماں نے ڈانٹ دیا۔" معصوم شکوے سنائے جانے کو بے تاب تھے۔ ہمدرد نظر آتے ہی اپنا اظہار کرنے لگے۔

"با... س... اتنی سی بات... یہ لو تم یہ کھاؤ بہت مزے کی ہے۔" پینٹ کی جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر عماد بھائی نے اس کی طرف بڑھائی، مگر وہ متذبذب تھی۔

"اچھا... ایسا کرتے ہیں، ہم دوستی کر لیتے ہیں، کرو گی نا مجھ سے دوستی؟"

عماد بھائی نے ذرا سا جھکتے ہوئے اسے پچکارا تھا۔

جواباً" اس نے زور سے ہاں میں سر ہلا دیا۔ پھر دوبارہ آفر کرنے پر اس نے چاکلیٹ بھی عماد بھائی کے ہاتھ سے لے لی۔ اماں نے کسی سے کچھ بھی لینے سے منع کر رکھا تھا۔ مگر عماد بھائی اب "کسی" نہیں بلکہ اس کے دوست تھے۔

☼ ☼ ☼

اکیلے میں خود سے باتیں کر کے ساری بھڑاس نکال لینا شاید دنیا کا بہترین کتھارسس ہے لیکن آزمائش کی شرط کو خود پر لاگو کرنے سے ہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ نازی آج کچھ ایسا ہی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ صبح کے ناشتے والے واقعے سے اس پر کچھ ایسی جھنجلاہٹ سوار ہوئی تھی، جو اترنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ پہلے بلاوجہ شمیم کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے غصہ اتارنے کی کوشش کی۔ افاقہ نہ ہوا تو اوپر راحیلہ آنٹی کے پاس چلی گئی۔

وہ بہت مختلف ساس تھیں بلکہ لفظ ساس ان پر جچتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو سراپا ممتا ہی ممتا تھیں۔ نازی ہر روز ان کی احوال پرسی کو چلی جاتی اور وہ ہر روز اسے دیکھ کر یوں خوش ہوتیں گویا ہفتوں بعد ملی ہوں۔ شفقت کی پھوار میں بھیگی گفتگو سے نازی ہمیشہ سیراب ہو کر اٹھتی۔ آج بھی کچھ دیر میں ہی اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے اور وہ مطمئن ہو کر نیچے آ گئی، لیکن جیسے ہی کچن کے پھیلاوے پر نظر پڑی، صبح کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ اب وہ تھی اور اس کی سوچیں۔

"ایسا بھی اب کیا تکلف، مہینے سے زیادہ ہو چکا ہے ہماری شادی کو، لیکن میاں صاحب کی آپ جناب ہی ختم نہیں ہوتی۔ اور اوپر سے یہ شمیم... ہمیشہ غلط وقت پر آ دھمکتی ہے۔ مگر شاید غلطی میری ہی تھی۔" وہ پھر سے جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

"التفات کب مانگا ہے۔ اچھے کام پر حوصلہ افزائی بھی بھلے نہ کریں۔ غلطی پر ٹوک تو سکتے ہیں۔"

خود کلامی کرتے ہوئے اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شکوہ کا اختیار اس کے پاس نہیں، دل شکوہ کر بیٹھا تھا۔ اس راستے کا انتخاب بھی تو سراسر اس کا اپنا تھا۔ راحیلہ آنٹی اور فرزانہ آپی نے روایتی ساس اور نند کا کردار ادا نہ کرتے ہوئے نہ صرف ہر بات کھول کر اس کے سامنے رکھ دی تھی بلکہ فیصلے کا اختیار بھی مکمل طور پر اسے سونپ دیا تھا۔ چاہے تو اس مفتوح جزیرے میں رہنا قبول کر لے جس کے مالکانہ حقوق اسے حاصل ہوتے ہوئے بھی ملکیت کا مان حاصل نہ ہو، جہاں قدم قدم پر گڑے کسی اور فاتح کے جھنڈوں کو اتار پھینکنا تو درکنار، چھونے کی اجازت بھی نہ ہو گی اور اگر چاہے تو صاف انکار کر دے۔ اس کا سر پھر بھی ہاں میں ہل گیا تھا۔

"صبر حوصلہ، برداشت، صرف یہی چاہیے نا۔ وہ میرے پاس بہت ہے۔" اس نے سوچا تھا۔ "اپنے اندر کی عورت کو بھی مارنا پڑا۔ مار لوں گی۔" اس نے انتہائی حد تک سوچ ڈالا مگر ارادے متزلزل نہ ہوئے۔

"خود کو اکیلا مت سمجھنا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" فرزانہ آپی نے اس کے اٹل فیصلے کو سراہتے ہوئے کہا تھا۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو وہ خود سے خوف زدہ ہو گئی۔ ارمانوں نے دروازۂ دل پر چپکے چپکے دستک دینا شروع کر دی تھی۔ راحیلہ آنٹی اور فرزانہ آپی شاپنگ کے لیے اسے لینے آتیں تو اس کی نظریں بلا ارادہ سہی ان کے عقب میں خالی دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ ڈرائینگ سیٹ پر جواد کو دیکھ کر اسے کسی اور شخص کا گمان ہوتا۔ وہ سب اس کی سوچوں سے بے خبر اس کے ساتھ ہونے پر خوش تھے۔ وہ احساس شرمندگی میں گھر جاتی۔ جواد کے چٹکلوں پر پھوٹتے قہقہوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتی۔ ننجو خالہ آنٹی کے منع کرنے کے باوجود بساط بھر تیاریوں میں مشغول تھیں، اویس نے اس کی خاطر اپنے سینئرز کی منت کر کے چھٹیاں لی تھیں۔ یہ سب اس کی بذات کے لیے ہو رہا تھا۔ زندگی اسے اہمیت دے رہی تھی۔ بے وقعتی میں ڈوبے شب و روز بیت گئے تھے۔ اسے اچھے دنوں کی آمد کا یقین ہونے لگا مگر... ایک گرہ ہی تو تھا جو اتنی محبتوں کے درمیان حائل ہو جاتا تھا۔ دھڑکنیں رک رک جاتیں۔ پھر کوئی اندر سے تسلی دیتا۔

"دیر سے سہی برف پگھلے گی ضرور۔"

☼ ☼ ☼

"عماد بھائی گھر پر ہیں؟" وہ ایک ہاتھ میں اپنا رجسٹر پکڑے دوسرا ہاتھ کمر پر ٹکائے، بہت استحقاق سے پوچھ رہی تھی لیکن اس کا مخاطب ٹی وی پر آتے کرکٹ میچ میں پوری طرح غرق تھا۔

"جواد! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے سوال دہرایا۔

"تمہیں کہیں نظر آ رہے ہیں عماد بھائی؟" جواباً" ایک اور سوال، نظریں ابھی بھی ٹی وی پر ٹکی تھیں۔

"بہت بری بات ہے۔ بہن سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔" کچن سے آتی راحیلہ بیگم نے سرزنش کی تو وہ ذرا جھینپ گیا۔

"مگر امی! اسے بھی تو دیکھیں۔ سارا گھر چھان چکی ہے پھر بھی محترمہ کی تسلی نہیں ہوئی۔"

"تو اسے کوئی ضروری کام ہو گا۔" راحیلہ بیگم نے جواد کے اعتراض کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ابھی بھی اسی کی طرف داری کی تھی۔ جواد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ بچپن ہی سے اپنے گھر سے زیادہ اس گھر کے افراد کی لاڈلی تھی۔ امی جان اور ابو جان کی چہیتی، فرزانہ آپی کی معاون، عماد بھائی کی دوست اور خود جواد کو بھی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ وہ اس سے چڑتا نہیں تھا بس تنگ کرتا تھا۔

"جی آنٹی! بہت ضروری کام ہے۔" ہمیشہ کی طرح شہ ملنے پر وہ مزید پھیل گئی اور جھٹ راحیلہ بیگم کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

"کل میتھ کا ٹیسٹ ہے۔ میں نے عماد بھائی سے کچھ سوال سمجھنے تھے۔"

"نکمی لڑکی! تمہیں ہمیشہ آخری وقت میں ہوش آتا ہے۔" جواد اسے پھر چڑانے کے موڈ میں تھا مگر اس بار دونوں خواتین اسے نظر انداز کر کے صوفے پر

جا بیٹھیں۔

"عماد تو شاید دوستوں کی طرف گیا ہے۔ ہو سکتا ہے دیر سے گھر لوٹے۔ تم پہلے ذکر کر دیتیں تو ضرور رک جاتا۔" راحیلہ بیگم نے بہت پیار سے اس کے چہرے پر بکھری لٹوں کو سمیٹ کر کان کے پیچھے اڑسا۔

"ہوں۔ یہ تو ہے۔ میرا خیال تھا انہیں یاد ہو گا۔" وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی کہہ رہی تھی۔

"تمہاری پڑھائی کی فکریں اب وہ زیادہ عرصہ تک پالنے والے نہیں محترمہ جلد ہی ان کی کئی نئی مصروفیات شروع ہونے والی ہیں۔"

توجہ نہ ملنے کے باوجود جواد نے ایک بار پھر ان کی گفتگو میں ٹانگ اڑائی۔

"مطلب! یہ کیا کہہ رہا ہے آنٹی؟" اس نے چونک کر اس لاپروا سے لڑکے کے چہرے سے بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی پھر راحیلہ بیگم کی طرف مڑی۔ عماد بھائی کے لیے وہ اتنی ہی حساس تھی۔ وہ بھی بچپن سے اسے اور اس کی ہر بات کو اہمیت دیتے آئے تھے۔ بچپن گزر گیا تھا مگر اس اہمیت کی اسے اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی۔ عماد بھائی کی دوستی آج بھی اس کا کل سرمایہ تھی بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ کے نئے زاویوں نے بہت سی باتوں کے مفہوم بدل دیے تھے۔ دل نے نہ جانے کب ایک بدلی ہوئی دھڑکن کی چوری کی تھی لیکن اب یہ چوری کسک بنتی جا رہی تھی۔

"مطلب اور جواد کی باتوں کا۔ بس جانے بھی دو۔" آنٹی ہلکے پھلکے انداز میں ہنس دیں۔

"عماد ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ ضرور کر رہا ہے۔ اللہ اسے جلد از جلد کامیاب کرے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی چھوٹی سی دوست کو بھول جائے۔"

انہوں نے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح اسے پچکارا۔ جواد نے بھی امی سے نظر بچا کر منہ چڑایا لیکن اب اس کا مضطرب دل تھا کہ کسی صورت مطمئن ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ تو سہی کتنا روپ آیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ تجھ سے نظر ہٹا لے تو میرا نام بدل دینا۔"

خالہ نے نازی کے دولہناپے کو دیکھ کر کہا تھا۔ پھر زبردستی اس کا رخ آئینے کی طرف موڑ دیا۔ خالہ کی بات کی تائید آئینہ ہی نہیں فرزانہ آپی بھی زور و شور سے کر رہی تھیں۔ تسلی کے یہ جگنو اس کی مٹھی میں دے کر دونوں باہر چلی گئیں، اپنے مقدر سے تنہا نمٹنے کے لیے اسے اکیلا چھوڑ کر۔

نازی اور اسی کی طرح سجا سنورا خوشبوؤں میں بسا یہ کمرا تادیر کسی کے قدموں کی آہٹ کے منتظر رہے۔ آخر آنے والا آ ہی گیا اور دھیمے قدموں سے چلتا بیڈ کے پاس آنے کے بجائے سامنے سے گزر کر واش روم میں جا گھسا۔ آدھا گھنٹا مزید انتظار کی نذر ہوا۔ اب واش روم کا دروازہ کھلا تو وہ دوسری طرف رکھی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ نازی سر جھکائے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں حرکت کرتے ان قدموں کو ہی دیکھتی رہی۔ ایک بار وہ قدم پھر متحرک ہوئے لیکن سامنے سے گزر جانے کے بجائے آخر کار بیڈ کے کنارے کے پاس آ رکے۔

"آپ تھک گئی ہوں گی۔ چینج کر کے آرام کر لیں۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ دروازہ لاک کر لیجیے گا۔"

عماد اپنے مخصوص نرم لہجے میں یوں بات کر رہے تھے، جیسے یہ معمول کا کوئی عام سا دن ہو اور وہ اسے ہر روز یوں ہی نصیحت کر کے باہر جاتے ہوں۔ نازی کے دل نے نوک خنجر کی سی چبھن محسوس کی تھی۔ پلکوں کے کناروں سے سمندر کی لہریں ٹکرائیں اور کچھ نمی ادھر ادھر بکھر گئی۔

"یہ تو آغاز ہے۔ ابھی سے ہمت ہار دو گی تو آگے کیسے بڑھو گی۔" اس نے خود کو دلاسا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کہاں کھوئی ہوئی ہو، جواب کیوں نہیں دیتیں۔"

اماں نے کھانستے ہوئے بے زار لہجے میں کہا۔ وہ کافی دیر سے اسے پکار رہی تھیں مگر اس نے تو جیسے کان ہی لپیٹ رکھے تھے۔ جب سے راحیلہ آنٹی کی طرف سے ہو کر آئی تھی یوں ہی گم صم بیٹھی جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔

"بیٹی! اگر فارغ ہو تو روٹیاں ہی پکا لو۔ جانتی ہو، اویس بھوک کا کتنا کچا ہے۔ اسکول سے آتے ہی شور مچا دے گا۔ میری طبیعت بھی۔" جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اماں کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ اپنے خیالات کے منجدھار سے ساحل پر اتر آئی۔

"اماں! آپ کی کھانسی بہت بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے ناغہ کرنے سے منع کیا تھا اور آپ کی دوا ختم ہوئے ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔" وہ رنجیدہ سی ان کے پاس چلی آئی۔

"میری داخلہ فیس جمع کرنے کے لیے اپنی صحت کی قربانی دے رہی ہیں۔ ہے نا میں سب جانتی ہوں۔ پلیز ایسا مت کریں۔ میں اس سال میٹرک کا امتحان نہیں دوں گی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔"

"اچھا اچھا۔ لے لوں گی دوا بھی۔ ابھی تو جا، روٹیاں پکا لے۔"

اماں ہمیشہ ہی اسے ٹال دیتی تھیں، ان کے سامنے اس کی ضد کبھی چل ہی نہیں سکی۔ اب یہ تو اماں ہی جانتی تھیں۔ ان کی کھانسی سادہ سے سیرپ سے ہٹنے والی کھانسی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں کہا تھا۔ پھیپھڑوں کی ٹی بی آخری اسٹیج پر ہے۔ مہنگا علاج، بہترین خوراک اور مکمل آرام۔ ورنہ زندگی کے چند دن اور کی مہلت کے جلد ختم ہو جانے کا اندیشہ۔ ڈاکٹر بھی جانے کس دیس کی باتیں کرتا تھا۔ یہ سب چیزیں ثمینہ بی بی کی زندگی میں بیک وقت کیوں کر آ سکتی تھیں۔ علاج اور اچھی خوراک کے لیے جو پیسہ چاہیے تھا، وہ مکمل آرام کے راستے میں حائل تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر بیوگی اور غربت کے ہم سفر ہونے پر تمام عزیز و اقارب نے بھی زمانے کی روایت کو نبھاتے ہوئے اپنے راستے بدل لیے تھے۔ وہ سلائی کا کام نہ جانتی ہوتیں تو شاید کب کی دونوں بچوں سمیت فاقوں سے مر چکی ہوتیں۔

اس اندھیرے کے سفر میں جرار صاحب اور ان کا کنبہ روشن چراغوں کی مانند تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اچھے پڑوسی ہونے کا فرض نبھایا تھا۔ سلائی کا کام ہمیشہ ثمینہ بی بی سے کرواتیں اور دوگنی چارگنی اجرت دیتیں۔ مدد کرنے کے کئی اور حیلے بہانے بھی ڈھونڈ رکھے تھے کہ جن سے ثمینہ بی بی کی انا پر ضرب نہ پڑے۔ یوں ان کی زندگی کی گاڑی جیسے تیسے کھسک ہی رہی تھی، مگر اس موذی مرض کے انکشاف نے ثمینہ بی بی کی مجتمع ہمت کو توڑ ڈالا تھا۔ اپنے بچوں کی جانب دیکھتیں تو مزید زندہ رہنے کی خواہش زور پکڑ لیتی مگر..... کھانستے کھانستے بے حال ہو کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گئیں۔

دھندلی آنکھوں سے سامنے کچن کی کھڑکی سے نظر آتے اس کے متحرک وجود کو دیکھنے لگیں۔ وہ خود رو پودے کی طرح روز بہ روز اوپر ہی اوپر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اماں کی نظروں سے بے نیاز وہ روٹیاں بیلتے ہوئے ایک بار پھر گہری سوچ میں کھوئی تھی۔

"کہیں ایسا تو نہیں میرے علم میں لائے بغیر عماد بھائی کا رشتہ طے کیا جا رہا ہو۔ نہیں! آنٹی ایسا نہیں کر سکتیں۔ وہ تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ پیار کا دعوا تو عماد بھائی کو بھی ہے مگر۔ کتنی بار سمجھانے کی کوشش کی مجھے گڑیا مت کہا کریں۔ میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ لیکن وہ جھٹ کہہ دیتے ہیں" کتنی ہی بڑی ہو جاؤ میرے لیے تو گڑیا ہی رہو گی۔"

اماں کی زوردار کھانسی کی آواز نے ایک بار پھر اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا ساتھ ہی کسی شے کے گرنے کی آواز پر وہ چونک گئی۔

"اماں! آپ ٹھیک تو ہیں؟" جواب نہ ملنے پر ادھ پکی روٹی توے پر چھوڑ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ کھلے دروازے سے نظر آتے منظر نے بیچ راستے میں ہی پاؤں جکڑ لیے۔ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں اماں فرش پر اوندھی گر گئی تھیں۔ ان کے اردگرد پھیلی

خون آلود تھے۔

"اماں!" وہ پاگلوں کی طرح چیختی ان کی طرف بھاگی۔

☼ ☼ ☼

"شدتیں جذبوں کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ اس کی بے رخی میں جتنی شدت ہوگی، ندامت اور پشیمانی کا پڑاؤ بھی اتنا ہی قریب ہوگا' جو تمہیں تمہاری منزل کی طرف لے جائے گا۔"

خالہ نے بہت پتے کی بات بتائی تھی مگر یہاں تو گنگا ہی الٹی تھی۔ وہ اپنے نرم رویے سے الٹا نازی کو اس کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر پشیمان کیے رکھتے۔ وہ نرم پھوار سے لہجے اور بے نیازی کا عجیب امتزاج۔ نازی کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ بات کرتے تو لہجے سے بھی بختی نہ جھلکتی۔ اس سے کوئی کام بگڑ جاتا یا نقصان ہوجاتا تو یوں ظاہر کرتے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک طرف وہ اچھے شوہر کے فرائض پورے کررہے تھے اور دوسری طرف ان کی آنکھیں بولتیں۔ "تمہارے احساسات تمہارے جذبات تمہاری سوچ... مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ میرا رستہ نہیں۔"

اس کے ہاتھوں کے لمس پکارتے۔ بدن سے آگے ایک نگری دل کی نگری ہے' جہاں صرف اس کے مکین کا حکم چلتا ہے۔

عماد کے دل کا مکین، بہت ہٹیلا تھا۔ انہیں کسی اور سمت دیکھنے ہی نہ دیتا۔ وہ چپ رہ کر سب باور کروا جاتا۔ کچھ لوگ چہروں پر۔ نو ویکنسی کا بورڈ لگائے پھرتے ہیں عماد بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس روز کی شدید کھانسی کے باعث اماں کا بایاں پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ دایاں پہلے ہی ٹی بی کے شدید حملے کے باعث ناکارہ تھا۔ فوری طور پر اسپتال لے جانے کے باوجود وہ جانبر نہ ہوسکیں۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تین روز گزارنے کے بعد زندگی کی سرحد پار کرگئیں۔ دکھ کے ان لمحوں میں انکل جرار کی پوری فیملی اس کے گرد موجود تھی۔ اس کے باوجود یہ احساس کہ موت کی سرحد کے اس طرف وہ اکیلی کھڑی رہ گئی ہے۔ پہلی بار بہت شدت سے اس پر حملہ آور ہوا تھا۔

"اماں! یوں اچانک آپ کیسے جاسکتی ہیں... آج بھی آپ نے میری ایک نہیں سنی... پہلے بھی کبھی نہیں سنی..." ہذیانی کیفیت میں روتے ہوئے وہ سفید چادر میں ڈھکے اماں کے وجود کی طرف بڑھی تھی۔

"نہیں گڑیا نہیں... صبر کرو... اللہ کی یہی مرضی تھی۔" عماد بھائی نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ خود بھی رو رہے تھے۔ اس کی ہر خواہش' ہر خوشی پوری کرنے والے عماد بھائی آج بالکل بے بس تھے۔

جنازہ گھر پہنچا تو محلے والوں کو ثمینہ بی بی کے ان دیکھے رشتہ داروں کو اطلاع دینے کی فکر ستانے لگی۔ اس سے پوچھا گیا تو فجو خالہ کے سوا کوئی نام اس کے ذہن میں نہ آسکا۔ فجو خالہ شہر کے دوسرے حصے میں اپنے بہو بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہی اس کی کل رشتہ دار تھیں' سو چلی آئیں۔

"باپ تو پہلے ہی نہیں تھا اب ماں بھی دنیا سے چلی گئی۔ اکیلے بچے کیسے رہیں گے۔" محلے والوں کو اچانک ہی ان کی ہمدردی کا بخار چڑھ گیا تھا۔

"ارے خالہ بی! ان بچوں کی جو کچھ ہو تم ہی ہو۔ اب انہیں ساتھ لے کر ہی جانا۔"

سوئم والے دن ایک پڑوسن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ خالہ متذبذب تھیں۔ ان کی بہو خود انہیں بمشکل برداشت کرتی تھی تو ان کی رشتے کی بھانجی کے یتیم بچوں کو رکھنے پر کیونکر آمادہ ہوتی۔

"ارے بہن! اب تم بھی تو انہیں نہیں رکھ سکتیں جوان بچی کا معاملہ ہے۔ کوئی رشتہ داری تو ہے نہیں۔" کوئی اور پڑوسن بولیں۔

"آنٹی! کیسی باتیں کررہی ہیں آپ۔ یہ لوگ غیر نہیں۔ ہمیں سگے بہن بھائی کی طرح عزیز ہیں۔" فرزانہ آپی کے جواب نے اس کے ڈوبتے ہوئے دل کو ڈھارس دی تھی۔

"نہ نہ بیٹا! یہ تمہارے کرنے کی باتیں نہیں۔ پرائی بچی کی ذمہ داری... بھئی بڑا نازک معاملہ ہے۔ ویسے بھی یہ تو لڑکوں والا گھر ہے اور منہ بولا رشتہ بھی کوئی رشتہ ہے۔" ایک اور خاتون کی ذومعنی بات پر راحیلہ بیگم کو تاؤ آیا۔ کچھ کہنے کے لیے انہوں نے لب کھولے ہی تھے کہ فجو خالہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کروادیا۔

"بچے میرے ساتھ ہی جائیں گے۔" انہوں نے ایک جملے میں ساری بات سمیٹ لی۔

☼ ☼ ☼

"امی! ہمیں ہنی مون پر بھیجنے پر اصرار کررہی ہیں۔ پلیز آپ منع کردیجئے گا۔"

عماد نے کڑوی کافی کا گھونٹ بھر کر شیریں لہجے میں اسے مخاطب کیا جبکہ ان کی بات سن کر نازی کو اپنی آئس کریم زہر سے زیادہ کڑوی لگنے لگی تھی۔

"دراصل میں کچھ مصروف ہوں... فی الحال۔" وہ کمال بے نیازی سے کہہ رہے تھے۔ نازی جانتی تھی وہ جتنا خود کو من کا موجی ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ ماں باپ کے فرماں بردار ہیں۔ ان کے ایک اشارے پر کچھ بھی کرسکتے ہیں' جس کی قریب ترین مثال آج کی آؤٹنگ تھی۔ راحیلہ آنٹی نے نیچے آکر آج صبح ناشتے پر ہی کہہ دیا تھا۔ شام کو جلدی گھر آنا اور نازی کو کہیں باہر لے جانا۔ حکم کی فوری تعمیل ہوئی تھی۔

"ہوں! اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" نازی نے چٹخارہ لے کر سوچا۔

"آپ منع کردیں گی نا۔" عماد اس کے چہرے کے تاثرات کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"ج... جی بہت بہتر۔" اسے کہتے ہی بنی۔

☼ ☼ ☼

اجنبی گھر' اجنبی چہرے اور اجنبی لہجے... فجو خالہ کے بیٹے کے گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا' جیسا وہ راستے بھر سوچتی آئی تھی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی اماں انہیں کبھی یہاں لے کر نہیں آئی تھیں' جس کی یقینی وجہ فجو خالہ کی بہو رہی ہوں گی۔ وہ بدزبان اور جھگڑالو ہونے کے ساتھ ساتھ آرام طلب بھی تھی۔ سارا دن بوڑھی ساس سے کام کرواتی' خود پلنگ توڑتی یا جھگڑنے کے منصوبے بناتی۔ اس کا شوہر کاٹھ کا الو تھا' اس کی زبان اور ہاتھ سے بندھے دھاگوں کے سرے بیگم کے ہاتھ میں تھے۔

یہاں کس طرح رہنا ہے' پہلے ہی دن اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا۔ ایک طویل جھگڑے کے بعد دردانہ مامی انہیں رکھنے پر راضی ہوئی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ منہ بولے رشتے تو انہیں ایک دن بھی نہ رکھ پائے۔ وہ جن پر اسے بہت مان تھا' زمانے نے انہیں غیر بنایا اور وہ بن گئے۔ کتنا آسان ہوتا ہے' منہ بولے رشتے بنانا اور پھر انہیں توڑ دینا۔ خون کے رشتوں نے جیسے تیسے ہی سہی' انہیں اپنا تو لیا تھا۔ اس کی سوچیں بہت اذیت پسند ہوگئی تھیں۔ سارا دن کام میں جتی جانے کیا الٹا سیدھا سوچتی رہتی۔

"کوئی رشتہ اگر نہیں تھا تو بنایا تو جاسکتا تھا۔ آخر عماد بھائی... ہاں عماد بھائی اگر گھر پر ہوتے تو ضرور اسے روک لیتے... انہیں پتا چلے گا تو بہت لڑیں گے گھر والوں سے۔"

امید نے ایک نیا دیا روشن کیا تھا۔ دراصل اماں کی تدفین سے اگلے دن ہی عماد بھائی کو شہر سے باہر جانا پڑا۔ ان کا اپائنٹمنٹ لیٹر آگیا تھا اور فوری جوائننگ کے لیے کہا گیا تھا۔ ایک ننھی سی آس ایک انتظار نے تھکن سے بھرے شب و روز میں اسے ڈھے جانے سے بچا رکھا تھا۔ آخر ایک دن اویس بھاگتا ہوا گلی سے اندر آیا۔

"دیکھو دیکھو! گڑیا کون آیا ہے۔" فرزانہ آپی اور جواد ہاتھوں میں بہت سے شاپر لیے چھوٹو کے پیچھے اندر آگئے۔ راحیلہ آنٹی نے کھانے پینے کا بہت سا سامان اور ان سب کے لیے کپڑے بھیجے تھے' جنہیں دیکھ کر مامی کی کبھی نہ رکنے والی زبان وقتی طور پر خاموش

ہو گئی۔

"راحیلہ آنٹی خود کیوں نہیں آئیں اور عماد بھائی وہ... وہ کہاں ہیں۔" وہ بھاگ کر دروازے تک گئی اور مایوس ہو کر لوٹ آئی۔

"وہ تو آنا چاہتے تھے' مگر امی نے منع کر دیا۔" فرزانہ آپی نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"مگر کیوں؟"

"وہ کہتی ہیں... بھائی کے آنے سے تمہاری مامی تمہیں التاسید ھاسنانا نہ شروع کر دیں۔"

"جی!" وہ نا سمجھی سے ان کا منہ تکنے لگی۔

☼ ☼ ☼

پھر وہی ہوا جس کا نازی کو یقین تھا۔ راحیلہ آنٹی کا اصرار بڑھا تو عماد کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور وہ ایک ہفتہ کے لیے مری روانہ ہو گئے۔

"میں بہت بور انسان ہوں' شاید آپ میری کمپنی انجوائے نہ کر سکیں۔"

لاہور سے مری تک کی ڈرائیو میں عماد کی جانب سے از خود کی جانے والی یہ پہلی بات تھی۔ اعتراف تھا یا دھمکی' وہ سمجھ نہ پائی۔ وہ مری کی چڑھائی چڑھ رہے تھے اور نازی کو محسوس ہوا عماد بھی اپنے مزاج کی شدتوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

"مجھے آج تک ایک بات سمجھ میں نہیں آئی لوگ شادی کرتے ہی مری کی طرف کیوں بھاگ پڑتے ہیں۔ ہونہہ ایڈیٹس! جنہوں نے کبھی مری نہیں دیکھا وہ بھی اور جنہیں ازبر ہے وہ بھی۔" ان کے لہجے میں عجیب سی کھولن تھی۔

"کیوں کہ محبت ہر چیز کا مفہوم بدل دیتی ہے۔ ہزار بار کی دیکھی چیزیں اور جگہیں نئی لگنے لگتی ہیں۔"

نازی نے اپنی مسلسل چپ آخر توڑ ڈالی تھی اور عماد نے سارا غصہ گاڑی کی بریک پر نکال دیا۔ ٹائر بری طرح چرچرائے اور گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ ٹھہرے ہوئے خوابیدہ پانیوں میں جب کوئی کنکر دے مارے تو پانی جاگ اٹھتے ہیں۔ دائرہ در دائرہ جنم لیتا ہوا تلاطم کچھ دیر تک کناروں سے سر ٹکراتا ہے' پھر وہی سابقہ سکون اوڑھ لیتا ہے۔

عماد بھی اس وقتی اشتعال کے بعد اپنی پُرسکون جون میں لوٹ آئے تھے۔ گہرے سرد خوابیدہ پانیوں کی طرح۔ باقی کے چھ دن نازی ان کے بظاہر پُرسکون خول کو توڑ دینے کی خواہش کرنے پر خود کو کوستی رہی۔

☼ ☼ ☼

مہینے دو مہینے بعد جواد ان کی طرف چکر لگا لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار فرزانہ آپی بھی آجاتیں۔ بہت سے تحائف اور کھانے پینے کی اشیا ہر بار آتیں' جن کی بدولت خالہ کی بہو جواد کو آدھا گھنٹہ تک برداشت کرنے کا جبر خود پر کیے رکھتی۔ وہ آدھا گھنٹہ مگر اس کے لیے بہت انمول خزانے کی طرح ہوتے۔ وہ کرید کرید کر جواد سے سب کا احوال پوچھتی۔ کئی کئی بار ایک ہی سوال دوہراتی' لیکن تشفی نہ ہوتی۔

"اوئے لڑکے! یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تمہاری ماں نے۔" آخر ایک دن مامی کو جوش آ ہی گیا۔

ابھی جواد نے بہت سے شاپر لا کر چارپائی پر رکھے ہی تھے کہ وہ صحن میں نکل آئی۔

"اگر کچھ دینا دلانا ہی ہوتا ہے تو ڈرائیور کے ہاتھ بھیج دیا کرو۔ تمہارا آنا ضروری ہے کیا۔ حد ہے بے شرمی کی۔ میری اپنی بھی بیٹیاں ہیں۔ آئندہ نہ آنا بھئی یہاں۔" مامی نے صحن میں کھیلتی ہوئی اپنی چار اور پانچ سال کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔

جواد اس کے بعد پھر کبھی نہیں آیا۔ البتہ ڈرائیور کبھی کبھار اویس کو اپنے ساتھ لے جاتا... صرف چھوٹو کو۔ اب وہ بھی سمجھنے لگی تھی۔ اس لیے کبھی چھوٹو کے ساتھ جانے کا نہ سوچا۔ جواد جوان جڑواں بہن بھائی کا تیسرا ہم زاد تھا۔ ساتھ جنم نہیں لیا تو کیا ہوا' تھا تو اسے اویس ہی کی طرح عزیز۔ اس کے بارے میں بھی غلط سوچا جا سکتا تھا تو پھر کچھ بھی ممکن تھا۔ چھوٹو مامی کے لیے رشوتی تحائف اور اس کے لیے جاں فزا خبریں لے کر آتا۔

"فرزانہ آپی کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔" ایک دن اس نے بتایا۔

"عماد بھائی! آج کل بہت اداس رہتے ہیں۔ دراصل وہ کسی کو پسند کرتے ہیں اور راحیلہ آنٹی مان نہیں رہیں۔"

"کس کو؟" اس کا دل رک کر دھڑکا۔

"ہے کوئی... ان کی کلاس فیلو تھی۔ اب ان ہی کے دفتر میں کام بھی کرتی ہے۔"

اسے لگا' یک دم اس کے گرد اندھیرا چھا گیا ہے۔ امید کا آخری چراغ بھی بجھ گیا۔ ایک ایک کر کے اس کی واپسی کی تمام کشتیاں جلائی جا رہی تھیں' آج آخری کشتی کو بھی آگ لگا دی گئی۔

"میں نے ایک اور بات بھی تمہیں بتانا تھی۔ انکل جرار مجھے اپنے پاس رکھنے پر راضی ہیں۔ میری تعلیم کے اخراجات بھی وہی اٹھائیں گے۔ یہاں رہا تو مامی کبھی گھر بیٹھ کر پڑھنے نہیں دیں گی۔ کیا ہمیشہ ہم مامی کے غلام رہیں گے۔ میرا مطلب..."

"جو دل چاہے کرو۔" وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ جس کا اپنا وجود آندھیوں کی زد میں تھا۔

☼ ☼ ☼

"زمین اپنی پہلی بارش اور مرد اپنی پہلی چاہت ذرا مشکل ہی سے بھولتا ہے۔"

راحیلہ آنٹی شاید اسے رعایت دے رہی تھیں' ورنہ انہیں کہنا چاہیے تھا' مٹی اپنی پہلی بارش بھول بھی جائے تو مرد اپنی پہلی چاہت کبھی نہیں بھولتا۔ وہ کل ہی مری سے لوٹی تھی اور فوراً ہی ان سے ملنے چلی آئی۔ پہلی نظر میں ہی آنٹی نے اس کے چہرے پر رقم تحریر پڑھ لی تھی۔ "میرا مقصد تمہیں مزید آزردہ کرنا نہیں ہے دراصل تم حقیقت جانتی ہو۔ شہلا سے اس کی محبت کی شادی تھی۔ بعد میں دونوں میں نبھ نہ پائی یا بے اولادی وجہ بنی' جو کچھ بھی تھا' لیکن عماد اپنے جذبوں میں سچا تھا۔ اس لیے ہرٹ بھی زیادہ ہوا... لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا رہے گا۔ تمہارے جیسی محبت کرنے والی بیوی ہو تو ماضی بھولتے دیر نہیں لگتی۔"

انہوں نے اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

"یاد رکھنا بیٹی! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔"

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر نرمی سے دبایا' تو وہ نظریں چرا گئی۔ گزشتہ سات دنوں نے اس کے دل کی دنیا کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ حوصلے مجتمع کر کے وہ کسی کو جیت لینے نکلی تھی اور رقابت کی آگ میں گھر کر سب کچھ ہار گئی۔ وہ کبھی کسی اور کے ساتھ بھی یہاں آئے ہوں گے۔ نازی کے دماغ کی سوئی اسی نقطے پر اڑی رہی۔ عماد کے قہقہوں میں ضم ہوتے کسی اور کے قہقہے ابھی تک ان فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اپنے ساتھ چلتے پھرتے عماد کا گونگا وجود ہر لحہ کسی اور سے محو گفتگو محسوس ہوتا۔ وہ کڑھتی کلستی رہی اور یہی کڑھن واپسی پر ساتھ لے آئی۔

"ارے بھابھی! آپ لوگ آ بھی گئے۔ میرا خیال تھا مہینہ نہیں تو کم از کم بیس بائیس روز تو ضرور لگا کر آئیں گے۔" جواد ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا' اسے سامنے دیکھتے ہی چہک اٹھا۔

"چلو ہٹو! ہر کوئی اب تمہاری طرح آوارہ گرد ہونے سے رہا۔" آنٹی نے جواب دے کر اسے مشکل میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔

"اچھا یہ بتائیں کہاں کہاں گھومے' شاپنگ تو خوب کی ہو گی۔" وہ سہیلیوں کے سے انداز میں کرسی گھسیٹ کر پاس آ بیٹھا۔

"شاپنگ! ہاں کیوں نہیں..."

عماد نے کہا تھا۔ "امی نے دھمکی دی ہے۔ ان کی بہو کو شاپنگ نہ کروائی تو گھر آنے کی کوشش نہ کروں۔" ایسی ہی کوئی تاکید مختلف مقامات دکھانے کے بارے میں بھی شاید کی ہو۔ اسی لیے وہ اسے رسی سے بندھے قربانی کے جانور کی طرح پکڑ کر ہر جانا' نتھیا گلی اور دامن کوہ دکھا لایا تھا۔

"اچھا میں چلتی ہوں!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بتانے کو مزید کچھ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"آئے ہائے! سال بھر سے میرے گھر کا رزق کھا رہی ہے۔ اب کیا ضرورت کے وقت بھی کام نہیں آسکتی۔ سچ کہتی ہوں چاچی تم اور تمہارا خاندان، بہت احسان فراموش ہے۔"

دردانہ مامی کی کڑکتی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ دراصل مامی اسے اپنی بہن شاہینہ کے پاس کوئٹہ بھیجنا چاہتی تھی جس کے ہاں بچے کی ولادت متوقع تھی اور ایک بے زبان خدمت گار کی تلاش میں اس کی نظر انتخاب نازی پر آٹھہری تھی۔ خلاف توقع فجو خالہ کے منہ سے انکار سن کر مامی آپے سے باہر ہوگئی۔ فجو خالہ نے پہلی بار اس کی طرف داری کرنے کی جسارت کی تھی اور پہلی بار اسے فجو خالہ کی اس جسارت سے اتفاق نہ تھا۔ عارضی طور پر ہی سہی وہ اس شہر سے دور جانا چاہتی تھی۔ فرزانہ آپی اور عماد بھائی کی شادیوں کی تاریخ دو ہفتے بعد کی رکھی گئی تھی۔ اس کے لیے اویس کے ہاتھ کارڈ بھیج دیا گیا۔ کیا اب وہ اتنی بے وقعت ہوگئی تھی کہ کسی ایک نے بھی خود آکر دعوت دینا ضروری خیال نہ کیا۔ کیا واقعی مامی کا خوف اس قدر طاری تھا سب پر.....

"مامی! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں کوئٹہ جانے کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے میز پر پڑے شادی کارڈ پر آخری نظر ڈالی اور فیصلہ سنا دیا۔ رضا مندی دیتے ہی مامی اس پر صدقے واری ہوگئی۔ زندگی میں پہلی بار..... مگر اچنبھا کیسا! اس کی زندگی میں چونکا دینے والے واقعات کی ایک لمبی فہرست تھی جو پہلی بار رونما ہوئے اور زندگی کا دھارا بدل گیا۔

☼ ☼ ☼

فجو خالہ کا بیٹا اسے کوئٹہ چھوڑ گیا تھا۔ ایک بار پھر نیا ماحول نئے لوگ، وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی، لیکن شاہینہ باجی بہت اچھے طریقے سے ملیں۔ وہ مامی سے قدرے مختلف اور خاصی معقول عورت تھیں، ان کی چار سالہ بچی سے بھی نازی جلد ہی گھل مل گئی۔ چھوٹا سا گھر اور مختصر کنبہ میاں بیوی اور بچی اب چوتھی وہ۔ شاہینہ باجی کے تین مس کیرج ہو چکے تھے۔ اب کی بار ڈاکٹر نے بہت احتیاط کی تاکید کی تھی۔ وہ سارا وقت لیٹی رہتیں۔ نازی جھٹ پٹ کام نبٹا لیتی۔ دن کا باقی حصہ گپ شپ لگاتے اور بچی سے کھیلتے گزرتا۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا سوائے..... قدیر بھائی کے۔ اس کی نگاہیں اجلے پن کے مفہوم سے آگاہ نہ تھیں۔ نازی کو سامنا ہونے پر خوف آتا، لیکن کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"میں نے کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔" وہ خود کو تسلی دیتی، لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ جن چند مہینوں کے ایک ایک دن کو وہ گن کر گزار رہی تھی، وہ اس قدر پھیلے کہ اسے ساری گنتی سارے حساب بھولنے لگے۔

شاہینہ باجی کا ایک بار پھر مس کیرج ہو گیا..... کمزوری، صدمہ اور پھر اس بار پیچیدگی بھی زیادہ تھی۔ وہ چالیس روز بعد بھی بستر سے اٹھنے کے قابل نہ تھیں۔ نازی کی واپسی کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔

مامی کا فون اکثر آتا۔ وہ بہن کی طبیعت دریافت کرکے بند کر دیتیں۔ کاش کوئی خود سے ہی اسے لینے آجائے۔ اویس بھی اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں، بہن کو بھولا ہوا تھا۔ وہ اکیلے میں بیٹھ کر سوچوں کے تانے بانے بنتی، لیکن واپسی کا تقاضا کرتے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ شاہینہ باجی کی طبیعت تھی کہ روز بروز پہلے سے زیادہ خراب ہوتی جارہی تھی۔ ان کا خیال رکھنے کو وہ دل و جان سے تیار تھی، مگر اس میلی نگاہ والے بھیڑیے کا کیا کرتی، جو کب سے گھات لگائے اپنے شکار کی کسی چھوٹی سی چوک کا منتظر تھا۔

☼ ☼ ☼

"بہت اچھا کیا! فرزانہ آپی جو چلی آئیں، میرا بھی بہت دل چاہ رہا تھا آپ سے گپ شپ کرنے کو۔" نازی آگے بڑھ کر خوش دلی سے گلے ملی اور انہیں اندر لے آئی۔

"ارے واہ بھئی! تم نے تو گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی گھر ہے، جسے شہلا نے کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔"

وہ جوش میں کہتے ہوئے آخری جملے پر خود ہی جھجک کر رک گئیں۔ شاید غیر ضروری بول گئی تھیں، جواباً نازی بھی پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

"آپ یہ بتائیں۔ کیا کھائیں گی۔ میں جھٹ پٹ بناؤں گی پھر بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔" اس نے ارادتاً گفتگو کا رخ بدلا تھا ان کے چہرے سے شرمندگی کے آثار کم کرنے کے لیے۔

"ارے نہیں بھئی۔ امی کھانا بنوا رہی ہیں، سب وہیں چل کر اکٹھے کھائیں گے۔ تم بس بیٹھو میرے پاس۔ آج میں صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔" انہوں نے نازی کو بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔

"انسان جنت میں آئے اور جنت کا میوہ نہ کھائے..... یہ تو کفران نعمت ہے۔"

جواد نے باآواز بلند اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔

دونوں بے اختیار ہنس دیں۔

"نازی! تم نے اس چٹورے کو زیادہ ہی شہہ دے رکھی ہے، پہلے بھی کھانے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اب تو بالکل ہی اپنے شاہی ریڈارز (قوت شامہ) تمہارے کچن کی طرف لگا کر بیٹھا رہتا ہے۔"

وہ کھسیانا سا ہو کر کان کھجانے لگا۔

"ایسی بات نہیں ہے آپی! میں جب بھی کوئی اچھی ڈش بناؤں تو خود ہی اسے بلا لیتی ہوں۔"

نازی کی حمایت پر وہ اکڑ کر کالر جھاڑنے لگا تھا، لیکن اگلے ہی جملے پر پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آخر کو یہ میرا بھائی بھی ہے اور سہیلی بھی۔"

"دو دو خواتین کے درمیان آج میری دال نہیں گلے گی۔" وہ گھبرانے کی اداکاری کرتا ہوا چلا گیا۔

"آپی! شہلا کیسی تھی؟" نازی نے بلا تمہید بات شروع کی تھی۔ فرزانہ خاموشی سے اس کے چہرے کو تکنے لگی تھیں، پھر کچھ ٹھہر کر کہنے لگیں۔

"جو لڑکی سسرال میں داخل ہونے سے پہلے ہی گھر تقسیم کروا دے اور جس کی فرمائش پر بوڑھی ساس اپنا کمرا کیا پورا گھر چھوڑ کر اوپر کے پورشن میں رہنے لگے تاکہ بیٹے کا گھر متاثر نہ ہو..... بہو پھر بھی اس بنے بنائے گھر کو سنبھال سکے نہ گھر والے کو تو..... تو وہ کیسی ہو سکتی ہے نازی!" انہوں نے چند جملوں میں شہلا کی شخصیت کا خاکہ پیش کر دیا تھا۔

"پھر بھی..... عماد کے دل میں تو وہی بستی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی نازی کے منہ سے پھسل گیا۔

"ہاں، کیوں کہ محبت خود غرض ہوتی ہے۔ اپنے سوا کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتی۔" انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

"وہ شادی سے پہلے بھی ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی اور بعد میں بھی بڑے باپ کی بیٹی ہی رہی۔ اس گھر کو نہ اپنا سکی۔ اس نے محبت تو کی تھی، مگر نبھا نہ پائی۔"

"اور ایک میں ہوں جو نوعمری کی محبت آج بھی نبھا رہی ہوں۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔

"محبت اگر محبوب کے لیے جھکنا نہ جانتی ہو تو فقط کاٹنے والے تنگ جوتے کی مانند رہ جاتی ہے۔ جتنی دیر تک پہنے رکھو گے، زخم گہرا ہوتا جائے گا۔ عماد بھی شاید ایسے ہی کسی احساس سے دوچار ہو گیا تھا ورنہ جتنے چاؤ سے اسے بیاہ کر لایا اور پورے چار سال جتنی والہانہ محبت اس پر نچھاور کرتا رہا۔ اس سب کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک صرف اولاد نہ ہونے پر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ طلاق ہی دے ڈالی جبکہ ہم لوگوں نے نہ کبھی اس کمی کا احساس دلایا نہ ہی دباؤ ڈالا۔"

وہ ماضی کی کچھ گتھیاں نہ سلجھ پانے پر الجھ رہی تھیں۔ نازی کی سمجھ میں آگیا تھا کہ جذبات میں آکر کیے فیصلوں کا وقتی غبار جب بیٹھتا ہے تو وہ شخص ہوتا ہے اور پچھتاووں کی دلدل..... عماد بھی اب عمر بھر نکل نہیں پائیں گے اس دلدل سے۔

☼ ☼ ☼

"آخر کب تک کھیلتی رہے گی یہ آنکھ مچولی مجھ

سے۔"

انتہائی قریب سے اس کی دبی دبی غصیلی آواز ابھری تھی۔ ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر سنک میں جا گری۔ وہ برتن دھونا چھوڑ کر دیوار سے جا لگی۔

"میرے صبر کو اور کتنا آزمائے گی۔ چار سال بیت گئے تیرے نخرے اٹھاتے۔ یاد رکھ! زبردستی کرنے پر آؤں تو اگلا پل نہ آنے دوں۔"

قدیر نے اسے چوٹی سے پکڑ کر جھٹکا دیا تھا۔ وہ سسک کر رہ گئی۔ ذرا سی آواز بھی نکلتی تو ساتھ والے کمرے میں لیٹی شاہینہ باجی تک با آسانی پہنچ جاتی۔ یہ بھرم وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ دن تو جیسے تیسے گزر ہی جاتا تھا، مگر رات..... ہر رات، بہت بھاری ہوتی تھی۔ گزشتہ چار سالوں میں ان گنت راتیں اس نے چھوٹی سی سحر کے وجود سے چمٹ کر جاگتے ہوئے گزاری تھیں۔ برابر والے بیڈ پر لیٹی شاہینہ باجی کی بے خوابی کی گواہی پلنگ کی "چوں چوں" دیتی۔ اس کی طرح شاید وہ بھی ان دنوں سوتی تھیں، جب گھر میں کوئی مہمان ٹھہرا ہوتا یا قدیر گھر پر نہ ہوتا۔ شب کا مہمان قدیر گھر آتا تو اسے بے شمار کام یاد آجاتے۔ بار بار اسے پکارتا۔ وہ بھی کبھی سحر کو بھیج دیتی۔ کبھی سحر کو ساتھ لے کر چلی جاتی۔

"کام نمٹا کر میرے کمرے میں آنا۔" وہ موقع ملتے ہی سرگوشی کرتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں مانے گی۔ اگلی صبح قدیر کا غصہ اشیا کی اٹھا پٹخ پر نکلتا۔ وہ کانوں میں کڑوا تیل ڈال لیتی۔

آج بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔ وہ بکتا جھکتا باہر چلا گیا تو اس نے شکر کیا، مگر اب شام ڈھلے لوٹا تھا تو غصہ ہنوز قائم تھا۔ اس کی چٹیا کو ایک جھٹکے سے چھوڑ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اسی تیزی سے واپس پلٹ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"جسے تو نے اپنی بیساکھی بنا رکھا ہے، وہ بہت کمزور سہارا ہے۔ کیا سمجھتی ہے اس کے پیچھے چھپ کر بچ جائے گی... لگتا ہے قطرہ قطرہ زہر پی کر مرنا اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ یہ قصہ میں آج ہی ختم کر دیتا ہوں۔" وہ کچن سے نکل کر کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اس کی مبہم باتوں میں الجھی وہیں کھڑی الجھ رہی تھی۔

"قطرہ قطرہ زہر... قصہ ختم کر دیتا ہوں... کیا مطلب... کہیں شاہینہ باجی کی نامعلوم اور اتنی طویل بیماری کی وجہ... او میرے اللہ۔"

وہ تیزی سے اس طرف لپکی۔ کمرے کے دروازے تک پہنچی تو وہ گلا دبا کر سچ مچ "قصہ" ختم کر چکا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہو ، مکروہ انداز میں ہنس دیا۔

"سحر... سحر!" سحر باہر گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بھاگی لیکن دروازے پر موٹا سا تالا دیکھ کر رک گئی۔

"سحر کو میں نے محلے کے بچوں کے ساتھ میلے میں بھیج دیا ہے۔" وہ مکمل منصوبہ بندی کر چکا تھا۔

"بی بی گل... بی بی گل مجھے بچاؤ۔" اب آخری امید پڑوسن خالہ تھی۔ وہ حلق کے بل چیختی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بھاگنے لگی لیکن ایک ہی جست لگا کر وہ راستہ روک چکا تھا۔

"کیوں خود کو تھکاتی ہے میری شہزادی! تیری بی بی گل تو ہفتے بھر سے میکے میں ہے اور اس کا شوہر ابھی منڈی سے نہیں لوٹا۔"

قدیر نے اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو چھڑاتے ہوئے جتنی قوت سے چیخ سکتی تھی، چیخ رہی تھی۔

"اللہ..." اس سے پہلے کہ قدیر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیتا۔ اس نے اصل در کھٹکھٹا دیا تھا۔ اگلے ہی پل بیرونی دروازہ باہر سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

"کیا بات ہے بچہ! روتا کیوں ہے؟" بی بی گل کا شوہر خان چاچا پکار رہا تھا۔ دروازہ کھلنے میں دو منٹ کی تاخیر ہوتی تو وہ دیوار پھلانگ کر اندر آجاتا۔

☼ ☼ ☼

وہ چار سال نہیں چار صدیاں تھیں جنہیں کاٹ کر اپنے شہر کی فضاؤں میں دوبارہ سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ وقت کی گاڑی کتنے اسٹیشن آگے بڑھ چکی تھی۔ اویس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے میٹرک کا طالب علم نہیں لمبا اونچا نوجوان کھڑا تھا۔ جواد اور اویس نے انٹر کرلینے کے بعد اکٹھے آئی ایس ایس بی لونگ کورس کے لیے اپلائی کیا تھا۔ جواد تو ٹیسٹ کلیئر نہ کر سکا۔ البتہ اویس آج کل کاکول ملٹری اکیڈمی میں زیر تربیت تھا۔ نہ صرف اسے یہاں تک پہنچانے میں انکل جرار کا بھرپور مالی اور اخلاقی تعاون شامل تھا بلکہ ان کا گھر کھلوا کر اس کی ضروری مرمت بھی کروادی تھی۔ جہاں اب نجو خالہ بھی ان بہن بھائی کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔

ایک سلگتی شام کی راکھ اب بھی اس کے وجود میں شور مچاتی تھی۔ اس شام پل بھر کی تاخیر اسے ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں دھکیل دیتی مگر اللہ نے اسے بچا لیا تھا۔ ادھر قدیر دروازہ کھولتے ہی چاچا سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگا۔

"میری بیوی مجھے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی چاچا!" وہ جو قدیر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی تمنا کر رہی تھی "ہقصلی" خاموش ہو گئی۔ پڑوسیوں نے اس سے نمبر لے کر لاہور فون کر دیا تھا۔ اگلے ہی دن ماما، مامی اور نجو خالہ کے ساتھ اویس اور جواد بھی آگئے تھے اور وہ اپنا سامان باندھ کر خود بخود تیار ہو گئی۔

"راحیلہ آنٹی کیسی ہیں اور فرزانہ آپی، وہ کہاں ہوتی ہیں۔"

اس نے گھر پہنچنے تک انتظار نہیں کیا تھا۔ راستے میں ہی شروع ہو گئی۔

"دونوں ٹھیک ہیں۔ تمہیں یاد کرتی ہیں۔" اویس کے سیدھے سادے جواب سے جواد کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"فرزانہ آپی کا سونامی اور ان کی طوفان میل جو ہر وقت نازی خالہ، نازی خالہ کرتے ہیں۔ وہ نہیں بتاؤ گے۔" اس کے لڑاکا عورتوں والے انداز پر سب کو ہنسی آگئی۔

"اور عماد بھائی... ان کی مسز... وہ کیسے ہیں؟" اس کا سوال اتنا مشکل تو نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"کیا بات ہے، چپ کیوں ہو گئے۔ جواب تو دو۔" نازی کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

"دراصل... عماد بھائی نے شہلا بھابھی کو طلاق دے دی ہے اور بچے وچے نہیں ہیں ان کے۔" جواد مختصر سا جواب دے کر گاڑی سے باہر دیکھنے لگا تھا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"محبت، شادی، اولاد نہ ہونا... پھر طلاق... محبت ختم!"

گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی وہ سب اسے ملنے آئے تھے۔ ان سب میں بس ایک وہی چہرہ نہیں تھا، جسے سب سے پہلے آنا چاہیے تھا اور کوئی ناتا نہ سہی مگر وہ اس کے دوست، غم گسار، اس کے ہمدرد تو رہے تھے۔ شاید اب اس رشتے کی اہمیت نہ رہی تھی۔

"عماد بھائی کیوں نہیں آئے؟" آخر اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"عماد اب وہ عماد کہاں رہا ہے۔ کم گوئی گونگے پن میں بدل گئی ہے۔ ملنا جلنا آنا جانا سب ختم۔ اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔" فرزانہ آپی نے اداس لہجے میں بتایا تھا۔

"ٹوٹ کر بکھر گیا ہے میرا بچہ!" راحیلہ آنٹی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"اللہ کرے اس کے بکھرے وجود کو سمیٹ لینے والی کوئی اس کی زندگی میں آجائے۔"

نازی کو دیکھ کر آنٹی کی آنکھوں میں ایک خواہش جاگی تھی، جسے سمجھ کر نازی نے سر جھکا لیا۔ عماد اس کے دل کے صحرا پر برسنے والی پہلی بارش کی طرح تھے۔ ایک طویل اور صبر آزما مسافت کے بعد ہی سہی، قدرت اگر وہ نام اس کے نصیب میں لکھنے جا رہی تھی تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مفہوم سب ہی کو بھا گیا تھا لیکن عماد۔

انہیں منانے کے لیے آنٹی کو خاص طور پر محنت

کرنا پڑی۔

☼ ☼ ☼

"ارے۔ ارے دیکھ کر بھئی احتیاط سے چلو۔"

وہ کچن سے نکل کر سیدھی ان ہی کی طرف آرہی تھی۔ اس کے راستے یعنی پورے لاؤنج میں ہر روز کی طرح کوئی بھی چیز بظاہر بے ترتیب یا اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نظر نہ آتی تھی مگر ہوتا یہی کہ وہ چلنے کا ارادہ کرتی اور کوئی نہ کوئی شے 'کرسی کا پایہ' میز کا کنارہ ٹھوکر کھانے خود ہی اس کے قدموں میں آتے۔ پھر وہی عماد کا آگے بڑھ کر اسے تھام لینا۔ نصیحتیں کرتا ان کا فکر مند لہجہ اور اپنی مسکراہٹ کو بمشکل چھپاتے ہوئے ان کی بانہوں میں بڑے مان کے ساتھ سمائی۔ نازی۔

ایک چھوٹی سی خوش خبری نے سارا منظر ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ جو ابھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا' اس کی آمد کی پیشگی اطلاع نے سوئے ہوئے شہزادے کو ایک لخت بیدار کردیا تھا۔ عماد جیسے خود بخود اپنے خود ساختہ خول سے باہر آگئے تھے۔ باقی سارا محل تو پہلے ہی نازی نام کے سحر کا اسیر تھا۔ اب یہ جادو مزید سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

راحیلہ آنٹی باوجود جوڑوں کے درد کے ہر روز نیچے آتیں' تاکہ ۔ دم کیا پانی اپنے ہاتھوں سے اسے پلا سکیں۔ فرزانہ آپی دن میں کئی مرتبہ فون پر اپنے تجربات اور مفید مشوروں سے اسے نوازتیں' انکل اور جواد کی خوشی کے تو کیا ہی کہنے۔ اب عماد کی طرف سے بھی کوئی کسک باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ خوش تھی مطمئن تھی مگر کبھی کبھی ایک خیال ایک سوچ اس کی ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیتا۔

"شہلا کی طرح اگر میں بھی ماں نہ بن پاتی تو کیا عماد مجھے بھی۔ کیا اولاد کا ہونا اس قدر اہم ہے۔ میاں بیوی کا باہمی رشتہ۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں؟

صرف ایک چیز کے ہونے سے عورت معتبر ہے' ورنہ اس کی اپنی شناخت کہاں گئی!

مرد۔ بحیثیت مرد۔ مکمل!

عورت بحیثیت عورت۔ کچھ بھی نہیں!

روز بروز بڑھتی ہوئی ان سوچوں نے اس پر ڈپریشن طاری کردیا تھا۔ ڈاکٹر ہر بار خوش رہنے' اچھا سوچنے کی تلقین کرتی مگر عمل صفر۔ آخر اسے عماد کو اکیلے میں بلا کر ہدایات دینی پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب کیا ہے اور ادھر کیوں رکھا ہے؟" اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر لاؤنج میں دھری پرانی اشیا کے ایک ڈھیر پر پڑی۔ رنگ برنگ کے زنانہ کپڑے، جوتے و دیگر استعمال کی اشیا پرانے البمز۔

"بیگم صاحبہ! آج صبح صبح عماد صاحب نے اسٹور کی صفائی کروائی ہے اور یہ فالتو سامان نکالا ہے۔ کہہ رہے تھے۔ تم نے لینا ہے تو رکھ لو ورنہ کسی اور کو دے دینا۔"

حمیدہ نے اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔ اسے حال ہی میں عماد نے کل وقتی ملازمہ کے طور پر رکھا تھا۔

"آج تو سنڈے ہے۔ جلد اٹھ گئے تھے تو مجھے بھی جگا دیا ہوتا۔" اس کی خود کلامی پر حمیدہ خاموش رہی تھی۔

"اور ناشتا۔۔۔ ناشتا کرلیا عماد نے؟"

"نہیں ابھی نہیں' اب ساتھ کریں گے۔" لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے عماد نے جواب دیا تو حمیدہ کچن میں چلی گئی۔ نازی ایک بار پھر اشیا کے ڈھیر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"یہ۔ یہ غالباً" شہلا کا سامان ہے۔ آپ اسے پھکوا رہے ہیں!" وہ متحیر تھی۔

اس کی ضرورت کا ہوتا تو لے جاتی۔ کسی کا بے کار سامان' ہم اپنے گھر میں کیوں جمع کیے رکھیں' عماد کا لہجہ لاپروا سا تھا مگر کھوجتی نظریں نازی پر مرکوز تھیں۔

"صرف بے کار سامان ہے۔ اس سے وابستہ یادیں نہیں؟" شہلا کا براہ راست ذکر پہلی بار دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ نازی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا

جبکہ عماد کی زیر لب مسکراہٹ گہری ہو کر پورے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ وہ اتنے دنوں سے ڈاکٹر کی ہدایت پر نازی کے ڈپریشن کی وجہ دریافت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ آج کوئی نہ کوئی سرا ہاتھ آہی گیا۔

"اس کی محبت کو بھی یوں ہی بے کار جان کر دل سے نکال۔۔۔ نکال پائیں گے؟" آخر وہ ہمت کر کے سب کہہ گئی۔ جواباً" عماد کا قہقہہ کمرے میں گونج رہا تھا۔

"آؤ۔ آج تمہیں اپنے بارے میں سب بتاتا ہوں۔" نازی کا ہاتھ پکڑ کر وہ صوفے پر آبیٹھے۔

"شہلا میری کلاس فیلو تھی۔ بہت ذہین' ایکٹو اور حاضر جواب۔ دوسرے کلاس فیلوز کی طرح میں بھی اس کی ان خوبیوں کو اور ان کی وجہ سے اسے پسند کرتا تھا' لیکن یہ پسندیدگی اتنی ہی تھی۔ جیسے ہی ایم بی اے مکمل ہوا سب ہی نئی منزلوں کی تلاش میں اپنی اپنی راہ پر چل نکلے۔ تم بھی جانتی ہو اچھی ملازمت کی تلاش میں میں بھی ایک عرصہ سرگرداں رہا۔"

عماد رک کر کچھ سوچنے لگے پھر مبہم سا مسکرا دیے۔

"یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ جب شہلا نے فیس بک پر مجھے اپروچ کیا تھا۔ باقاعدہ دوستی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کررہی تھی۔ وہاں ایک سیٹ خالی ہوئی تو اس نے میری سی وی ریفر کردی۔ یوں ہم کولیگز بن گئے۔ کمپنی میں وہ بہت اہم پوسٹ پر کامیابی سے اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اس کی خوبیوں کا معترف ہوا۔"

"پسندیدگی ہی تو محبت کا پہلا زینہ ہے۔" نازی کی دھیمی سی سرگوشی پر عماد نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں! جیسے تم چپکے چپکے مجھ سے محبت کرنے لگی تھیں۔" اب کے چونکنے کی باری نازی کی تھی۔

"جواد نے مجھ پر یہ انکشاف تمہارے جانے کے بعد کیا تھا۔ تب تک میں شہلا کی ممی کو زبان دے چکا تھا۔ ایک روز وہ مجھے اپنی ممی سے ملوانے کے لیے اپنے گھر لے گئی۔ وہاں اس کی ممی نے باتوں باتوں میں کہہ

ڈالا کہ اگر میں شہلا میں دلچسپی رکھتا ہوں تو اپنے گھر والوں کو لے کر آؤں۔ شہلا بہت شرمندہ ہوئی تھی ان کی اس قدر کھری بات پر اور میں نے اسے شرمندگی سے نکالنے کے لیے امی ابو کو جلد لانے کا وعدہ کر ڈالا۔ اگلے روز آفس گیا تو ارادہ شہلا سے معذرت کرنے کا تھا لیکن جب سامنا ہوا تو کچھ بولا ہی نہ گیا۔ کہا تو صرف اتنا ڈو یو میری می؟ وہ ہرگز نہ چونکی بلکہ اس کی آنکھوں کی بڑھی ہوئی چمک کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی۔"

"محبت کرنے سے زیادہ نبھانا اہم ہے اور آپ نے صرف اولاد کی خاطر اسے طلاق دے دی۔" عماد کو احساس ہوا نازی اس کی محبت کہانی سے بے زار ہو رہی ہے۔

"اوہ!" وہ محتاط ہوئے۔ "تم سے کس نے کہا میں نے محبت نہیں نبھائی۔ اس گھر کے در و دیوار میری ہر کوشش کے گواہ ہیں۔" عماد نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

"دراصل ہم دونوں جسے محبت سمجھتے تھے۔ وہ وقتی پسندیدگی تھی یا پھر ظاہری کشش۔ اس کی وہ خوبیاں جو بحیثیت ساتھی طالب علم اور کولیگ مجھے متاثر کرتی تھیں شادی کے بعد پس منظر میں چلی گئیں اور بحیثیت بیوی اور بہو کا کردار مجھے مایوسی میں مبتلا کرنے لگا۔ کچھ ایسا ہی حال اس کا بھی تھا۔ شادی سے پہلے گھر سے باہر کے ماحول میں مرد اور عورت کا تعلق جو فینٹسی کری ایٹ کرتا ہے شادی کے بعد کی عام گھریلو زندگی اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے لیکن شہلا اس فرق کو سمجھ نہ سکی۔ وہ عملی زندگی کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ میں نے ان حالات کے باوجود اس کا پورا ساتھ نبھایا۔ اسے سسرال میں رہنا پسند نہیں تھا لہٰذا امی ابو اور جواد اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئے۔ اس نے کہا دو سال تک بچے کا نام نہ لینا۔ میں نے مان لیا۔ اسے گھر کے کام کرنا پسند نہ تھا، ہر کام کے لیے ملازم آ گئے۔ یہ سب میرا کو آپریشن نہیں تو اور کیا تھا۔" نازی قائل ہونے کے انداز میں خاموش تھی۔

"لیکن اب تمہیں وہ بات بتانے جا رہا ہوں، جو آج تک کسی سے نہیں کہہ پایا۔ شادی کے تیسرے سال بھی جب ہم فیملی شروع کرنے میں ناکام رہے تو شہلا مجھے زبردستی اپنے ساتھ ڈاکٹر سلمان کے پاس لے گئی۔ وہ شہلا کا کزن بھی تھا۔ حال ہی میں امریکہ سے ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ اس نے ہمارے کچھ ٹیسٹ وغیرہ کروائے تھے جن کی رپورٹس میرے لیے بہت بڑا طوفان لے کر آئیں۔ میری زندگی کا سکھ چین سب برباد ہو گیا۔ ان رپورٹس کے مطابق میں باپ بننے کی اہلیت سے محروم تھا۔"

"کیا! مگر۔ مگر میں؟" نازی حیرانی کے ساتھ ساتھ بدحواسی کا بھی شکار ہوئی۔

"اس نے جھوٹی رپورٹس بنوائی تھیں۔ محبت کی جس جھوٹی فینٹسی کا شکار ہو کر اس نے مجھ سے شادی کی تھی، وہ جلد ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب ڈاکٹر سلمان شاہ کے روپ میں ایک بہتر آپشن اور ہم پلہ شخص نظر آیا تو مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ خود بخود ہو گیا۔ ان دونوں نے مل کر خاص منصوبہ بندی کے تحت ایسے حالات پیدا کیے کہ میں طلاق دینے پر مجبور ہو گیا۔ ہر وقت کے طعنے، لڑائی جھگڑا۔ محرومی کے احساس نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔"

"مجھ سے شادی سے انکار کی بھی یہی وجہ تھی۔"

"ہاں یقیناً" "تم سے کیا میں کسی سے بھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا نامکمل شخص کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ حقیقت جان لینے کے بعد دوبارہ اپنی ذات کا تماشا بنانے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔" عماد کا لہجہ دھیما اور غمگین تھا۔

"آپ کو میری محبت پر اعتماد نہیں تھا؟" نازی نے تڑپ کر پوچھا۔ "جانتے تھے نا آپ میں تو بچپن سے صرف ایک ہی خواب، صرف ایک چہرے کی اسیر ہوں۔"

" اسی ایک بات کا اعتبار ہی تو تھا۔ اسی اعتبار کے سہارے باقی عمر جی لینے کا خواہاں تھا لیکن اگر شادی کے بعد میرے ادھورے پن کی حقیقت کھلنے پر تم بھی مجھے

چھوڑ دیتیں تو پھر زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہ رہتا۔"

"میں آپ کو چھوڑ سکتی ہوں یہ سوچ بھی کیسے لیا۔ میرے دل کی پیاسی زمین پر گرنے والا بارش کا پہلا قطرہ آپ ہیں اور مٹی اپنی پہلی بارش کبھی نہیں بھولتی۔"

"تم بھی میری زندگی میں بہار بن کر آئی ہو۔ یقین مانو! گزرے ہوئے ہر موسم کی یاد میرے دل سے مٹ گئی ہے۔ اب میں، میرا گھر اور میرا دل صرف تمہارا ہے۔" عماد اس کے چہرے پر پھیلتے ہوئے اطمینان کے گہرے رنگوں کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اچانک سیل فون کی بیپ بجی اور ان کی شوخ نظروں کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔

"ہیلو عماد پلیز! فون بند مت کرنا۔ آج میری بات پوری سن لو۔" سیل سے ایک جانی پہچانی آواز ابھری تھی۔

"عماد! میں بہت شرمندہ ہوں۔ تمہیں دھوکا دے کر کبھی خوش نہیں رہ پائی۔ سلمان نے بھی مجھے چھوڑ دیا ہے۔"

"ہیلو۔ ہیلو، آواز نہیں آ رہی۔" عماد گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "موسم خراب ہے شاید اسی لیے سگنل نہیں آ رہے۔"

نازی سے کہتے ہوئے وہ باہر لان کی طرف نکل گئے۔

"ارے رکیں تو۔ باہر بارش ہونے والی ہے اور آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ شہلا کے جھوٹ کا پول کیسے کھلا؟"

وہ لپک کر دروازے تک آئی، پھر وہیں رک گئی۔ عماد سامنے ہی موسم کی پہلی بارش میں کھڑے بھیگ رہے تھے۔

"یہ سب تم مجھے بتا چکی ہو۔ غلطی کا اعتراف کر لیا۔ معافی بھی مانگ لی، میں نے معاف کر دیا۔ اب کیا چاہتی ہو؟" عماد سیل کان سے لگائے کھردرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"عماد! وہ۔ بات یہ ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ پہلی محبت بھلائے نہیں بھولتی۔ میری طرح شاید تم بھی اس کرب سے گزر رہے ہو اسی لیے سوچا۔" شہلا غمگین لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" عماد نے اس کی بات کاٹی۔ "کہاں لکھا ہے کہ صرف پہلی محبت ہی امر ہے۔ خلوص، باہمی احترام اور نیک نیتی پر مبنی یہ جذبہ کہیں بھی انسان پر مہربان ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر محبت میں یہ اجزا نہ ہوں تو بھلے پہلی ہو یا آخری، مگر وہ محبت نہیں ہے۔ پھر ایسی محبت کا کیا کرنا جو اپنے چاہنے والے کے عیب ہی نہ ڈھانپ سکے۔ سربازار بے حجاب کر دے۔ باز آیا ایسی خرافات سے۔ مجھے اپنی سچائی اور خلوص پر مبنی اسی دنیا میں رہنے دو، جسے تم نے پا کر گنوا دیا تھا مگر میں ایسی غلطی دوبارہ نہیں کروں گا۔"

عماد نے رابطہ منقطع کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نازی دروازے میں کھڑی گھبرائی ہوئی نظروں سے اسی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیے۔

"موسم کی پہلی بارش اکثر نقصان دہ ہوتی ہے۔" انہوں نے سر اٹھا کر ہلکی ہلکی بوندا باندی برساتے آسمان کی طرف دیکھا پھر بالوں کو جھٹک کر پانی جھاڑتے ہوئے اپنی جنت کی طرف چل دیے۔

✡

شاہ جہاں گل

محبت سُرخ گلاب جیسی

شام ابھی ڈوبی نہیں تھی کہ وہ چلی آئی۔ اکیلی نہیں تھی، ساتھ میں وہ بھی تھا۔ وہ بھی شام جیسا تھا ادھورا اور دکھی۔ وہ خود سویرے جیسی تھی من چلی، نکھری نکھری اور پُر امید۔۔۔۔

وہ دونوں جب صوفوں پر بیٹھ چکے تو میرے گھر میں زندگی مکمل ہو گئی۔

"شام اور صبح تو اب تک مل ہی نہیں سکے ہیں۔" دونوں کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح سوچا۔

صبح جیسی عبیر ماہتاب کی آنکھیں ہلکی سی سوجی ہوئی تھیں۔ گال ذرا ذرا سرخ تھے جیسے بے اختیار بہتے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتی رہی ہو۔

شام جیسے اسفند عمر کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔

بہت گہری اداسی ہو تو آنکھوں میں بھی تاثر آکر تو بیٹھ جاتا ہے نا۔ مجھے کسی اور کی آنکھیں یاد آئیں۔

مجھ میں عبیر بستی تھی اور اسفند میں وہ دکھتا تھا۔ وہ جو اسی شہر میں تھا، مگر میری زندگی میں کہیں نہیں تھا۔

اسی لیے اسفند اور عبیر جب بھی آتے تھے۔ میں خوش ہوتی تھی مگر جب وہ ساتھ بیٹھتے تھے تو میں اداس ہو جاتی تھی۔

"آج پھر اس نے مجھے تنگ کیا ہے صالحہ!" سب سے پہلے اسفند بولا۔

"اور مجھ سے پوچھیں صالحہ! میں خود کتنا تنگ ہوں اس سے۔" کہتے ہوئے عبیر کی سرمئی آنکھیں ذرا سی بھیگیں۔

ناولٹ

"اب کیا ہوا؟" اب بولنے کی میری باری تھی، سو دونوں سے سوال کیا۔

"کچھ ہوا ہی تو نہیں۔" سرمئی آنکھوں والی پری ساری دنیا سے ناراض لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے نظر ہٹا کر اسفند پر ٹکائی۔

"یہ کچھ نہیں سمجھتی صالحہ!" اسفند کا لہجہ بے چارگی کا بوجھ لیے ہوئے تھا۔

"تو اس کا حل کیا ہے آخر؟" میں نے اپنی باری نبھائی، سوال کیا۔

"وہ اس سے پوچھیں اور پوچھ کر مجھے ضرور بتائیں۔" کہتے ہوئے عبیرہ نے ذرا سا اسفند سے رخ موڑا تھا۔

"میں اسے بتا چکا ہوں یہ سمجھتی ہی نہیں۔" اداس آنکھوں والے شہزادے کی آنکھوں میں تکلیف سی جاگی۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ تب تک تم لوگ تھوڑی دیر ٹی وی سے ٹائم پاس کرو۔" میرے پاس سوال ختم ہوگئے تو میں اٹھ کر کچن میں آگئی۔

تھوڑی دیر بعد تین کپ ٹرے میں رکھ کر واپس لاؤنج میں آئی تو ٹی وی چل رہا تھا اور وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔

"بس یونہی لڑتے رہو گے؟ آخر کیا سوچا ہے تم دونوں نے..." دونوں کو کپ پکڑاتے میں نے باری باری دونوں کے خاموش چہروں کو دیکھا۔

"امید لگاتا ہوں، دعائیں کرتا ہوں، کوششیں جاری ہیں، اس کے علاوہ اور کیا کروں؟" اسفند نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ آپس میں لڑتے رہتے ہو، میں جانتی ہوں کہ ایک دوسرے کے لیے ہی لڑتے ہو... مگر بہتر یہی ہے کہ تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرو۔ ان شاء اللہ سب اچھا ہوگا۔"

اس کے ساتھ میں انہیں ––– سمجھاتی رہی۔ وہ میرے پاس ان ہی لفظوں کو سننے آئے تھے گویا مجھ سے مزید محبت، ہمت اور محبت کی صداقت و طاقت کا یقین لے کر جاتے تھے۔ مجھے سنتے، کبھی ٹی وی پر نظر ڈالتے اور کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے وہ دونوں چائے پیتے رہے۔ میرے کپ میں چائے ٹھنڈی ہوتی رہی اور میں بولتی رہی۔ دل میں دبی سسکیوں کو باہر نہ لانے کی کوشش میں، میں بولتی ہی رہی۔

✲ ✲ ✲

اداس دل کی ویرانیوں میں
بکھر گئے ہیں گلاب سارے
یہ میری بستی سے کون گزرا
نکھر گئے ہیں گلاب سارے

بدلتے موسم کی وہ خوب صورت شام جب اس ستم گر کی گاڑی میرے گھر کے گیٹ پر آکھڑی ہوئی، ٹھنڈی سانس بھر کر میں کھڑکی سے ہٹی بال سنوارے اور نیچے آگئی۔

"کیسی ہو؟" کی چین ہاتھ میں پکڑے وہ سامنے سے آرہا تھا۔ پہلا جملہ پہلا سوال یہی ہوتا تھا اس کا... اس سوال کا جواب اتنا طویل ہوتا تھا کہ میں دے ہی نہ پاتی تھی۔ بس ذرا سا مسکرا کر اسے بیٹھنے کے لیے کہہ دیتی تھی۔

"یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا..." وہ ہمیشہ آنے کی وضاحت دیتا تھا حالانکہ میں جانتی تھی کہ جب جب اسے میری یاد آتی تھی تو وہ یہاں سے گزرنے کا سوچتا تھا۔

"کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟" تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"آدھا دن تو یونیورسٹی میں گزر جاتا ہے۔ گھر آکر تھوڑے بہت گھر کے کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر سو لیتی ہوں۔"

"ان سب کے علاوہ کیا کرتی رہتی ہو؟" اس کے اگلے سوال پر میں نے بے ساختہ سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، جس کی آنکھوں میں آج بھی مجھے اپنا آپ نظر آرہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اتنے کاموں اور مصروفیت کے بعد بھی میرے پاس بہت سارا وقت ابھی بھی بچتا ہوگا۔

"لکھتی ہوں..." میں نے کشن اٹھا کر گود میں رکھتے جواب دیا۔

"کیا...؟"

"محبت..." اس کے سوال اور میرے جواب کے بعد کچھ نہ رہا۔ وہ کی چین سے کھیلتا رہا۔ میں اسے دیکھتی رہی۔

"چائے پیو گے یا کافی بناؤں؟" بہت دیر بعد میں نے اپنے خالی بت سے آواز نکالی۔

"کافی..."

اس کا جواب سن کر میں کچن میں آگئی۔ وہ بھی پیچھے آگیا۔

ہم دونوں آج بھی ذہنی اور دلی طور پر اتنے قریب تھے جیسے محبت کے اولین دنوں میں ہوتے تھے۔ اسی طرح آج بھی ہمیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنا آپ نظر آتا تھا۔ بس یہ تھا کہ بیچ میں صدیاں حائل ہوگئی تھیں، جو نظر نہیں آتی تھیں مگر محسوس ہوتی تھیں۔

"تمہارا بھائی محبت کرنے لگا ہے، تم جانتے ہو؟" کافی کی شیشی اٹھاتے میں نے ذرا سا مڑ کر احمد عمر کو بتایا تھا۔

"جانتا ہوں..." کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکتا وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

"تم سے زیادہ محبت کرنے لگا ہے، یہ بھی جانتے ہو؟" میری بات پر اس بار اس نے جواب نہیں دیا۔

"میں جانتی ہوں..." میں نے خود کلامی کی۔

"تو تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ہمارے خاندان اور برادری میں رہ کر محبت نہیں کی جاتی۔" احمد عمر کھڑکی سے باہر جانے ایسا کیا دیکھنے میں محو تھا کہ میں اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئی۔

"کیوں نہیں کی جاتی... محبت تو ہو جاتی ہے۔ کوئی خاندان، کوئی برادری، ذات نسل، اونچ نیچ محبت کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ تم نے بھی تو کی ہے محبت... اسی خاندان کے ہو کر..." کافی پھینٹتے میں ایک دم تیز ہوگئی۔

"میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے تم یہ سمجھاؤ کہ ہمارے خاندانوں میں رہ کر محبت ہو جانا بڑی بات نہیں بس محبت کو پانا بہت مشکل ہے۔" کھڑکی کے پار وہ سرد اندھیرے میں اب بھی کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

گزرتے لمحوں کی چپ میں، میں کافی بنا چکی تو وہ لمبی سانس کھینچ کر میری طرف مڑا۔ "اندھیرے سے کچھ نہیں ملتا بس اعصاب تھک جاتے ہیں..." ٹیرس پر آکر ہم کافی پینے لگے۔

ہمارے اردگرد ادھوری محبت کے ادھار لمحے بے مول اڑتے بکھرتے مرتے رہے۔

"تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی احمد عمر!" کافی ختم کرنے کے بعد جب وہ کرسی سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے، بہت دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا تو میں نے اس کے ہاتھ کی پشت سہلائی۔

"ہوں..." جواب دیا، مگر آنکھیں نہیں کھولیں۔

"وہ لڑکی کیسی ہے؟"

"میرے جیسی..." بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا تھا مگر احمد عمر نے اب بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔

"تم اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤ گی نا!"

"نہیں..." میرے اس جواب پر اب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں میں سوال تھا، میں نے نظریں چرالیں۔

"میں خود کو نہیں سمجھا سکی اب تک تو اسے کیا سمجھا پاؤں گی۔" کہہ کر میں نے رخ پھیر کر آنکھیں پوری کھول کر ہونٹ بھینچ لیے۔ سرد ہوا میری آنکھوں میں گھس کر نمی خشک کرنے لگی۔

"تو مت کہو کہ وہ تمہارے جیسی ہے۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے رخ نہیں موڑا۔ میری آنکھوں

کی نمی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ اس شخص نے نہ بلایا نہ ہی سنبھالا۔۔۔ کمرے سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کپ اٹھا کر میں کچن میں آگئی۔ ہر طرف اس شخص کی خوشبو تھی، جو میرا نہیں تھا مگر میں اس کے علاوہ کسی کی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

دھوپ کا اک شہر ہے۔۔۔ خیرپور۔
کئی محبتوں کا مرکز ہے۔۔۔ شاہ عبداللطیف یونیورسٹی۔
محبت کی شروعات۔۔۔ جانے کون سے خوش نصیب تھے۔
محبتوں کی انتہا صالحہ ابراہیم اور احمد عمر!

چھوٹی سی بات کی لمبی کہانی ہے لیکن سچّی ہے۔ جس کے کردار آج بھی زندہ ہیں اور اپنے اپنے مرکز پہ دلوں میں زندہ محبتوں کی سچائیاں لیے جی رہے ہیں۔

محبت کی کہانی ہمیشہ سے شروعات میں دلچسپ اور انجام میں افسردہ ہوتی ہے۔ ان کی محبت کی شروعات بھی بہت خوب صورت تھی۔ جیسے شیشے کے گھر کے طاقچوں میں دیے جلنے کا منظر۔۔۔ مسحور کرنے جیسا۔ مبہوت کردینے والا۔

اور محبت کا انجام۔ جیسے کھنڈر قلعوں میں چلتی آندھیوں کی آوازیں۔

صالحہ ابراہیم اور احمد عمر جب ملے تو دیے جل اٹھے تھے۔ وہ ہر محبت کرنے والے کی طرح آندھیوں سے بے خبر رہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے محبت کے پیام سننا اور کہنا۔ مل کر رنگ رتوں میں خواب موسموں میں بھیگنا۔ وہ اسی تسلسل سے صدیاں جیتے، اگر بیچ میں ظالم سماج نہ آیا ہوگا۔ اور محبت میں کچھ بھی بیچ میں آجائے تو دراڑ پڑجاتی ہے، یہ تو پھر احمد عمر کا باپ کا تھا۔ وہ اچانک بستر مرگ پر آگئے تھے۔ دل کے درد سے لڑتے لڑتے ان کی آخری خواہش بھی وہی تھی، جو ہر دم ٹوٹتے باپ کی اپنے جوان بیٹے سے ہوتی ہے۔ ایک

ایسا شخص جس کی بیوہ بہن کی دو جوان بیٹیاں بھی مرتے وقت نظروں کے سامنے آجائیں۔ کوئی رستہ ہی نہیں مل سکا فرار اور نافرمانی کا۔ بابا کی خواہش پر اس نے نکاح پڑھوالیا کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر۔ دل اگر زخمی تھا تو سینے کے اندر تھا، صالحہ کا دل ٹوٹنے کا خیال آیا بھی تو یہ اندیشہ بھی فی الوقت دل کے زخموں کے ہمراہ کہیں چھپا لیا۔ یہ شادی تو بس بابا کی نظر میں تھی۔ بابا کی فرماں برداری کے طور پر۔ اس کے احترام کا ثبوت۔ خاندان کی بقا۔ اور بابا کی خواہش کا مان تھی۔

دل کا تعلق تو بس صالحہ ابراہیم سے تھا۔ روح کا رشتہ تو وہی تھی۔

اسفی کا نکاح اس نے نہیں ہونے دیا۔ وہ خود صرف بائیس سال کا تھا۔ اسفی تو ابھی محض سترہ سال کا تھا میٹرک کا معصوم سا لڑکا۔ یہ ہوا کہ بابا کی خوشی کی خاطر

اسے پھپھو کی بیٹی سے منسوب کردیا گیا۔ کراچی سے بابا کو لندن لے جایا گیا، جہاں سے بائی پاس سرجری کے بعد وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر گھر آگئے، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس دو زندگیاں اپنی ذاتی سانسوں کا جینے کا ذائقہ بھول گئیں۔ دکھ دل میں گھر کرکے بیٹھ گیا تھا۔ پڑھائی کے سال ختم ہوئے تو کراچی میں جاب لگ گئی تھی۔ ایک خاموشی سی دو دلوں کے بیچ فاصلے ترتیب دے کر بیٹھ گئی تھی۔ صالحہ کے گھر والے شادی کرنے پر زور دے رہے تھے۔ احمد عمر سے محبت ہونے سے لے کر سب کچھ کھونے تک کے ان سات سالوں میں اس کے والدین دنیا چھوڑ گئے تو وہ اپنا شہر چھوڑ کر خیرپور آگئی، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی میں اسے نوکری بھی مل گئی۔ رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا گھر بھی بنا ہی لیا۔

احمد عمر کے دو بیٹے ہوگئے تھے۔ دس سال بعد وہ واپس خیرپور شفٹ ہوگیا۔ اب بھی ان کے درمیان محبت مسلسل تھی اور یہ تسلسل وہ توڑ نہیں سکتے تھے کیوں کہ جہاں محبت سچی اور گہری ہو، وہاں ایسا ممکن تھا ہی نہیں۔ بھلے سے صالحہ گھر اور خاندان کی ناراضیاں، طعنے، الزام برداشت کرتی آرہی تھی۔ دوسری طرف

احمد عمر گھر، باپ، بیوی، بچوں اور زمینوں کے ساتھ دنیاداری میں کتنا بھی مصروف ہوگیا ہو مگر۔۔۔

محبت تو دل کے اندر رہتی ہے ناں۔ جو کہیں نہیں جاتی، کبھی نہیں جاتی۔

اسی محبت کو اب بھی پانے کے لیے احمد عمر صالحہ ابراہیم کے دروازے پہ جاتا ہے مگر وہ دوسرے لفظوں میں محبت کے دوسرے معنی بتا کر واپس کردیتی ہے۔ پہلی بار وہ اس سے کب مانگنے گیا تھا۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

اے ہم نفسو! صبر بڑی چیز ہے لیکن
ہوتے ہیں محبت میں زیاں اور طرح کے

اس دن چٹی دھوپ نکلی تھی تیکھی، تیز سنہری دھوپ۔

"وہ جب صرف میرا تھا تو روز ملتا تھا جب پرایا بنا تو کتنے دن بعد آیا تھا میرے پاس۔"

میں انگلیوں پر گننے لگی بار بار گنا۔ حساب غلط ہوتا جارہا تھا۔ سامنے آکر بیٹھا تو جون کا دن بارش لے آیا کہیں سے۔ بے رنگ پانی دل کے اندر برستا رہا تھا۔ باہر تو سنہری دھوپ ہی دھوپ تھی۔

"تم کیسی باتیں کررہے ہو احمد عمر!"

"تم ہی ہو صالحہ! جو میرے گھر کے حالات سے دل کی حالت تک کو جانتی ہو، پھر میری باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہیں؟"

"نہیں احمد عمر! تم غلط سوچتے ہو، تم کہتے ہو میں تمہاری پہلی محبت ہوں تو مجھے پہلی محبت ہی رہنے دو۔ دوسری بیوی مت بناؤ شادی اور محبت میں بہت فرق ہے۔" لمبی سانس کھینچ کر میں نے اپنی بات مکمل کرتے آخر میں بس اتنا ہی کہا۔

"اور میں نہیں چاہتی اب کوئی فرق مزید ہم دونوں کے بیچ آئے۔" کہہ کر میں خاموش ہوگئی، وہ بھی سن کر بہت دیر تک خاموش رہا۔

"بابا میری خواہش اب رد نہیں کریں گے۔ جب ان کی خواہش تھی تو میں نے انکار نہیں کیا تھا اب وہ بھی میری خواہش۔۔۔"

"بات بابا کی نہیں اب بات دل کی ہے، جو نہیں مانتا۔ یہی ہوگا ناکہ بنا کسی اعتراض کے ہماری شادی ہوجائے گی اور تم مجھے الگ گھر میں رکھو گے مگر آؤ گے میرے پاس اسی طرح جس طرح اب آتے ہو تب یوں ہوگا کہ میں تمہاری بیوی کو برداشت نہ کرسکوں گی نہ تمہارے بچے مجھے برداشت کرپائیں گے۔ ایسے تعلقات کس کام کے جن میں دن رات بس برداشت کرنا پڑے۔ برداشت کرکر کے ملے بھی تو بس چند لمحوں کا ساتھ۔ تھوڑے پل کی آسودگی۔ ان سے کہیں بڑھ کر میں ابھی خوش ہوں۔" میں نے احمد عمر کی بات کاٹ کر تفصیل بتائی۔

"تم رہ لوگی میرے بغیر؟" اس نے پوچھا۔

"اب بھی تو رہ رہی ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم سے شادی......" احمد عمر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"اس خیال سے نکل آؤ۔" مجھے اس کی بات اچھی نہ لگی۔
"مجھے تم سے محبت ہے۔" اس نے گھیرنا چاہا۔
"مجھے جینے دو پلیز۔" میں جھنجلائی۔
تھوڑی حکایت اور مختصر سوالوں کے بعد لمبی خاموشی انکار اور تکرار کے بیچ گھر بنا کے بیٹھ گئی۔ وہ جانے لگا تو میں نے اسے روک کر کہا۔
"تم یہ سوچ کر مت جانا کہ دوبارہ پھر کوئی کوشش کرلو گے۔ بھلے سے ہزار بار آکر تم یہی سوال دہراؤ' میرا جواب یہی ہوگا احمد عمر! بہتر ہے دل سے ہر سوال آج ہی نکال کر جاؤ۔" میری بات پر رک کر وہ میری آنکھوں میں جھانک کر اپنا آپ دیکھتا رہا۔ میں مسکراتی رہی۔ کافی دیر بعد سہی' ہر سوال کا گلا گھونٹ کر وہ بھی مسکرا دیا۔
ہاں مگر... لبوں کی مسکراہٹ سے بہت پرے ہم دونوں کی آنکھیں ایک دم بھیگ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

میرا سوچنا تیری ذات تک
میری گفتگو تیری بات تک
نہ تم ملو جو مجھے کبھی
میرا ڈھونڈنا تجھے پار تک
میں نے اپنا سب کچھ گنوادیا
تیری نفرتوں سے پیار تک
کبھی فرصت جو ملے تو آ
میری زندگی کے حصار تک
میں نے جانا کہ میں کچھ نہیں
تیری پہل سے تیرے بعد تک

میرے ہاتھ میں ادھوری محبت کا نامکمل مسودہ تھا کہ وہ چلی آئی۔ وہ بھی محبت تھی اور ازل کی طرح ادھوری۔ وہی محبت جو کبھی بھی شام جیسے شخص کے بغیر میرے پاس نہیں آتی تھی۔

مگر آج وہ اکیلی تھی۔ مجھے بے ساختہ اسفند کی یاد آئی' وہ اس وقت کہاں تھا اور کیسا لگ رہا ہوگا عبیر کے بغیر۔ سلام دعا کے بعد وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
"کیا لکھ رہی ہیں؟" میری مصروفیات کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ میں جواب نہیں دے سکی۔ اس کے بکھرے حلیے کو دیکھتی رہی۔ آج یونیورسٹی سے چھٹی تھی ہم دونوں ہی فرصت سے تھیں۔ بے سروپا باتیں کب بامعنی گفتگو کا رخ اختیار کر گئیں' وقت نے ہم کو محسوس ہی نہیں ہوتے دیا۔
"میرے دل میں بہت بے چینی ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں اور بھاگ ہی جاؤں گی صالحہ! میری کیفیت عجیب ہو گئی ہے۔ میں چلتی ہوں تو ہانپ جاتی ہوں' سوتی ہوں تو تب بھی جاگ رہی ہوتی ہوں۔ ہنسنے لگوں کھانے پینے لگوں' کہیں آؤں جاؤں یا ایک جگہ بیٹھی رہوں۔ ہر کام میں یوں لگتا ہے کہ جیسے میں بہت تھکنے لگی ہوں۔ کوئی ان دیکھا سا بوجھ ہے جو بڑھتا جا رہا ہے۔ دنیا تنگ لگنے لگی ہے میں کھلے آسمان تلے جانا چاہتی ہوں۔ بہت سونا اور بہت ہنسنا چاہتی ہوں' میں ایک دو دن میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔"
جب تک عبیر نے بات مکمل کی میں نامکمل افسانے کے مسودے کو سمیٹ چکی تھی۔
"آپ نے کبھی محبت نہیں کی نا۔ اچھا کیا کہ محبت سے دور رہیں آپ۔" عبیر کا اگلا جملہ میرے دل کے شیشے پر پتھر کی طرح لگا۔ میں دل میں کرچیوں کی چبھن کو برداشت کرتی رہی اور چپ رہی۔ محبت کی وجہ سے اب تک اپنے رشتہ داروں کے اتنے رویے برداشت کیے تھے۔ کئی دھوکے' بہت آنسو دیکھے تھے۔ اس شخص کی جدائی برداشت کرتی آرہی تھی' جس کی تصویر دل کی دیوار پر آج بھی پہلے دن کی طرح صاف ستھری نظر آتی تھی۔ اتنا کچھ برداشت کرنا ہے زندگی میں تو محض ان لفظوں کو برداشت کرنا کون سی بڑی بات تھی۔
دن کی دھوپ ڈھلنے کے سفر کی جانب گامزن تھی۔ میرا جی بھر آیا۔
"تمہیں لگتا ہے میں نے محبت نہیں کی؟" عبیر

نے افسانہ اٹھا کر ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا کہ میں اسے زبانی بتانے لگی۔
"جب زندگی میں محبت کی شدت بڑھ جاتی ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اسی طرح دنیا تنگ ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی ہماری کیفیت سمجھ نہیں پاتا' نہ منزل ملتی ہے نہ سفر ختم ہوتا ہے' تب نہ چاہتے ہوئے بھی صبر کرنا پڑتا ہے اس وقت صبر ہماری ضرورت نہیں مجبوری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ ہوتا جو نہیں۔ صبر کو اپنا کر ہم بہت خاموش ہو جاتے ہیں۔ اتنے سنجیدہ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے کبھی محبت نہیں کی۔" بہت خاموشی سے آنسوؤں نے میرے گالوں پر رستہ بنا لیا تھا۔ عبیر نے ایک نظر اٹھائی اور سب سمجھ گئی۔
"مگر میں آپ جیسی نہیں بن سکتی۔ مجھ میں صبر نہیں آسکتا میں..... میں نہیں۔" عبیر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ وہ بکھری بکھری باتیں کر رہی تھی۔
"میں بھی تمہاری طرح ہوا کرتی تھی۔ میری سوچ بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھی کہ میں چند دن سخت خفا رہوں گی اور مجھے منا لیا جائے گا۔ میں کچھ عرصہ اداس رہوں گی اور کوئی شخص کوششیں کر کے میری اداسیاں دور کر دے گا' مگر آسمانوں سے پرے لوح محفوظ میں ایک قصہ رقم ہوتا ہے عبیر! جس میں ایک لفظ کی تبدیلی پر بھی ہم قادر نہیں ہوتے تو..... تو جانے کیوں جھگڑتے ہیں۔ پھر بھی کیوں اداس رہتے ہیں۔ سمجھ کیوں نہیں لیتے۔ صبر کیوں نہیں کر لیتے۔" ہم باتیں کرتے رہے اور لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے باہر شام نے اپنے پر پھیلانے شروع کر دیے۔
"تو کیا میں بھی ہر مرحلے سے گزر کر پھر آپ جیسی بن جاؤں گی؟" عبیر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت جاگی۔ وہ ایک دم صالحہ ابراہیم کی تصویر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ ہمیشہ تصویر کے شیشے میں اپنا عکس نظر آتا ہے تو آدمی ایک لمحے میں خود کو پہچان کر چند ساعتیں خوفزدہ کیوں ہو جاتا ہے۔ عبیر کی بات کا میں نے جواب نہیں دیا۔ اسے شیشے کے عکس میں خود ہی جواب مل گیا تھا۔
"میں گھٹ گھٹ کے مر جاؤں گی صالحہ!"
"میں مر گئی ہوں؟"
"آپ تو گھٹ گھٹ کے جی رہی ہیں۔ مر تو پتا نہیں کب گئی تھیں۔" عبیر کی بات پر یہ سوال و جواب کا سلسلہ فی الوقت ـــ دم توڑ گیا۔
رات آئی اور دم توڑتی شام کو نگل گئی۔ لمبے خاموشی کی حویلی میں گونجتے رہے۔ عبیر پیر پسار کے بیٹھ گئی تو میں اٹھ کر رات کا کھانا بنانے کچن میں آئی' تب ہی شام کی چائے کا خیال آیا۔
"میں کل گاؤں جا رہی ہوں اور آپ اسے نہیں بتائیں گی۔ نہ ہی میرا پتا دیں گی۔ ٹھیک ہے؟" ٹیبل سے ایک چھوٹا سا گل دان اٹھائے وہ اس پر کندہ تحریر پر نظریں ڈالتے ذرا اونچی آواز میں بولی۔
"ٹھیک ہے۔" بسکٹ اور نمکو کی دو پلیٹیں ٹرے میں رکھ کر میں واپس لاؤنج میں آئی۔ ٹرے ٹیبل پر رکھی اور پھر سے کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔
"ٹی وی کھول لو عبیر۔"
"نہیں۔"
"واپس کب آؤ گی؟"
"نہیں آؤں گی۔"
"کیوں؟"
میں وقت بتانے کو وحشت گھٹانے کو سوال کرتی رہی' وہ بے دلی سے جواب دیتے دیتے چپ ہو گئی۔ چائے بن گئی تو دو کپ لے کر لاؤنج میں آئی۔ وہ صوفے پر سو چکی تھی۔ ہاتھ میں نیلے رنگ کا گل دان تھا جس پر پتا نہیں کس مفکر کا جملہ تحریر تھا۔
"ہر نارمل انسان کے اندر ایک پاگل چھپا ہوتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

عبیر چلی گئی۔ دوسری صبح اسفند عمر آیا۔
"تم نے اسے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ بنا بتائے چلی گئی؟"
سلام دعا اور یہاں وہاں کی بہت باتیں ہو گئیں تو میں

نے اس سے وہ سوال کیا۔ جو مجھے پتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے یہی پوچھنے صبح صبح میرے پاس آگیا تھا۔ میں کیوں بتاتی بھلا عبیرہ ماہتاب کا پتا۔ میں.... جو وعدے کی پابند تھی۔

"میں نے اسے یہ بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں مان رہا۔ سب سے کٹ کر اس تک پہنچتا ہوں تو بقول اس کے، پھر اس کے گھر والے نہیں مانیں گے۔" اسفند عمر کی شام جیسی آنکھوں میں اس وقت فقط خالی پن تھا۔ میں اس کے کپ میں چینی ملاتی رہی اور چپ رہی۔

"آپ کے پاس تو اس کا پتا ہوگا۔" اسفند کے لہجے میں اداسی بھاں بھاں کرتی محسوس ہوئی۔

"نہیں ہے۔" کپ سے چمچہ نکال کر میں نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"میں باہر جا رہا ہوں۔" پہلا گھونٹ لے کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"مت جاؤ۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اسفند نے میری التجا سنی ہی نہیں، چائے پیتا رہا۔ آسمانوں میں جانے کیا کھوجتا رہا اور تھک کر ٹیبل پر بازو رکھ کر ان میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ میں محبت کی داستان کو تیزی سے آگے بڑھاتی قلم چلاتی رہی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ ہم دونوں دھوپ میں نہا رہے تھے۔ میں لکھنے میں مگن رہی، وہ اٹھ کر جانے کب چلا بھی گیا۔ قلم سے سیاہی ختم ہوئی تو ارد گرد دیکھا۔ ارد گرد کچھ نہیں رہا تھا۔

موبائل کی بیل نے شور مچایا تو اسکرین پر دیکھا۔ عبیرہ کالنگ جگمگا رہا تھا شام جیسے شخص کے خالی بت میں بھاں بھاں کرتی اداسی میرے پاس ہی کہیں گونجی۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"تم کیسی ہو عبیرہ؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یہاں بہت سردی ہے۔" عبیرہ اپنے باہر کا حال اور باہر کا موسم بتا کر خاموش ہو گئی۔

"ہوں۔" میں اپنے سامنے پڑے افسانے کو دیکھنے لگی، جہاں سیاہی ختم ہو گئی تھی، وہاں مجھے بہت کچھ لکھنا تھا۔ جب کچھ نہیں رہتا تو ایسی کیفیت میں دل کے اندر برستے موسموں کو لکھنا تھا۔

جب کوئی ساتھ نہیں دیتا اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی صبر کر لیتے ہیں۔ ایسی حالت کو لکھنا تھا۔

شدتوں سے تنگ آکر اپنی جگہیں چھوڑ کر بھاگنے کو جواز بنا کر لکھنا تھا ابھی تو۔

"میں ابھی اٹھی تھی، سوچا آپ سے بات کر لوں اور....." عبیرہ کی بات ادھوری ہی رہی۔ اور کیا لکھنا تھا؟ میں کہانی میں گم تھی۔

"اور مجھے لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا اسفند آپ کے پاس آیا بیٹھا ہو جیسے۔" عبیرہ کی بات پر کہانی کے سارے لفظ صفحوں سے اڑ گئے۔ میری نظریں خالی صفحوں کی خالی سطروں پر ساکت رہ گئیں۔

"ہاں آیا تھا اسفند۔"

"کب؟" دوسری طرف سے یوں محسوس ہوا عبیرہ فون سے جیسے نکل آنا چاہتی ہو۔

"تھوڑی دیر پہلے"

"بیٹھا ہوا ہے اسفی؟"

"نہیں۔ ابھی ابھی گیا ہے۔" میرے جواب پر دوسری طرف سے مجھے سائیں سائیں سنائی دی۔ پوری کائنات گونگی ہو گئی۔ میری نظریں خالی کپ کے پاس پڑے آنسوؤں کے ڈھیر پر پڑیں۔ مجھے مزید یہ بھی لکھنا تھا کہ جو لوگ رو رو کر تھک جائیں تو یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کہاں کہاں نڈھال ہو کر سوئے تھے اور سوتے سوتے کہاں رو پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہماری محبت مکمل ہونے کا وقت ہی نہیں آیا کیونکہ ہمارا ملنا مقدر میں لکھا ہی نہیں تھا، ورنہ اگر نصیب میں ہوتی منزل تو اتنا وقت تو مل ہی جاتا کہ ہم اپنے لیے دوسروں سے لڑ سکتے۔ ہمارا مقدمہ تو حکایت و دلائل سے محروم ہی رہا۔ مگر عبیرہ اور اسفی کے لیے میں لڑنا چاہتی ہوں۔ اس محبت کو ادھورا نہ رہنے کی کوشش ایک بار ضرور کروں گی۔"

یہ دھوپ شہر کا سرد ترین دن تھا۔ کئی دنوں سے میرے گھر میں تنہائی ہوکتی پھرتی تھی۔ وہ دونوں کئی دنوں سے نہیں آئے تھے اور میں کئی دنوں سے احمد عمر کا انتظار کر رہی تھی، جس روز آیا تو سب سے پہلے بات یہی کہی۔ مجھے افسانے کا انجام لکھنا تھا۔ مجھے محبت کا ساتھ دینا تھا۔ میری بات سن کر احمد عمر کی آنکھوں میں "تمہاری ہر بات مان لیتا ہوں۔" کا جواب ابھرا۔ کچھ ہی دیر میں چادر لپیٹ کر میں اس کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی۔

"تمہیں لگتا ہے ان دونوں کی محبت گہری ہے؟"

"ہاں بہت گہری ہے۔"

"ثبوت کیا ہے؟"

"تم ثبوت مانگ رہے ہو۔ ان دونوں کی محبت کا ثبوت مانگ رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں ان دونوں کی محبت کی گہرائی کا ثبوت مانگ رہا ہوں۔"

"اسفی اداس رہتا ہے اور عبیرہ دن میں چالیس کالیں کر کے اس کا پوچھتی ہے۔ یہ کافی نہیں۔"

"ہاں یہ کافی نہیں۔ میں بھی باہر رہوں تو گھر پر چالیس کالیں کر کے بیوی کی طبیعت پوچھتا ہوں۔ کبھی بابا کا، کبھی بچوں کا ان کی پڑھائیوں کا، کسی مہمان کے آنے جانے کا، پورے گھر کی خیر و عافیت پوچھنے کے لیے مجھے ایسا کرنا پڑتا ہے۔"

"ہاں تو تم ان سے محبت کرتے ہو نا۔ ان سے بندھے ہوئے ہو۔"

"مگر ان سے ویسی محبت نہیں جیسی تم سے ہے۔"

"مجھ سے کیسی ہے؟"

"ایسی محبت جسے ثبوت کی ضرورت نہیں۔"

سوال جواب کی اس تکرار میں احمد عمر کے آخری جواب کو سن کر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ گاڑی سیدھی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ہم دونوں کی نظریں بھی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

"ان دونوں کی یہ اداسی اور چاہت وقتی ہے صالحہ! وہ لڑکی اپنے ساتھ بچپن سے اسفی کا نام سنتی، اسے چاہتی آرہی ہے۔ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونی چاہیے۔"

احمد عمر کے جواب میں آج کی نسل کا وہ خاندانی بزرگ بول رہا تھا جو پچھلی نسلوں کے بزرگ بے سمجھے اپنے بچوں کی دلوں کی حالتوں اور چاہتوں سے بے خبر اپنی مرضی سے فقط اپنے اونچے شملوں کی لاج رکھنے اور اپنے نام کی حاکمیت کی بقا کے لیے الٹے سیدھے فیصلے کرتے تھے۔ جن میں احمد عمر اور اسفند عمر کے بابا بھی شامل تھے اور اب احمد عمر بھی۔

بہر حال میں نے احمد عمر کی بات پر ذرا دھیان نہیں دیا۔ بھلا دو دلوں کی محبت کے بیچ اس لڑکی کا کیا کام۔

اور اب بہت دیر سے میں پرانی حویلی کے جدید طرز کے ڈرائنگ روم میں عمر سردار کے سامنے بیٹھی ادھوری محبت کا مقدمہ لیے بولتی جا رہی تھی۔ احمد عمر اور میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے جامنی رنگ کے صوفوں پر بیٹھے تھے اور ہمارے بیچ عین اوپر سروں پر نارنجی روشنیوں والا فانوس لٹک رہا تھا۔ چھت پر لگے چار پنکھوں کی ہوا سے روشنیاں ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔

"کون ہے وہ لڑکی؟" اونچے شملے والے کے ہونٹ وا ہوئے بھی تو بس یہی سوال پوچھنے کے لیے۔

"جہاں میں پڑھاتی ہوں، وہاں وہ پڑھتی ہے۔"

"اس کے اماں بابا نے پڑھائی کے لیے ہی بھیجا ہوگا نا اسے۔" جملہ مکمل کرتے ہی گھنی مونچھوں تلے لبوں پر عجیب مسکراہٹ آئی۔ میں اس جملے کی تہہ تک پہنچی تو میری ہتھیلیاں بھیگ سی گئیں۔ سامنے سر جھکائے بیٹھا احمد عمر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ میں اکیلی ہی اس کٹہرے میں کھڑی تھی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ....."

"میرا مطلب آپ سمجھ گئی ہیں استانی جی! اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ جن کے لیے یہ جنگ لڑنے آئی ہیں۔ وہ آپ کے دائیں بائیں بھی نہیں، سو آپ کے لفظوں میں قطعاً" کوئی وزن نہیں۔ آپ جتنی بھی کہانی تیار کر کے آئی ہیں، اس کا جواب بس اتنا ہی ہے کہ بالفرض آپ کی کلاس میں اگر دس شاگرد ہیں آپ ان کا

امتحان لے چکی ہیں۔ نتیجہ بھی آپ نے ہی نکالنا ہے تو مجھے بتایئے ذرا کہ ایک شاگرد کورا کاغذ چھوڑ گیا ہے تو آپ فقط ہمدردی کے تحت باقی شاگردوں کے نمبروں سے ذرا ذرا سے نمبر اس نالائق شاگرد کو دے کر آگے کردیں گی۔ باقی؟ یقیناً ”نہیں کریں گی۔ کیوں کہ آپ جانتی ہیں ایسا کرنے کے بعد تا عمر آپ کے ضمیر پر ایک بوجھ رہے گا سو میں بھی اپنے گھر میں ناانصافی نہیں کرسکتا۔ مجھے بھی ضمیر کا بوجھ قبول نہیں۔“

میر عمر سکندر بول کر خاموش ہوئے تو میں بھی خاموش رہی مجھے لگا میں لڑنے نہیں آئی تھی نہ ہی کوئی کوشش کرنے آئی تھی میں تو بس یہاں سننے آئی تھی۔ میری زبان بند تھی، میں اکیلی تھی۔ میں نہیں لڑسکتی تھی۔ میرا سامنا فقط میر عمر سکندر کے لفظوں اور دلائل سے نہیں تھا میرے سامنے تو پرانی روایتیں کھڑی تھیں۔ بوسیدہ عہد تھے جن کی سازشوں نے کئی محبتوں کو ادھورا کر رکھا تھا۔ پرانی حویلی کے پرانے لوگ آج بھی پرانے عہد نبھاتے جینا چاہتے تھے۔

”میں اگر کردوں وہیں پر اسفند کی شادی تو اس کی منگ کہاں جائے گی“ آپ بتائیں۔ اور اگر آپ کہتی ہیں کہ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا ہی ہے۔ دو صدیوں سے ہمارے خاندان کے اندر نہ دوسری برادری کی عورت آئی ہے نہ کسی دوسرے خاندان میں ہم نے کوئی بیٹی بیاہی ہے۔ دو صدیاں مطلب دو سو سال استانی جی! اسفند عمر صرف دو سال یونیورسٹی میں پڑھ کر اپنے خاندان کی دو سو سال کی روایت بھول گیا۔ قصور تو سارا اس کا ہے نا۔“

ابھی اتنا کہا تھا کہ ان کی موبائل پر بیل ہوئی۔ تھوڑی دیر کے لیے معذرت کرتے وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب ڈرائنگ روم میں سرد تنہائی اور بھیگی اداسی رہ گئی۔ نارنجی شعاعیں ہمارے سروں کے اوپر جھول کر جانے کیا کہنا چاہتی تھیں۔

”قصور تو سارا اسی کا ہے۔“ اپنے باپ کا آخری جملہ بڑبڑا کر احمد عمر نے میری جانب نظر اٹھائی۔

دل سے کسی لمحے محبت اور نفرت لگاؤ یا گھاؤ نکال دو تو وہاں پر اجنبیت آجاتی ہے۔ میرے دل میں بھی اس وقت کچھ نہیں تھا، سو آنکھوں میں اجنبیت آگئی۔

”میر خاندان کی سب زندگیوں کے بیچ اور دائیں بائیں دو صدیاں راستہ بند کیے کھڑی ہیں۔ دو سو سال۔ ان دو صدیوں سے باہر نکلنے کو کوئی کسی کو راستہ نہیں دے گا؟“

”تم۔۔۔ تم لوگ۔ پرانی حویلیوں میں رہ کر نئے دور میں جینے والے بدبودار لوگ۔“ میری نظریں سامنے بیٹھے شخص سے ہم کلام ہوئیں۔ وہ پڑھ لیتا تھا میری آنکھوں کا ہر تاثر۔ پڑھ کر ایک دم اداس ہوا۔

”مجھے معاف کردو۔“ اس کی آنکھیں جواباً ”گویا ہوئیں۔

”ان پرانے پتھروں پر کندہ گھٹیا روایتوں کا قصور نہیں۔ سارا قصور تم لوگوں کا ہے جنہیں تم روز چومتے ہو۔ ہاتھ جوڑ کر ان حاکموں کو صبح شام کہتے ہو کہ یہ نہیں ہوگا۔ وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔“ میری آنکھیں سرد تھیں۔ ان میں ابھرتا نیا تاثر سلگتا ہوا تھا۔

”مجھے معاف کردو۔“ نارنجی روشنی سامنے والے کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔

”مجھے تم سے نفرت ہے۔ تمہارے باپ سے، تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد سے۔“ میں عبیر کو چھوڑ کر اپنے لیے لڑنے بیٹھ گئی۔

”مجھے معاف کردو۔“ احمد عمر کی آنکھوں میں ایسے لمحے لہرانے لگے گویا ابھی ضبط کھو کر وہ بہت سارا رو دے گا۔

”احمد عمر! جب جدید دور میں قدیم محبتیں کھولی جائیں گی تو ہم تم کہیں نہیں ہوں گے۔ اگر ہوں گے بھی تو لوگ مزید تہہ خاک دبا دیں گے ہمیں کیا ملا۔ ہم کیوں جتنا بھی جیے سلگتے رہے۔“

کہتے کہتے میری میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ سنتے سنتے احمد عمر نے آنکھیں موند لیں۔ ہم آج بھی ساتھ تھے پاس پاس تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھتے مگر صدیوں کے کناروں پر کھڑے ضبط کرتے کرتے نارنجی شعاعوں تلے آپس

میں لڑتے اور معافی مانگتے۔۔۔ جب پرانی محبتیں کھولی جائیں گی تو کیا تاریخ میں یہ منظر بھی ملے گا؟ اگر ملے گا تو کیا نئے لوگوں کے دل کچھ لمحوں کے لیے بند نہیں ہوجائیں گے۔ جیسے اس وقت صالحہ ابراہیم اور احمد عمر کے دل بند ہو رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایک شخص سے ہزار تعلق کے باوجود
ایسا ہوا کہ ہم کوئی وعدہ نہ کرسکے
ہم ایک دوسرے سے محبت کے باوجود
ہم ایک دوسرے کی تمنا نہ کرسکے

سردی کے سارے دن گزر گئے۔ جس روز بہار آئی۔ اس روز وہ بہاروں جیسی لڑکی بھی لوٹ آئی' وہ جب بھی آتی تھی اکیلی نہیں آتی تھی اور ہمیشہ کی طرح اسفند کو دیکھا تو مجھے احمد عمر یاد آیا۔ فون کرکے میں نے اسے بھی آنے کا کہا۔ جب تک وہ آیا' تب تک میں ان دونوں سے ایک دوسرے کی شکایتیں سنتی رہی۔

"تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی ورنہ میں تمہیں تمہاری محبت واپس کردوں گی اور ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔ مجھے رونا تڑپنا نہیں آتا۔ زندگی جینے کے لیے سکھوں کو ڈھونڈنا چاہیے۔" عبیر کے ہاتھ میں نیلا گل دان تھا۔ اس وقت اس کے نارمل انسان کے اندر کا پاگل پن بول رہا تھا۔

"اور اگر شکستگی مقدر میں لکھی جاچکی ہو تو؟" میں اس سے سوال نہ کرسکی۔ سو میری سوچ بے جواب میں رہی۔

"شادی سب کچھ نہیں ہوتی عبیر!" میں نے پہلی بار ان دونوں کے بیچ مداخلت کی۔

"شادی سب کچھ ہوتی ہے صالحہ! اس نے مجھے خواب دکھائے تھے۔۔۔ پہلے اس نے مجھے پھنسایا تھا محبت میں۔ اسے ہی کوشش کرنی چاہیے۔ اسے۔۔۔ لڑنا چاہیے۔" کہتے ہوئے وہ اسفند سے لڑ پڑی۔ جب تک اپنی بات مکمل کی' باری باری تینوں کشن اسفند کو دے مارے۔ اسفند مسکراتا اسے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر لاؤنج میں خاموشی رہی۔ مجھے یاد آیا یونیورسٹی کا وہ پہلا دن' جب عبیر میرے پاس اسفند کی شکایت لے کر آئی تھی۔

"میم! یہ لڑکا مجھے ہر وقت گھورتا رہتا ہے' جہاں بھی جاؤں۔ وہاں آموجود ہوتا ہے' جس کی وجہ سے ٹھیک سے مجھ سے پڑھائی نہیں ہوتی۔" وہ اپنی کتابوں پر نظریں ٹکائے کہتی ہوئی اس وقت پرائمری کی اسٹوڈنٹ لگ رہی تھی' جس کا سموسہ اسفند نے چرا کر کھالیا ہو۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اسفند کو سزا دی جائے۔

"یہ یونیورسٹی ہے عبیر! یہاں آپ کو اپنے مسئلے خود سلجھانے ہوں گے۔" میرے جواب پر وہ پھر بھی بضد رہی تو مجھے ناچار اسفند کو بلا کر اس کے سامنے بٹھانا پڑا۔

"میم! مجھے یہ اچھی لگتی ہیں۔" دھوپ شہر کا باسی بے ساختہ بولا تو دور دیس سے آنے والی بے اختیار اسی طرح بپھر گئی تھی جیسے اس وقت بپھری ہوئی بیٹھی تھی۔

وہ پہلا دن' پہلی شکایت' پہلا اعتراف مجھے آج بھی یاد تھا۔ اس کے بعد دونوں کی لڑائی کب سلجھی۔ کب دوستی ہوئی اور رابطے کب بڑھ کر محبت کی سرحد عبور کرگئے۔ یہ میں کچھ نہیں جانتی تھی' ہاں مگر بہت سارے دن بعد وہ دونوں میرے گھر آگئے۔ عبیر تو ڈیرو شہر کے قریب ایک گاؤں سے یہاں پڑھنے آئی تھی اور ہاسٹل میں رہتی تھی۔

جس دن وہ دونوں میرے گھر آئے تھے تو احمد عمر کچھ ہی دیر پہلے اٹھ کر گیا تھا۔ اس کی خوشبو ابھی تازہ تھی میرے گھر میں۔ ویسی ہی خوشبو مجھے اسفند عمر سے بھی آئی تب ہی مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ یہ لڑکا اگر دل کے قریب رہتا ہے اور اس کی آنکھیں کسی اور کی آنکھیں یاد دلاتی تھیں تو اس کا رشتہ اسی شخص سے تھا' جو میرے دل میں تھا مگر زندگی میں نہیں تھا۔

ان دونوں نے کب مجھ سے دوستی کرلی۔ کب میں

میم کے بجائے ان کے لیے فقط صالحہ بن گئی' یہ بھی پتا نہ چل سکا۔ میں ان کے رازوں میں شریک ہوتی رہی۔ وہ مجھے اپنی ملاقاتوں کا گواہ بناتے رہے اور یہ راستہ میں نے خود کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ میرے گھر میں ان ہی کے دم سے رونق تھی' ورنہ تنہائی کا راج تھا اور اداسی کی حکومت ہوا کرتی تھی۔

"آپ اجازت دیں تو میں یہ توڑ دوں۔" عبیر کی آواز پر میں نے دیکھا۔

"کبھی نہیں۔" اس کے ہاتھ سے گل دان لے کر میں نے کارنر والی ٹیبل پر رکھ دیا۔

"آپ اس کی جگہ تبدیل کردیں۔ مجھے یہ یہاں اچھا نہیں لگتا۔" وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے اپنی حالت کو نظر انداز کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

"جو چیز اچھی نہ لگے اسے توڑ دینا چاہیے؟"

"ہاں۔ اور جو شخص دھوکا دے اسے چھوڑ دینا چاہیے۔" میرے سوال کے جواب پر اس نے ایک تیکھی نظر اسفند پر ڈالی۔ وہ اس جملے کے جواب میں بس اپنے بوٹوں کو دیکھتا رہا۔

"ایسا کرسکو گی تم؟" میں نے اس کا امتحان لینا چاہا۔

"کرکے دیکھوں گی۔" کندھے اچکا کر وہ لاپروائی سے بولی۔ میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اب پوچھنے کو مزید کیا بچتا تھا۔ شاید کچھ نہیں۔

"یہ دھوکے باز ہے۔ بے وفا ہے۔" اس جملے پر اسفند اور میں نے اسے تڑپ کر دیکھا۔ اب وہ بولنا شروع ہوئی تو کئی پہر گزر گئے۔

"آپ جانتی ہیں ایک لمبا عرصہ یہ میرے پیچھے پڑا رہا تھا صالحہ! ہاسٹل کے گیٹ پر مجھے ایک دن میں چار بار نظر آتا تھا۔ یونیورسٹی کا پورا ٹائم مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ میں کب تک میٹھے امرت سے پہلو تہی کرتی۔ عورت کرسکتی ہے کبھی محبت سے انکار۔۔۔ بالآخر مجھ سے مخاطب ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ کر بھی گیا۔ ثابت ہوا ناکہ پہلے اس نے پھنسایا مجھے۔۔۔ اور جب ہم کسی کو جاننا چاہیں صالحہ! تو اس کے ساتھ ٹائم گزارتے ہیں۔ میں نے بھی اس کے ساتھ اپنا وقت بانٹا اور ایک دن جان لیا اسے۔ اس نے فقط اپنی پڑھائی کا سال پاس کرنے کے لیے مجھے استعمال کیا' تب ہی میرا ساتھ چاہا۔ میں اس کو شادی کے لیے اس لیے کہتی ہوں کہ یہ مجھے ثبوت دے اپنی اس چاہت کا۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی نا تو اپنے باپ بھائی اور خاندان سے تو کیا پوری دنیا سے لڑلیتی کیوں کہ یہ دنیا کا نہیں میرے دل کا معاملہ ہوتا۔۔۔ ہے تو اس کے دل کا بھی معاملہ تو کیوں نہیں لڑتا اپنے رسموں رواجوں اور اپنے رشتوں سے اپنے لیے میرے لیے محبت کے لیے۔ میں بتاؤں آپ کو کہ یہ اس لیے نہیں لڑتا اس کے پاس ہمت نہیں ہمت اور طاقت آتی ہے صداقت سے۔۔۔ سوچا تو اب یہ رہا ہی نہیں۔ کیوں کہ اب میں اس کے لیے پیار نہیں پریشانی بن گئی ہوں' آپ نے کہا محبت میں شادی ضروری نہیں' میں کہتی ہوں اسی لیے ضروری ہے۔۔۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"آپ نے نہیں کی محبت میں شادی۔۔۔ اس لیے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سچے تھے تب شادی کی کوئی اوقات نہیں رہتی' مگر میرے اور اسفند کے معاملے میں شادی ضروری ہے۔۔۔ کوئی ایک دم سے بے وفا نہیں ہوتا' نہ ہی اچانک سے دھوکے باز بنتا ہے اس راہ تک آتے آتے اسے کن مرحلوں سے ہوکر آنا پڑتا ہے یہ اس کا مسئلہ ہے۔ اسے میں نے یہی کہا تھا کہ سب مسئلے نمٹا کر ساری مجبوریاں سلجھا کر ہی مجھ تک آنا' پر بے وفا نہیں بننا' دھوکا نہیں دینا' میں انتظار کروں گی۔۔۔ میں آخری دم تک اس کا انتظار کرسکتی تھی صالحہ! مگر اب یہ کہتا ہے گھر والے نہیں مانتے۔" بولتے بولتے عبیر چپ ہوگئی۔ میری حالت ایسی تھی جیسے پتا نہیں کتنے عرصے تک میں کوئی حرکت نہیں کرسکوں گی۔ اسفند دھیمی سی مسکان لیے اسے بولتے سن رہا تھا۔ وہ چپ ہوگئی تب بھی مسکراتا رہا۔ عبیر کی باتوں میں کتنی صداقت تھی' یہ جاننے کے لیے میں نے اسفند پر نظریں مرکوز کردیں کہ اب وہ جواب شکوہ بیان کرے تاکہ میں نتیجہ نکال سکوں۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔" اس کے پاس بس یہی جملہ تھا۔

"تمہارے پاس فقط لفظ ہیں اور ہے ہی کیا..." کہتی ہوئے عبیر نے ٹیبل پر پڑی ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر ماری... اسفند ہنس پڑا تو وہ میری طرف مڑی۔

"آپ کو پتا ہے صالحہ! لفظ بہت بڑے فنکار ہوتے ہیں۔ دھوکے میں رکھتے ہیں اور کوئی دھوکے باز شخص ان کو محبت کے لیے ادا کرے تو وہ بھی بہت بڑا مکار ہوتا ہے۔" عبیر کی بات پر ایک بار پھر میں نے اسفند کی طرف دیکھا۔

عبیر نے دو سال کی محبت کو دو منٹ میں فاش کر دیا تھا وہ اگر اسفند کو جانتی تھی تو ٹھیک ہی جانتی ہو گی۔ عبیر کی باتوں کے آئینے میں مجھے اسفند کھل کر نظر آرہا تھا۔ وہ واقعی بہت بڑا مکار تھا جس نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا۔ میں اس کے لیے پریشان رہتی تھی۔ دعائیں مانگتی تھی۔ دکھی رہتی تھی۔ اس کی ہر غلط بات اور خطاؤں کو نظر انداز کرتی آئی فقط اس لیے کہ کہیں وہ دوسرا احمد عمر نہ بن جائے... میں اس کے لیے یہ سب کیوں نہ کرتی... وہ بھائی کس شخص کا تھا جس پر مجھے خود سے بڑھ کر اعتبار تھا' مگر اسفند عمر اتنا فنکار؟ اتنا دھوکے باز' اتنا مکار؟

ان مشتعل لفظوں اور جوابی خاموشی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ میں رک رک کر شیشے کی دیوار کے پار دیکھتی رہی' یہ دونوں اٹھ کر چلے بھی گئے... وہ نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں کیا چلے گئے' میرے گھر سے جیسے سارے موسم اور زندگی سے سارے لوگ ہی چلے گئے۔ ہر طرف اک خالی پن تھا اور وقت تھا کہ گزرتا نہ تھا۔

ان گزرے چھ مہینوں میں وہ آتا رہا' جسے آتے رہنا تھا۔ وہ نہیں آئے جو ہمیشہ آتے تھے۔ میرے کمرے کی ٹیبل پر پڑے ادھوری محبت کے نامکمل افسانے کے ورق بوسیدہ ہونے لگے تھے۔ اس کا اختتام کرنا تھا اور انجام کن لفظوں میں لکھنا تھا' یہ سوچ مجھے پریشان کر دیتی تھی کیوں کہ نئے دور کے دو کردار محبت نہیں کر سکے تھے' ہاں محبت کرنا ضرور چاہی۔ جو بے نام رہی اور بے مقصد سی ہو کر یہاں وہاں بکھر کر معدوم ہو گئی تھی۔ احمد عمر نے بتایا تھا' اسفند باہر چلا گیا تھا اور عبیر کی اپنے خالہ زاد سے منگنی ہو گئی تھی۔

میرا وقت ویسے ہی گزر رہا تھا۔ یونیورسٹی' گھر کے کام' لکھنا' ٹی وی کے ساتھ اور ڈائری... جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھی' ٹی وی آن تھا۔ باہر چڑیوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ میں اپنے لیے چائے بنا لائی۔ شام ابھی پوری طرح ہوئی نہیں تھی۔ دروازہ بجا تھا۔ مانوس دستک تھی' دستک میں بس ذرا سی عجلت تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے عبیر کھڑی تھی۔ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ اسے بٹھا کر چائے کا دوسرا کپ لانے کچن میں گئی اور مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ آج بھی اسی طرح تھی۔ بہت روپہلی' کھلی کھلی سی... تھوڑا فرق اس کے انداز میں آیا تھا' کپڑے نئے فیشن کے پہنے ہوئے تھے اور بالوں کی کٹنگ کروائی تھی... چائے کا کپ لے کر میں لاؤنج میں آئی تو وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی مجھے دیکھ کر فون بند کر دیا۔

"اسفی تھا..."

"اچھا..." میں ذرا سی چونکی۔

"اسفی آج بھی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں نے اسے اسکائپ پہ آنے کو کہا ہے۔ تھوڑی دیر میں گپ لگاتے ہیں اس کے ساتھ۔" کھلکھلاتے کہہ کر عبیر نے چائے کا کپ اٹھا لیا... میں نہیں اٹھا سکی۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ باہر چڑیاں خاموش ہو گئی تھیں یا شاید اڑ ہی گئی تھیں میرے گھر کی دیواروں سے... مجھے ایک دم اداسی نے گھیرا... میں اس فسوں سے تب ہی نکلی' جب عبیر اپنا ٹیب آن کیے اسفند سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں بس تھوڑی دیر پہلے آئی ہوں خیر پور۔ ایک

دوست کی شادی اٹینڈ کرنی ہے۔ وہاں سے آکر آج کی رات صالحہ کے پاس رکوں گی۔ کل واپس چلی جاؤں گی۔ تم بتاؤ...." عبیرہ بولتے ہوئے اپنے خوب صورت بالوں میں ہاتھ بھی چلاتی رہی۔

"صالحہ سے بات کرواؤ۔" اسفند کے کہنے پر وہ اٹھ کر میرے والے صوفے پہ آکے بیٹھی۔

"کیسے ہو اسفی؟"

"ایک دم فٹ' آپ سناؤ۔"

پھر یوں ہوا کہ ادھر ادھر اور یہاں وہاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے اندر عجیب قسم کی گھٹن بڑھتی جارہی تھی۔

"تمہیں یاد ہے ہمارا اک کلاس فیلو تھا شیراز.... وہ شیز؟ کل میرا اس کے ساتھ لنچ کا پروگرام ہے۔"

"خدا کا خوف کرو۔ ایک منگیتر کے ہوتے تم لڑکوں سے پروگرام سیٹ کیے بیٹھی ہو....." اسفند کی بات پر عبیرہ نے بے اختیار اک قہقہہ لگایا اور بس۔

"تم اپنی سناؤ...."

"تین چار گرل فرینڈز کے ساتھ گزر رہی ہے.... اچھی چل رہی ہے...." ساتھ ہی دونوں کی ہنسی.... مجھے ان کی باتوں اور ہنسی سے وحشت سی ہونے لگی۔

اٹھ کر باہر آئی تو شام ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عبیرہ اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھائے باہر آئی۔

"صالحہ! میں نینا کے پاس جاکر ہی تیار ہو جاؤں گی۔ بارہ بجے تک واپس آجاؤں گی' پھر ہم بہت ساری باتیں کریں گے.... ٹھیک ہے؟" جھک کر میرا گال چوما اور کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ بہت دیر تک میرے کانوں میں اس کی ہیل کی ٹک ٹک گونجتی رہی۔

صرف چھ ماہ میں کوئی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اتنا بدل جاتا ہے؟ اور ہماری محبت کیسی تھی جو اتنے سال بعد بھی ویسی ہی تھی۔

یہ سوچ تیز لہروں جیسی تھی جس میں' میں اس وقت غوطہ زن تھی۔ شام کب کی ڈوب گئی تھی.... خالی سنسان اندھیرے گھر میں ٹی وی چل رہا تھا۔ ٹیبل پر میرے کپ میں چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ گھر کے اندر کھیلتی شام تھک کر رات کی گود میں سو چکی تھی۔

گھر کے باہر زندگی کے معمول کی ڈھیروں آوازیں تھیں۔ مجھے یہاں گونگا بہرا بنے بیٹھے جانے کتنی صدیاں بیت گئی تھیں کہ اچانک ہی وہ چلا آیا جس کے انتظار میں' میں صدیوں سے اپنے گھر میں اکیلی بیٹھی تھی۔

اس کے ہاتھ میں کی چین تھی اور کی چین میں سرخ پھول جھولتا تھا۔ چوکور بنے چھوٹے سے شیشے کے ڈبے کے اندر وہ پھول اور اس پر پڑے شبنم کے قطرے.... باہر سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کسی کے ہاتھوں نے تازہ گلاب توڑ کر اس میں بند کردیا ہو۔ یہ ہی وہ پھول تھا جس کی تلاش میں' میں نے پوری یونیورسٹی چھان ماری تھی۔ اسی پھول کی تلاش میں مجھے احمد عمر ملا تھا.... دس سال پہلے لائبریری کی ٹیبل سے اٹھائے اس شیشے کے ڈبے کو وہ آج بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ کہیں دوسری جگہ نہیں رکھ پاتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر شیشہ کبھی بے احتیاطی میں ٹوٹ گیا تو وہ پھول کو کہاں رکھ پائے گا.... شیشے کے بنا تو پھول مرجھا جائے گا پھر....؟

محبت کی دنیا میں جو چیز جیسی پہلے دن تھی اب بھی ویسی ہی تھی۔ چیزیں' احساس' یادیں اور محبت کہیں نہیں جاتے' بس وقت گزر جاتا ہے اور انسان مرجاتا ہے....

قریب آکر احمد عمر بہت خاموشی سے میرے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں ٹی وی چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

محبت کو محبوب سے باندھتی ہے
غم ہے یا خوشی ہے تو
میری زندگی ہے تو
دوستوں کے درمیاں....
وجہ دوستی ہے تو
میری ساری عمر میں
ایک ہی کمی ہے تو

ایک ہی کمی.... احمد عمر کی آنکھوں میں اپنا آپ دیکھنے کی چاہ میں' میں اٹھ کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں مراکش کی اس خانقاہ کے طالب علم لگ رہے تھے جو حصول علم کے شوق میں خانقاہ کے اصول کے مطابق پہلے صدر دروازے پہ آئے گئے لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے کے لیے بٹھائے جاتے تھے.... اور جنہیں خانقاہ کے اندر برتن دھونے' دسترخوان سمیٹنے اور بستر لگانے غرض کے ہر قسم کے کام کے لیے پہلے آزمایا جاتا تھا پھر بالآخر انہیں ترقی مل جاتی تھی اور وہ علم حاصل کرنے میں ایک دن کامیاب ہو جاتے تھے۔

ہم دونوں بھی کامیاب تھے.... ہم نے بھی محبت کی' خانقاہ کے اندر بہت درد جھیلے تھے اور ہمیں بھی آج ترقی مل گئی تھی۔

وہ ترقی جو ہر عبیرہ ماہتاب اور اسفند عمر کے حصے میں نہیں آتی' جو صرف صالحہ ابراہیم اور احمد عمر جیسے لوگوں کو ملتی ہے۔ جو اپنے جذبوں میں فقط سچے ہوتے ہیں' جو محبت کے موسموں میں مستقل بھیگتے رہنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ کائنات کے اس منظر میں ہم کہیں نہیں تھے۔ ہم دونوں اس وقت ایک دوسرے کی آنکھوں میں تھے۔ مسکرا رہے تھے.... رو رہے تھے اور ہمارے پاس شیشے میں گلاب پڑا تھا۔

اسفند عمر اور عبیرہ ماہتاب جیسے پھیکے لوگ محبت کو ضائع کردیتے ہیں۔ احمد عمر اور صالحہ ابراہیم جیسے لوگ کبھی محبت کا ساتھ نہیں چھوڑتے تب ہی انہیں نصیب ہوتا ہے لازوال سکون.... جو اس تھوڑی سی زندگی کے لیے بہت ہوتا ہے۔ صبر سہل نہیں' مگر راس آجائے تو بہت میٹھا ہے۔

"زمانے گزر گئے احمد عمر! مگر پھر بھی تم میرے پاس آتے رہے۔ میرا رستہ نہ بھولے۔"

میں نے نم آنکھوں سے احمد عمر کی طرف دیکھا اور اس کی گود میں پڑے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"مگر احمد عمر! میں تھک گئی۔ میں فطرت سے نہیں بھاگ سکتی۔" میں خاموش ہو گئی۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی' کائنات کی ہر چیز ساکن ہو کر ہماری محبت کا اگلا پہر دیکھنے کی منتظر تھی جیسے۔ لائٹ جانے پر ٹی وی بھی بند ہو گیا تھا۔

"ہماری محبت کے دس سال نکل گئے۔ آنے والے دس سال بھی مجھے یقین ہے ہماری محبت ایسے ہی رہے گی مگر.... مگر آئندہ کے دس سالوں میں مجھے صرف محبت نہیں حیثیت بھی چاہیے.... میں محبت کے نام پر تاریخ میں امر نہیں ہونا چاہتی.... ایک عام عورت کی طرح تمہارے نام کے ساتھ جینا چاہتی ہوں.... تمہارے نام کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔"

فیصلے کا اختیار اس ہاتھ میں دے کر میں اٹھی۔ مجھے کسی نے بڑھنے نہیں دیا۔ ہاتھ تھام کر روکا گیا.... زمیں سے سرخ گلاب اٹھایا اور ہم دونوں کے خلا میں جھلایا۔

"محبت اس سرخ گلاب جیسی ہے صالحہ! جو اپنا گھر اپنا ٹھکانہ بدل کے کہیں نہیں جاتی' بس یہ ہے کہ اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اسے ساتھ ساتھ رکھنا پڑتا ہے اسے بسانا ہوتا ہے۔" اب وہ بولا تو مجھے خاموش رہنا تھا۔ میرے گھر کی خاموشی کو بے حد لطف ملا اس شخص کے منہ سے محبت کہانی سن کر۔

"تم ہمیشہ مجھے — منتظر ملیں.... میں کیوں نہ آتا تم تک۔ مجھ سے بڑھ کر تو تم نے نبھایا ہے اس تعلق کو.... ہم نے صبر کیا۔ شکر کیا کہ باغی نہ کہلائے۔ نافرمان نہ کہلائے۔ اب اپنے صبر اور شکر کا انعام پانا ہے۔ اب اپنی محبت بسانی ہے۔ تعلق کو رشتہ بنانا ہے۔ دو صدیوں والی روایت توڑنی ہے۔ آئندہ سالوں میں کسی کو احمد عمر نہیں بننا جو کسی صالحہ ابراہیم کو انتظار کروائے...." احمد عمر کے لفظوں میں اعتراف تھا.... احساس تھا۔ میں مسکرا دی.... وہ بھی مسکرا دیا.... ہم دونوں کی نظریں سرخ گلاب پر تھیں۔

سرخ گلاب جو محبت جیسا لگتا ہے....
خوب صورت.... تازہ.... ملائم....

✡

"بس میں نے کہہ دیا ہے۔"

"اور میں نے بھی کہہ دیا ہے جو تم چاہتے ہو' وہ نہیں ہو سکتا۔ غضب خدا کا ماں کے سامنے زبان چلاتا ہے۔"

"لیکن امی! آخر اس میں برائی کیا ہے؟"

"اس میں کوئی برائی نہیں میاں! برائیاں ہم میں ہیں۔ ہم اس کے فیشنوں کے خرچے پورے نہیں کر سکتے۔ تمہارا باپ منسٹر نہیں ہے اور نہ تم کسی سلطنت کے شہزادے ہو' ہمیں اپنے جیسی ہی لڑکی چاہیے۔"

"ہاں تو امی! اس کا باپ کون سا مل اونر ہے۔ ہمارے جیسے ہی سیدھے سادھے لوگ ہیں نوکری پیشہ ....اور پھر امی جان! وہ خوب صورت بھی تو کتنی ہے' ہے نا۔" بلال نے جذب کے عالم میں کہتے ہوئے ماں کے ہاتھ پکڑے۔

"اگر تمہارے ابو سن لیں نا تمہاری باتیں.... توبہ ہے آج کل کی اولاد! اور ہمارے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے پڑھی لکھی' خوب صورت' سادہ اور حیادار۔" ذکیہ بیگم نے آخری الفاظ پر زور دے کر کہا۔

"تو وہ بھی تو ہمارے خاندان کی ہی ہے نا امی.... آپ خوامخواہ ضد کر رہی ہیں۔"

"تم نہیں سمجھو گے بلال! میں تمہارے ہی بھلے کی بات کر رہی ہوں۔ تم صرف اس کی ظاہری خوب صورتی سے متاثر ہوئے ہو۔ ورنہ تم صحیح سے اسے جانتے تک نہیں ہو۔ اس کی عادات و اطوار کا کچھ علم نہیں ہے تمہیں.... اور یہ ظاہری حسن وقتی ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشش کھو دیتا ہے اور آج کل تو خوب صورت لگنا' کوئی مشکل کام نہیں' سب میک اپ اور مصنوعی طریقوں کا کمال ہوتا ہے۔ اصل خوب صورتی تو بیٹا! دل کے اندر ہوتی ہے' باطن کی خوب صورتی۔" ذکیہ بیگم اکیسویں صدی کے نوجوان کو یہ بات سمجھا رہی تھیں' جو دل ہی دل میں ان کی باتوں پر ہنس رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ میں شادی کروں گا تو صرف عیشا سے۔"

"اور تم بھی کان کھول کر سن لو صاحب زادے! تمہاری شادی ہوگی تو صرف عروسہ سے۔"

"امی جان.... میری پیاری امی جان! پلیز.... آخر آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔" بلال اب باقاعدہ منتوں پر اتر آیا۔

"آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ کے خاندان سے لڑکی پسند کی ہے میں نے اور آپ کی اور پھپھو کی تو ساری زندگی سرد جنگ رہی ہے اور اب آپ نے عروسہ کو میرے لیے پسند کر لیا۔"

"مجھے کوئی خوشی نہیں ہے۔ لڑکی کوئی تمہارے ماموں' خالہ کی بھی ہوتی تو ٹھیک تھا۔ میرے چچا کی بیٹی کی بیٹی۔ پہلے چچا جان ثمینہ چچی کے ہاتھوں پستے رہے' اور پھر بیٹیوں کے چرچے اور اب فرحت نے تو اعزاز میاں کی ساری جائیداد عیاشیوں میں اڑا دی۔ باقی بیٹیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہمیں گھر بسانے والی چاہیے۔ ہم نے کوئی اسے سجا کر رکھنا ہے گھر میں۔"

"امی! آپ نہ جانے کون سے زمانے کی کہانیاں سنا رہی ہیں لیکن میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر...."

"بس کرو.... باتوں میں پتا ہی نہیں چلا نماز کا وقت نکل رہا ہے۔" ذکیہ بیگم نے جیسے بلال کی بات سنی ہی نہیں اور اٹھ کر جانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

بلال کی نوکری لگتے ہی اس کی بہنوں اور امی کو شادی کی فکر شروع ہو گئی۔ وہ انجینئر تھا اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ بڑی دونوں بہنیں شادی شدہ تھیں اور بلال دو بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ سب گھر والوں کی متفقہ رائے تھی کہ بلال کے لیے اس کی پھوپھی زاد عروسہ کا رشتہ مانگا جائے۔ ابھی براہ راست ان سے بات نہ ہوئی تھی کہ بلال کو عیشا نظر آ گئی۔

خاندان میں ہونے والی کسی شادی کی تقریب میں اس نے عیشا کو دیکھ لیا۔ دور سے پڑنے والی ایک نظر میں ہی وہ اس پر فدا ہو گیا۔ اس کی نیلی آنکھیں' گوری رنگت' کاندھوں پر پھیلے سیدھے گولڈن براؤن بال' فیشن ایبل ڈریس' بلال کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا تھا۔

اور اس کے بعد اس کی ایک ہی تکرار تھی کہ وہ عروسہ سے نہیں بلکہ عیشا سے شادی کرے گا۔ حالانکہ وہ اسے جانتا تک نہ تھا۔ صرف دور سے دیکھ کر ہی وہ اس کے طلسم میں جکڑا گیا تھا اور اس کے دل و دماغ پر نیلی آنکھیں' گوری رنگت اور گولڈن بال سوار ہو گئے تھے۔

"عیشا ہمارے خاندان کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔" وہ سوچتا رہتا اور خوش ہوتا رہتا۔ اسے عیشا کو ہر قیمت پر حاصل کرنا تھا' چاہے کوئی خوش ہو' یا خفا۔

اسے اندازہ ہوا امی بھی جب باہر سے آتیں اور دروازہ کھلنے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو یہی حال ہوتا ہو گا' جو اس کا ہو رہا ہے۔ اب بھی اس کے باہر آنے تک کتنی ہی دفعہ گھنٹی بج چکی تھی اور اب تو مسلسل بجے جا رہی تھی۔

"اف کیا مصیبت ہے گھنٹہ ہو گیا ہے میں دھوپ

میں کھڑا سوکھ رہا ہوں۔" عروسہ نے دروازہ کھولا تو سامنے بلال کھڑا تھا۔ گرمی شاید اس کے دماغ کو لگ گئی تھی۔

"اب اندر آنے دیں گی محترمہ...." وہ سلام کر کے ایک طرف ہو گئی۔

"امی اور مامی تو بازار گئی ہیں۔" عروسہ نے اپنی طرف سے اسے اطلاع فراہم کی۔

امی نے اسے شام کو پہنچنے کو کہا تھا لیکن وہ عصر پہ ہی آ گیا تھا۔ آفس سے فارغ ہوا تو سیدھا یہیں چلا آیا۔ کمرے میں کولر آن تھا۔ ایک دم جھلساتی گرمی سے خوش گوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ دھڑ سے صوفے پر گر کر بیٹھ گیا۔

"کھانا کھائیں گے؟" بڑے شائستہ اور مہذب انداز میں پوچھا گیا۔

"نہیں...."

"ٹھنڈا یا چائے؟"

"نہیں...." دوبارہ ٹکا سا جواب دیا۔ وہ کچھ کہے بغیر کچن میں چلی گئی۔ واپس آئی تو ٹرے میں کولڈ ڈرنک

اور فروٹ تھا۔
"آپ بیٹھیں..... میں ابو کو بلا کر لاتی ہوں۔" سادہ لہجہ..... نرم آواز' عروسہ ہمیشہ سے ہی ایک باوقار لڑکی تھی۔ تمام خاندان کی پسندیدہ ہستی۔
بلال کے حواس اب کچھ بحال ہو چکے تھے۔ اس نے یوں ہی بلا ارادہ عروسہ کی طرف دیکھا۔ صاف شفاف گندمی رنگت' کالی سیاہ آنکھوں پر لمبی گھنی پلکیں' گھنگھریالے بالوں کی لمبی اور موٹی چوٹی جو اس کے سر پر جمے دوپٹے سے نیچے لٹک رہی تھی۔
مگر عیشا اور عروسہ کا کیا مقابلہ؟ بلال نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے ارادے کو مزید پختہ کرلیا۔
اور پھر پورے پانچ دن وہ اپنے دوست اور ماموں زاد آذر کے گھر رہا۔ اس نے گھر چھوڑ دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو وہ یہ شہر ہی چھوڑ جائے گا۔ ماں' باپ' بہنیں دوڑی چلی آئیں۔ آخر سب کو اس کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔
سب لوگ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ امی' ابو' بہنیں اور خاندان کے بزرگ رشتہ طے ہونے پر انگوٹھی پہنا آئے اور منگنی والے روز ہی شادی کی تاریخ بھی طے کردی گئی۔
دعوت پر اپنی سسرال گیا۔ تب بھی دور سے ہی عیشا کی ایک جھلک دکھائی دی۔
اس کے ساتھ کا تصور ہی اتنا زور آور تھا کہ وہ سب کچھ بھلا بیٹھا۔ امی' ابو کی محبت' بہنوں کے ارمان..... سب کچھ عیشا کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔
ان سب دنوں میں جو خاص بات ہوئی وہ آذر اور عروسہ کا رشتہ طے ہونا تھا اور نہ صرف رشتہ بلکہ بلال اور عیشا کی شادی سے پہلے ہی ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

اور پھر اس کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ نیلی آنکھوں' گوری رنگت اور گولڈن بالوں والی عیشا اس کے من کی مراد بن کر اس کے آنگن میں آگئی۔ شروع کے کچھ دن وہ ہواؤں میں اُڑتا رہا۔ گھومنے پھرنے بھی گئے۔ دعوتوں کا سلسلہ کچھ کم ہوا تو امی کو فکر ہوئی کہ آذر اور عروسہ کی شادی کی دعوت ہے۔
بلال بہت خوش نظر آرہا تھا۔ عروسہ ہلکے پھلکے میک اپ' میچنگ جیولری میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ کلپ لگا کر گھنگھریالے بال کھول رکھے تھے۔ دوپٹا سر پر حسب معمول جما رکھا اور لمبے بال باہر جھانک رہے تھے۔
عیشا بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ دوپٹا بڑی لاپروائی سے گلے میں ایک طرف جھول رہا تھا۔ آج پہلی دفعہ بلال کو اس طرح سب لوگوں کی موجودگی میں خاندان کے بزرگوں کے سامنے یوں عیشا کا گلے میں دوپٹا لٹکا کر پھرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چلو سر پر نہ لے مگر ڈھنگ سے تو اوڑھ لے۔ وہ صرف سوچتا ہی رہا کہہ نہ سکا۔ خوامخواہ شرمندہ ہونے لگا۔
رفتہ رفتہ زندگی روٹین پہ آگئی۔ وہ صبح آفس جاتا تو امی ہی اس کے لیے ناشتا بناتیں۔ عیشا نے ایک دن بھی اٹھنا اپنی ذمہ داری نہ سمجھا۔ وہ امی کے سامنے نظریں جھکا کر رہ جاتا۔
شام کو گھر آتا تو عیشا تیار ملتی۔ آج یہاں جانا ہے۔ تو کل وہاں۔ آج بلال نے خود ہی آفس سے فون کرکے کہا تھا کہ تیار رہے آج ماموں کے گھر چلیں گے۔ کتنے دن ہوئے تھے آذر سے ملے ہوئے۔ وہ اس کے بچپن کا دوست تھا اور کزن بھی۔ اکٹھے کھیلے' پھر اسکول' کالج پڑھا بھی ساتھ ہی۔ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔
وہ گھر آیا تو حیران ہو گیا۔
"تم تیار نہیں ہوئیں' میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ ماموں کی طرف جانا ہے۔"
"میں کیا کرتی بلال! تم نے اچانک ہی پروگرام بنالیا۔ آج تو میری کہیں کی تیاری نہیں تھی۔ لائٹ بھی نہیں ہے۔" وہ اسے بڑی سہولت سے تم کہتی تھی۔
"تو اس میں کیا پرابلم ہے۔ اتنی تیاری کی کیا

ضرورت ہے۔ ماموں کے گھر ہی تو جانا ہے۔ الماری میں دس جوڑے لٹکے رہتے ہیں تمہارے۔"
"آج پارلر گئی تھی۔ وہ بھی بند تھا اور ایک مسئلہ یہ ہے کہ میرا ایک آئی لینس بھی ٹوٹ گیا ہے۔ اچانک ہی' پتا ہی نہیں چلا' ہاتھ سے گر گیا۔" وہ صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔
"تو اس کا ماموں کے گھر جانے سے کیا تعلق ہے؟"
"تعلق ہے نا' بس میں نہیں جاسکتی ہے۔" عیشا نے ہٹ دھرمی دکھائی۔ بلال نے غور سے دیکھا۔ ایک بار' دوبار' پھر غور سے دیکھا۔
"عیشا! تمہاری آنکھوں کا رنگ کیسے بدل گیا۔"
"کیا مطلب....." عیشا نے حیرانی سے بلال کو دیکھا۔
"مطلب کہ یہ تو نیلی نہیں ہیں۔"
"اوہ بلال! وہ تو ان دنوں میں بلیو کلر کے لینس یوز کررہی ہوں اس لیے۔ ورنہ میری آنکھیں تو ایسی ہی ہیں۔" بلال کے سر پر جیسے کوئی بم گرا۔
"اور تمہاری اسکن۔" اس نے پاس بیٹھی عیشا کے چہرے پر نظریں گاڑ لیں۔
"ہاں اسکن میری بہت ڈل اور رف ہے۔ میری سب بہنوں میں سے ایک میری ہی اسکن ایسی ہے۔ وہ تو میں باقاعدگی سے پارلر جاتی ہوں۔ کوالٹی میک اپ استعمال کرتی ہوں۔ اس لیے اچھی نظر آتی ہے۔ آج بھی پارلر گئی تھی' مگر بند تھا۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ماموں کے گھر کل چلیں گے۔ میں صبح پارلر بھی ہو آؤں گی اور لینس بھی لے لوں گی۔ ویسے میرا خیال ہے اب کلر چینج کرلوں۔ گرین سوٹ کرے گا؟" وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی' یہ جانے بغیر کہ بلال کی حالت کیا ہو رہی ہے۔
اسے تو جیسے کسی نے گہری کھائی میں دھکا دے دیا تھا' اور وہ گرا بھی منہ کے بل تھا۔
"ایک تو آج لائٹ بھی مصیبت بن گئی ہے۔" عیشا نے کوفت سے ہیر اسٹریٹنر اٹھا کر دیکھا۔ پھر نیچے رکھ دیا۔
"تمہارے بال بھی تو....." بلال نے چڑیا کے گھونسلے جیسے عیشا کے بالوں کو دیکھتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑا۔
"اف بلال! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ میرے بال کرلی ہیں مگر مجھے سیدھے اچھے لگتے ہیں۔ جب ہی اسٹریٹنر یوز کرتی ہوں۔ ہاں مگر..... یہ گولڈن کلر زیادہ سوٹ نہیں کر پایا مجھ پر' اس دفعہ ڈارک براؤن کلر کراؤں گی۔ اچھا لگے گا نا؟" وہ اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی۔
جبکہ وہ گردونواح سے بے خبر تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ عیشا انکشاف پر انکشاف کررہی تھی اور دوری کا طلسم ٹوٹتا جارہا تھا۔ نیلی آنکھوں' گوری رنگت اور گولڈن بالوں کی جگہ ملیالی آنکھیں' ڈل اور رف اسکن اور چڑیا کے گھونسلے جیسے بال تھے۔

☼

مکمل ناول

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف غازی کا بھانجا ہے، جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں' ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے' حنین اور اسامہ' سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر' سعدی یوسف کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی فائرنگ کے نتیجہ میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی' سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے' جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے.... ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سونیا کی سالگرہ دھوم دھام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

فارس غازی' ہاشم کاردار کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں' جس میں اس کا بھی حصہ ہے'

رہائش پذیر تھا۔ فارس غازی کے جیل جانے کے بعد اس کا پورشن مقفل ہے۔
سعدی یوسف کے لیے وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھا جب اسے فارس غازی کے رہا ہونے کی خبر ملتی ہے۔
ہاشم نے یہ خبر سن کر عہد کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ فارس غازی جیل سے نکلتا ہے تو سعدی یوسف ان کا منتظر ہوتا ہے۔ فارس اس سے قبرستان چلنے کو کہتا ہے۔ قبرستان جا کر فارس دو قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے سعدی کا موبائل لے لیتا ہے۔ قبرستان میں وہ کسی کو فون کرکے کوئی ہتھیار منگواتا ہے۔
ہاشم کاردار' زمر کو اپنی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دینے کے ساتھ سعدی کا کارڈ بھی زمر کو دے دیتا ہے۔
زمر کے والد کو اپنے پوتے سعدی یوسف سے بہت محبت ہے۔ وہ زمر سے کہتے ہیں' سعدی کی گلہ پرورش کرنے ان کے گھر جائے۔ وہ پھول لے کر کارڈ دینے سعدی کے گھر جاتی ہے۔ زمر کو دیکھ کر سعدی کے ساتھ تمام گھر والے حیران ہو جاتے ہیں۔ زمر' سعدی کو سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دیتی ہے۔
زمر کے جانے کے بعد سعدی نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔ اسی وقت ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملایا۔ اس نے ہوٹل میں ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگایا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سعدی نے جب بیگ سے ٹیبلٹ نکالا تو اسے پریس کرنے کے بعد اسکرین پہ پیغام آیا کہ آپ کی ڈیوائس کو ایک ہارڈ ڈرائیو ملی ہے' کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟ سعدی نے مسکراتے ہوئے "یس" دبایا۔ اسکرین پہ دوسرا پیغام دیکھ کر سعدی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔
اسکرین پہ پیغام جل بجھ رہا تھا کہ "پاس ورڈ داخل کریں" سعدی کے پاس 'پاس ورڈ نہیں تھا۔
سعدی یوسف' ہاشم کاردار کی سابقہ بیوی شہرین سے ایک شاپنگ مال میں مل کر کہتا ہے۔ مجھے آپ سے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ شہرین' سعدی سے کہتی ہے کہ "تم کیا کرنے جا رہے ہو؟" سعدی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ "ہاشم بھائی نے جو ہم سے چرایا تھا' میں وہ واپس چرانے جا رہا ہوں۔"
شہرین نوشیرواں کے پاس جا کر کہتی ہے کہ سونیا کو اس کی اور ہاشم کی ہنی مون کی پکچرز چاہئیں۔ یہ جھوٹ بول کر نہایت چالاکی سے شہرین نوشیرواں سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

حنین یوسف پر اس کی دوست کی وجہ سے کمرہ امتحان میں نقل کا الزام لگتا ہے۔ ٹیچرز حنین سے کہتی ہیں کہ اس پر کیس بنے گا اور وہ تین سال تک پیپرز نہیں دے سکتی۔ وہ حنین کو آفس میں بٹھا کر چلی جاتی ہیں تو حنین کی نظر میز پہ سپرنٹنڈنٹ کے پرس کے ساتھ رکھے موبائل پر پڑتی ہے۔ حنین موبائل اٹھا کر دھڑکتے دل سے ہاشم کا نمبر ملا کر اسے تمام صورت حال سے آگاہ کرتی ہے۔ ہاشم کچھ دیر بعد ہی امتحانی مرکز میں پہنچ جاتا ہے اور کمال ہوشیاری سے حنین کو مشکل وقت سے نہ صرف نکلواتا ہے بلکہ حنین کو پیپر مکمل کرنے کے لیے ٹیچرز سے ایکسٹرا ٹائم بھی دلواتا ہے۔
پیپر دینے کے بعد حنین ہاشم کا شکریہ ادا کرتی ہے اور ہاشم سے کہتی ہے۔ کہ سعدی بھائی کو اس معاملے کے بارے میں مت بتائیے گا۔ ہاشم حنین سے پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے۔ جس پر حنین کہتی ہے کہ پارٹی میں ہم سب آئیں گے۔
قصر کے سبزہ زار میں سیاہ شام سنہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ روشنیاں' قہقہے' سیاہ اور سنہری امتزاج سے سجی سونیا کی سالگرہ کی تقریب کی رونق عروج پر تھی۔
حنین سنہری فراک میں جبکہ سعدی' اسیم اور زمر سیاہ سوٹ میں ملبوس تقریب میں شریک تھے۔ شہرین ان کی میز کے پاس آکر زمر کو ڈی اے کہہ کر پکارتی ہے اور سعدی سے رسمی سا حال احوال پوچھ کر کمال مہارت سے نیپ پکڑا کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ سعدی نیپ کو کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ کر سوچتا ہے کہ آدھا کام ہو گیا مگر ابھی پاس ورڈ لینا باقی ہے۔
جواہرات دو' تین خواتین کے ساتھ سعدی اور زمر کی میز کی طرف آتی ہے۔ جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کا تعارف کرواتی ہے پھر سعدی یوسف کا تعارف بھی کروا کر سعدی سے کہتی ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب ان خواتین کو بتائے۔ نوشیرواں

قدرے فاصلے پر کھڑا تند نظروں سے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ سعدی سمجھ جاتا ہے کہ جواہرات اس وقت نوشیرواں کی بے عزتی کا بدلہ اتار رہی ہے پھر سعدی اپنا شجرہ نسب ایسا بتاتا ہے کہ جس سے نوشیرواں کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور جواہرات کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اسی دوران جواہرات اپنی فرینڈز سے زمر کے سابقہ منگیتر حماد کا ذکر چھیڑ دیتی ہے' جس کی وجہ سے زمر ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔
شہرین بڑی ہوشیاری سے سعدی کو پاس ورڈ بتا دیتی ہے۔
دوسری جانب زمر کا گیسٹ روم میں فارس سے سامنا ہو جاتا ہے فارس کو دیکھ کر زمر غصے میں باہر کی طرف جاتی ہے۔
پاس ورڈ ملنے کے سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے۔ جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے' ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے' لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
ہاشم غصے میں خاور سے کہتا ہے کہ سعدی جیسے ہی ایگزٹ پر پہنچے' اسے روکو۔ جبکہ ملازمہ فیونا ہاشم کے کہنے پر جان بوجھ کر سعدی سے ٹکراتی ہے اور اس کے کوٹ میں نیکلس ڈال کر معذرت کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔
جیسے ہی زمر' سعدی' حنین اور اسیم گھر جا رہے ہوتے ہیں تو خاور انہیں روک کر بتاتا ہے کہ مسز جواہرات کا نیکلس چوری ہو گیا ہے' زمر غصے میں خاور سے کہتی ہے کہ یہ میری فیملی کے بچے ہیں' ان کی تلاشی لینے سے پہلے میری تلاشی لینا ہو گی۔ اس دوران ہاشم بھی وہاں آ جاتا ہے اور پھر بگڑتی صورت حال دیکھ کر انہیں جانے دیتا ہے۔
ریسٹورنٹ کا بل دینے کے لیے سعدی حنین سے اپنے کوٹ سے والٹ نکالنے کو کہتا ہے' حنین کے ہاتھ میں والٹ کے بجائے نیکلس آ جاتا ہے۔ زمر کی نگاہیں نیکلس کو دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں' زمر غصے میں سعدی کو کہتی ہے اسے گھر ڈراپ کر دے۔
ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شیرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔
دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

زمر سعدی کے ریسٹورنٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بڑے ابا نے اسے بتا دیا ہے کہ اسے گردہ کسی خاتون نے نہیں بلکہ اس نے دیا ہے۔ اسی دوران فارس وہاں آ جاتا ہے جسے دیکھ کر زمر نفرت آمیز نگاہ فارس پر ڈال کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔
سعدی بہت دنوں بعد آفس جاتا ہے اور اپنی باس سارہ کو فیلڈ رپورٹ دے کر کہتا ہے کہ اس نے کام مکمل کر لیا ہے' اور انڈیا جانے کی تیاری بھی مکمل کر لی ہے۔
مرحوم ذوالفقار یوسف کے گھر میں سعدی کے دادا' پھپھو زمر' والدہ اور بہن بھائی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسی دوران حنین سعدی کے کمرے میں جاتی ہے تو وہاں سعدی کے کھلے لیپ ٹاپ کے اسکرین پہ چلتے نمبرز دیکھ کر حیران ہوتی ہے سعدی جلدی سے آ کر لیپ ٹاپ میں اپنا ایک ہاتھ مار کر بند کر دیتا ہے۔
ہاشم سعدی سے ملاقات کا کہتا ہے۔ وہ ہاشم کو ٹالنے کے لیے ہاں کہہ دیتا ہے۔
نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔
حنین اپنے اور اسیم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مخملیں ڈبے پر پڑتی ہے تو اس کے اندر ایک لاکٹ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر پرویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں "ہیپنس ایور آفٹر" کندہ تھا۔ یہ سعدی کی چین کا جڑواں تھا۔
سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے۔ جس میں زمر کا سابق منگیتر حماد بھی آئے گا۔ زمر سعدی

سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔
سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔
ہاشم کی سیکریٹری کال کر کے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔
ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔
دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہو گئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آنٹس ایور آفٹر" (Ants ever after) لکھا ہوتا ہے وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔
سعدی نے ہاشم کے کمپیوٹر سے جو فائلز لی تھیں، وہ انہیں آپریٹ نہیں کرپاتا، وہ ڈیٹا تباہ ہو جاتا ہے۔
ایک رشتے دار کی شادی کی تقریب میں زمر اور سعدی کی فیملی کے ساتھ زمر کے سابق منگیتر حماد اور اس کی بیوی کرن بھی آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کرن زمر کو دیکھ کر اپنی کزن سے زمر کے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہے جسے سن کر زمر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
اسی دوران سعدی کی والدہ ندرت زمر کو سعدی کے لیے لڑکی دکھاتی ہیں۔ زمر کو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔
سیم ندرت سے کہتا ہے کہ اگر لڑکی والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو؟
اس پر زمر کہتی ہے کہ کیوں انکار کریں گے کوئی وجہ بنتی ہے کیا؟ اس بات پر حنین بے ساختہ کہتی ہے۔
"بغیر وجہ کے بھی انکار ہو جاتے ہیں جیسے آپ نے فارس ماموں کے رشتے سے انکار کیا تھا۔" یہ سن کر زمر بالکل ساکت کاموش رہ جاتی ہے۔

در حقیقت زمر کو فارس کے رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کب رشتہ مانگا گیا تھا؟ کب انکار ہوا؟
زمر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے فارس نے اس سے ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔
زمر بصیرت صاحب کو فون کر کے کہتی ہے کہ اسے ایک کیس فائل چاہیے۔
"سرکار بنام فارس غازی۔"

چھٹی قسط

پانی سے گاڑھا

اور دنیا کے پہلے قاتل کو سزا
سنائی تھی خود منصف اعلیٰ نے
کیا وہ موت تھی؟
نہیں!
بلکہ وہ "زندگی" تھی....
اور کہہ دیا تھا خدا نے کہ....
اے قابیل!
تم پھوگے زمین میں
مفرور، بدنصیب، نشان زدہ ہو کر

اور تمہاری پیشانی کے نشان سے پہچان لے گا
تمہیں ہر ملنے والا
اور یہ بھی فرمایا کہ
(کوئی قتل نہ کرے قابیل کو، کیونکہ)
جو کوئی قتل کرے گا قابیل کو
میں اسے خود سزا دوں گا
سات گنا زیادہ....

("ہنری لانگ فیلو" کی تحریر "ٹیبل ٹاک" سے ماخوذ)

جواہرات بالکل سُن سی ہوئی زمر کو دیکھ رہی تھی۔ گو کہ وہ یہی چاہتی تھی کہ زمر فارس سے انتقام لے، مگر پھر بھی اتنا تیزی سے ہوتا سب کچھ اسے مضطرب کر رہا تھا۔ اس نے بظاہر مسکرا کر سامنے دیکھا، جہاں شادی کا فنکشن اور روشنیاں نظر آرہی تھیں، اور حماد اور کرن بھی۔
"آف کورس! میں تمہاری مدد کروں گی، لیکن یہ انتقام فارس سے ہے یا خود اپنے آپ سے؟"
"اگر پہلا پورا ہو جائے تو دوسرا بھی قبول ہے مجھے۔" زمر بھی سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔
"کیا تم اس کا مقدمہ ری اوپن نہیں کرسکتیں؟ اگر عدالت اس کو سزا دے تو زیادہ بہتر...."
"آپ میری مدد کریں گی یا میں کسی اور کے پاس جاؤں؟ آپ کو یاد ہوگا، آپ نے میرے پاس آکر مجھے پیش کش کی تھی کہ اگر کبھی میرا ارادہ بدلا تو آپ میرے انتقام میں میری مدد کریں گی۔" اس نے سرد، سپاٹ سے انداز میں اسے دیکھا تو جواہرات فوراً" مسکرائی۔ آگے بڑھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔
"شیور، میں اپنی بات پہ قائم ہوں۔ یہ سب قدرتی طریقے سے ہوگا، وہ بہت جلد تمہارے گھر تمہارا رشتہ لینے آئے گا، بس تم اس امر کو یقینی بنانا کہ تمہارے والد انکار نہ کریں۔"

"تھینکس۔" زمر کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ جواہرات خاموشی سے سامنے دیکھنے لگی۔ وہ ذہن میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی۔
فنکشن اب اپنے اختتام کی جانب رواں دواں تھا۔ سعدی، حنین کے ساتھ خاموشی سے بیٹھا گاہے بگاہے، دور کھڑی، ہلکی آواز میں باتیں کرتی زمر اور جواہرات پہ نظر ڈال لیتا۔ جواہرات نے اسے خود کو دیکھتا پایا تو نزاکت سے مسکرائی.... سعدی جبراً" مسکرایا اور رخ پھیرا تو حنین پہ نظر پڑی، وہ گردن ذرا موڑ کر دور ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ناپسندیدگی ابھری۔ چہرہ حنین کے قریب کیا۔
"آئندہ ان سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ ہی ان کی کسی بات کا اعتبار کرنا۔" حنین نے چونک کر اسے دیکھا، قدرے دل گرفتی سے۔ "وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے، ان کو واقعی افسوس ہے۔" قدرے رکی۔ "ان کو علیشا کے لیے واقعی افسوس ...."
"جانے بھی دو حنین!" وہ بے زار سا پیچھے ہوا، پھر وہاں سے اٹھ آیا۔ ہال کے کونے میں کھلتے دروازے پہ وہ رکا، وہ مردوں کے لیے مختص ریسٹ رومز تھے۔ اندر شیشے سے ڈھکی دیوار اور سامنے لگے بیسن کی قطار، اس کے آگے باتھ رومز تھے۔
سعدی ایک بیسن کے سامنے آکھڑا ہوا، نل کھولا، چہرے پہ چھینٹے مارے، نل بند کیا۔ ساتھ رکھے ٹشو اٹھائے، ہاتھ صاف کیے، چہرہ اٹھایا تو ٹھٹک کر رکا۔

آئینے میں اپنے عقب میں ہاشم کھڑا نظر آرہا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے، فلڈ کوٹ کا بٹن بند، نرمی سے (بغیر مسکراہٹ کے) اسے دیکھتا۔
"تم میرے آفس نہیں آئے، میری سیکرٹری نے دوبارہ تمہیں فون کیا مگر تم نے نہیں اٹھایا۔"
"میں مصروف تھا۔" وہ سر جھکائے، ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ہاشم سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو وہ شادی میں جائے گی یہ بات جب بڑے ابا کو پتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔
سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسایا گیا تھا۔
ہاشم کی سیکریٹری کال کر کے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آرہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا' وہ اس سے ملاقات کو یونہی ٹالتا رہے گا۔
ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جا سکتے ہیں! جب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔
دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آنے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہو گئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح گھوم رہے تھے۔
سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے' حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے مبر "آنٹس ایور آفٹر" (Ants ever after) لکھا ہوتا ہے وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔
سعدی نے ہاشم کے کمپیوٹر سے جو فائلز لی تھیں' وہ انہیں اپ ڈیٹ نہیں کر پاتا' وہ ڈیٹا تباہ ہو جاتا ہے۔
ایک رشتے دار کی شادی کی تقریب میں زمر اور سعدی کی فیملی کے ساتھ زمر کے سابق منگیتر حماد اور اس کی بیوی کرن بھی آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کرن زمر کو دیکھ کر اپنی کزن سے زمر کے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہے جسے سن کر زمر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔
اسی دوران سعدی کی والدہ ندرت زمر کو سعدی کے لیے لڑکی دکھاتی ہیں۔ زمر کو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔
سیم ندرت سے کہتا ہے کہ اگر لڑکی والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو؟
اس پر زمر کہتی ہے کہ کیوں انکار کریں گے کوئی وجہ بنتی ہے کیا؟ اس بات پر حنین بے ساختہ کہتی ہے۔
"بغیر وجہ کے بھی انکار ہو جاتے ہیں جیسے آپ نے فارس ماموں کے رشتے سے انکار کیا تھا۔" یہ سن کر زمر بالکل ساکت کاموش رہ جاتی ہے۔
درحقیقت زمر کو فارس کے رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کب رشتہ مانگا گیا تھا؟ کب انکار ہوا؟
زمر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے فارس نے اس سے ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔
زمر بصیرت صاحب کو فون کر کے کہتی ہے کہ اسے ایک کیس فائل چاہیے۔
"سرکار بنام فارس غازی۔"

چھٹی قسط

پانی سے گاڑھا

اور دنیا کے پہلے قاتل کو سزا
سنائی تھی خود منصف اعلیٰ نے
کیا وہ موت تھی؟
نہیں!
بلکہ وہ "زندگی" تھی....
اور کہہ دیا تھا خدا نے کہ....
اے قابیل!
تم پھوگے زمین میں
مفرور' بدنصیب' نشان زدہ ہو کر

اور تمہاری پیشانی کے نشان سے پہچان لے گا
تمہیں ہر ملنے والا
اور یہ بھی فرمایا کہ
(کوئی قتل نہ کرے قابیل کو' کیونکہ
جو کوئی قتل کرے گا قابیل کو
میں اسے خود سزا دوں گا
سات گنا زیادہ....
("ہنری لانگ فیلو" کی تحریر "ٹیبل ٹاک" سے ماخوذ)

جواہرات بالکل سُن سی ہوئی زمر کو دیکھ رہی تھی۔ گو کہ وہ یہی چاہتی تھی کہ زمر فارس سے انتقام لے مگر پھر بھی اتنا تیزی سے ہوتا سب کچھ اسے مضطرب کر رہا تھا۔ اس نے بظاہر مسکرا کر سامنے دیکھا' جہاں شادی کا فنکشن اور روشنیاں نظر آرہی تھیں' اور حماد اور کرن بھی۔
"آف کورس! میں تمہاری مدد کروں گی' لیکن یہ انتقام فارس سے ہے یا خود اپنے آپ سے؟"
"اگر پہلا پورا ہو جائے تو دوسرا بھی قبول ہے مجھے۔" زمر بھی سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔
"کیا تم اس کا مقدمہ ری اوپن نہیں کر سکتیں؟ اگر عدالت اس کو سزا دے تو زیادہ بہتر....."
"آپ میری مدد کریں گی یا میں کسی اور کے پاس جاؤں؟ آپ کو یاد ہو گا' آپ نے میرے پاس آکر مجھے پیش کش کی تھی کہ اگر کبھی میرا ارادہ بدلا تو آپ میرے انتقام میں میری مدد کریں گی۔" اس نے سرد' سپاٹ سے انداز میں اسے دیکھا تو جواہرات فوراً" مسکرائی۔ آگے بڑھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔
"شیور' میں اپنی بات پہ قائم ہوں۔ یہ سب قدرتی طریقے سے ہو گا' وہ بہت جلد تمہارے گھر تمہارا رشتہ لینے آئے گا' بس تم اس امر کو یقینی بنانا کہ تمہارے والد انکار نہ کریں۔"

"تھینکس۔" زمر کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ جواہرات خاموشی سے سامنے دیکھنے لگی۔ وہ ذہن میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی۔
فنکشن اب اپنے اختتام کی جانب رواں دواں تھا۔ سعدی' حنین کے ساتھ خاموشی سے بیٹھا گاہے بگاہے' دور کھڑی' ہلکی آواز میں باتیں کرتی زمر اور جواہرات پہ نظر ڈال لیتا۔ جواہرات نے اسے خود کو دیکھتا پایا تو نزاکت سے مسکرائی... سعدی جبراً" مسکرایا اور رخ پھیرا تو حنین پہ نظر پڑی' وہ گردن ذرا موڑ کر دور ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ناپسندیدگی ابھری۔ چہرہ حنین کے قریب کیا۔
"آئندہ ان سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے' نہ ہی ان کی کسی بات کا اعتبار کرنا۔" حنین نے چونک کر اسے دیکھا' قدرے دل گرفتی سے۔ "وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے' ان کو واقعی افسوس ہے۔" قدرے رکی۔ "ان کو علیشا کے لیے واقعی افسوس ___"
"جانے بھی دو حنین!" وہ بے زار سا پیچھے ہوا' پھر وہاں سے اٹھ آیا۔ ہال کے کونے میں کھلتے دروازے پہ وہ رکا' وہ مردوں کے لیے مختص ریسٹ رومز تھے۔ اندر شیشے سے ڈھکی دیوار اور سامنے لگے بیسن کی قطار' اس کے آگے باتھ رومز تھے۔
سعدی ایک بیسن کے سامنے آکھڑا ہوا' نل کھولا' چہرے پہ چھینٹے مارے' نل بند کیا۔ ساتھ رکھے ٹشو اٹھائے' ہاتھ صاف کیے' چہرہ اٹھایا تو ٹھٹک کر رکا۔
آئینے میں اپنے عقب میں ہاشم کھڑا نظر آرہا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے' فلڈ کوٹ کا بٹن بند' نرمی سے (بغیر مسکراہٹ کے) اسے دیکھتا۔
"تم میرے آفس نہیں آئے' میری سیکرٹری نے دوبارہ تمہیں فون کیا مگر تم نے نہیں اٹھایا۔"
"میں مصروف تھا۔" وہ سر جھکائے' ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ہاشم سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"کیا اس ہفتے آؤ گے؟"

"جی، آؤں گا۔ مجھے اور آپ کو بات کرنے کی واقعی ضرورت ہے۔" ٹشو ٹوکری میں پھینک کر سعدی سنجیدگی سے کہتے ہوئے مڑا۔

"تمہارے پاس کچھ ہے سعدی جو میرا ہے، تمہیں چاہیے کہ تم مجھے وہ پرامن طریقے سے لوٹا دو۔"

"نہیں تو کیا کریں گے آپ؟" سعدی قدم قدم چلتا اس کے سامنے آیا، اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

ہاشم یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ سات سال پہلے جس معصوم لڑکے سے وہ ملا تھا، وہ یہ نہیں تھا۔ ہاشم کے ماتھے پہ بل آئے۔

"میں کچھ بھی نہیں کروں گا بچے! سوائے ایک نصیحت کے۔ جس شخص کے خاندان کے دو لوگ قتل ہو چکے ہوں، اس کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کہیں اگلا نمبر اسی کا نہ ہو۔" سعدی کے چہرے پہ عجیب سا دکھ ابھرا، بھنویں سکیڑ کر اس نے قدرے تعجب سے ہاشم کو دیکھا۔

"کیا آپ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں؟ کیا آپ میری جان لے سکتے ہیں؟"

ہاشم نے جیب سے ہاتھ نکال کر عادتاً" سعدی کا شانہ تھپتھپانے کو آگے بڑھایا، مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ سعدی کے کندھے کو چھوا، وہ کرنٹ کھا کر ایک قدم پیچھے ہوا، دونوں ہاتھ اٹھا دیے، اور بہت ضبط سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

"اپنے ان ہاتھوں سے مجھے مت چھوئیے گا۔"

ہاشم کا ہاتھ ہوا معلق میں رہ گیا پھر اس نے سخت تاثرات کے ساتھ سر کو خم دیا، ہاتھ واپس نیچے کر لیا اور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سعدی تیزی سے باہر نکل گیا۔

ہاشم نے ایک نظر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا۔ وہ سپید تھا، پتلی انگلیاں، باقاعدگی سے مینی کیورڈ شدہ۔ اس نے ہلکا سا سر جھٹکا۔ دل میں گہرا کرب اترا۔ کیا وہ دونوں واقعی واپس نہیں جا سکتے تھے؟ اچھے وقتوں میں واپس؟

وہ باہر آیا تو نوشیرواں بے زار سا کھڑا، دور کرسی پہ بیٹھی حنین اور سعدی کو گھور رہا تھا۔ جیسے بس نہ چلتا ہو دونوں بہن بھائی کو گولی مار دے۔

"کیا بکواس کی تھی میں نے؟ اس کی بہن کا پیچھا چھوڑ دو!" اس نے آکر سختی سے کہا تو شیرو نے گڑبڑا کر بھائی کو دیکھا، پھر لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"مجھے کیا! ہونہہ!" ہاشم نے گھور کر اسے دیکھا۔

"تم ابھی تک اس شہرین ڈراما سے نہیں نکلے شیرو! بہت ہو گیا۔"

"اس کی وجہ سے میں شہرین کو کبھی نہیں پاسکوں گا! پچھلے ایک ہفتے سے یہی سوچ سوچ کر میرا دماغ کھول رہا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں، بہت ہو گیا۔"

"اوہ پلیز!" ہاشم نے بے زار سا ہو کر سر جھٹکا۔

"ہمارے پاس اس سے بڑے مسائل ہیں۔"

"اور کیا مسئلہ ہے؟ آپ نے کہا تھا، وہ آپ کے ڈاکیومنٹس نہیں کھول سکے گا۔ پھر؟" نوشیرواں حیران ہوا۔

"مگر وہ جانتا ہے کہ میرے ہاتھ پہ کس کس کا خون ہے۔" کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ نوشیرواں کے ابرو تعجب سے تنے۔

"وہ وارث غازی کی فائلز وغیرہ کے پیچھے تھا، فارس کو باہر لانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اسے یہ کیسے پتا چل سکتا ہے کہ آپ کسی قتل میں ملوث..."

"اسے معلوم ہے شیرو! اور فی الحال یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مگر ہاں، تم اس کو نہیں چھیڑو گے۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم کچھ نہیں کرو گے۔" برہمی سے اس کو تنبیہہ کی۔ نوشیرواں نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "اوکے" اور پھر سے ان ہی نظروں سے دور بیٹھے سعدی کو دیکھنے لگا۔

وہ لوگ اب گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ فنکشن ڈھلتے چاند کی طرح دم توڑ رہا تھا۔ آگے اندھیری رات تھی۔

☼ ☼ ☼

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

زمر شادی کی تقریب سے لوٹی تو اس کی ہدایت کے مطابق صداقت پراسیکیوٹر بصیرت سے کیس فائلز لے آیا تھا۔ وہ ایک بڑا سا بکس تھا جو اس کے کمرے کے فرش پہ رکھا تھا۔ وہ ابا کو سلام اور شب بخیر ایک ہی سانس میں کہہ کر آئی، دروازہ مقفل کیا، پرس پرے پھینکا، پھر الماری کھولی۔ نچلے خانے سے ایک چھوٹا ڈبا نکالا جس میں سے اخبار کے تراشے اس صبح نکل کر باہر جاگرے تھے جب فارس بری ہوا تھا۔ وہ صبح جب سب کچھ بدل گیا تھا۔ ڈبا اس نے بڑے باکس کے قریب اوندھا کر دیا۔ کاغذ، تراشے، نوٹس کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر اس نے باکس کو بھی الٹا دیا۔ جھک کر جوتوں کے اسٹریپ کھول کر انہیں پرے اچھالا۔ گھنگھریالے بالوں کا گول مول جوڑا بنا کر وہ نیچے بیٹھ گئی۔ جلدی جلدی ان چیزوں کو الٹ پلٹ کرتی وہ کچھ تلاش کر رہی تھی۔ ابرو بھنچے ہوئے، لب سختی سے پیوست، آنکھوں میں غصہ۔ پھر ڈھیر تلے سے اس نے ایک تصویر نکالی، پھر دوبارہ ہاتھ مارا۔

"یہ رہی دوسری تصویر۔" ضبط بھری سانس لی، تصاویر لے کر اٹھی۔ ننگے پاؤں چلتی دیوار تک گئی جہاں اونچا اور چوڑا سا گرین بورڈ آویزاں تھا۔

زمر نے ایک پن اتاری اور پہلی تصویر وہاں سامنے لگائی۔ پھر دوسری بھی، قدرے پیچھے ہٹ کر تندی سے ان کو دیکھا۔

زرتاشہ غازی اور وارث غازی۔

یہ اس کا بورڈ تھا اور ابھی اسے یہ بھرنا تھا۔

وہ واپس پلٹ آئی۔ نیچے ڈھیر لگی چیزوں کو اٹھا کر اسٹڈی ٹیبل پہ رکھا۔ ترتیب سے، سلیقے سے۔ اندر الٹا ابال کچھ کم ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔ مگر پہلے حجت تمام کرنی تھی۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا تھا کہ ہاں واقعی ہر راستہ بند ہونے کے بعد میں نے یہ قدم اٹھایا۔ انصاف کے دروازے بند ہوئے تو میں انتقام کی طرف آئی۔

وہ سپاٹ سنجیدہ چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھا۔ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ پہلے صفحے کی پیشانی پر درج تھا۔

"سرکار بنام فارس غازی"

زمر کی نگاہیں لفظ لفظ عبور کرتی گئیں۔ کھڑکی کے باہر رات گہری تھی اور ہر گزرتا پل اس کو مزید اندھیرا کرتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تاریکی کی انتہا کو پہنچ گئی اتنی سیاہ، اتنی سیاہ کہ جیسے ساری روشنیاں دم توڑ گئی ہوں۔

اور پھر پو پھٹ گئی۔ صبح کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ روشنی کو جیسے کوئی روزن مل گیا۔ وہ پھیلتی گئی، قطرہ قطرہ، کرن کرن اور پھر روشنی بھی خوب تیز ہو کر پرانی ہوتی گئی۔

سفید ٹی شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس سعدی نے جب زمر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو سورج سوا نیزے پہ تھا۔ اتوار کی سست صبح آج بھی سست تھی۔ اس کو پچھلے اتوار کی صبح یاد آئی، جب زمر اس کے ریسٹورنٹ آئی تھی اور اس سے گردے کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وہ اداسی سے مسکرایا، پھر سر جھٹکا۔ دروازہ دوبارہ بجایا کوئی جواب نہیں۔

سعدی نے آہستہ سے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر واضح ہوا۔ فرش پر بے شمار کاغذ بکھرے ہوئے تھے، تصاویر، فوٹو اسٹیٹ۔ وہ آہستگی سے چلتا اندر آیا۔ تعجب سے سر اٹھا کر دیوار کو دیکھا۔

بورڈ بھرا ہوا تھا۔ اوپر وارث اور زرتاشہ کی تصاویر اور ان کے آگے پیچھے، اوپر نیچے بے شمار تراشے کاغذات اور sticky notes چسپاں تھے۔ سرکار بنام فارس غازی سے متعلقہ شہادتیں، ثبوت، ناتمام جوابات، ناکافی گواہیاں۔ سب وہاں مختصراً" سجا تھا۔

سعدی نے گردن موڑ کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی فائلز بکھری تھیں اور ایک کھلی فائل پہ سر رکھے وہ سو رہی تھی۔ آنکھیں بند، ناک کی لونگ چمکتی

ہوئی، اور ڈھیلا جوڑا کھل کر بکھر چکا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا، پھر قریب آیا۔ میز کے کنارے ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"پھپھو!" سعدی نے نرمی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ میں آپ کا سر دبا دوں؟"

"ہوں" کہہ کر سر اٹھانے لگی تو وہ سیدھا ہو گیا۔ بند آنکھوں سے چہرے سے بال ہٹاتی سیدھی ہو بیٹھی۔ لٹیں کان کے پیچھے اڑسیں۔ آنکھوں کو پوروں سے مسلا۔ پھر چہرہ موڑ کر گلابی خوابیدہ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائی۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی۔ مجھے رات کو لگا تھا آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ کچھ پریشان لگ رہی تھیں۔" ذہن کے پردے پہ جواہرات سے بات کرتی زمر ابھری۔ پھر ایک فکر مند نگاہ بکھرے کاغذوں پہ ڈالی۔

"آپ کیا کر رہی ہیں زمر؟"

"اوہ یہ!" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "یہ پراسیکیوٹر بصیرت نے بھجوائے ہیں۔" وہ کسل مندی سے اٹھی اور چیزیں سست روی سے سمیٹنے لگی۔

"ڈیڑھ سال پہلے میں بھی یہی کر رہا تھا۔ مگر آپ کو یہاں کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" خلاف توقع زمر نے سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔ سعدی اک دم چپ سا ہو کر اسی کو دیکھنے لگا۔

"واقعی یہ کیس مردہ ہے۔ کوئی بھی چیز یہ ثابت نہیں کرتی کہ فارس گلٹی ہے۔" وہ اب فائل میں صفحے ترتیب سے لگا رہی تھی۔

"سوائے آپ کی گواہی کے۔ مطلب ..." وہ احتیاط سے ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا۔ "مطلب جو آپ نے کورٹ میں کہا ... یعنی کہ ... فائرنگ سے پہلے فارس غازی کے نمبر سے فارس غازی کی آواز میں آپ کو کال کی گئی تھی۔"

"اور تم نے ..." زمر نے پرسکون، ٹھنڈی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "اپنے وکیل کے ذریعے کورٹ میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ کال جعلی تھی کوئی سافٹ ویئر یوز کر کے فارس سے مشابہہ آواز بنائی گئی تھی۔"

"جی۔ کیونکہ وہ جعلی تھی اور اسی لیے جج نے ماموں کو رہا کر دیا۔"

"یونو سعدی، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" زمر نے سمجھنے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ "ہو سکتا ہے مجھے واقعی سیٹ اپ کیا گیا ہو۔ وہ سب جھوٹ ہو۔ میری غلط گواہی کی وجہ سے فارس (نام لینا بھی اذیت ناک تھا) نے چار سال جیل میں کاٹے۔ یہ کیس مکمل طور پہ پڑھنے کے بعد، غیر جانب داری سے، مجھے واقعی لگ رہا ہے کہ میں ہی غلط ہوں۔ مجھے نہیں پتا۔ مگر میرا نہیں خیال کہ اب میرے پاس کوئی وجہ باقی رہ گئی ہے تمہارے ماموں کو مورد الزام ٹھہرانے کی۔ اس لیے گو کہ میرا دل پوری طرح صاف نہیں ہوا، مگر میں اپنے الزامات سے پیچھے ہٹتی ہوں۔" سنجیدگی سے کہتی وہ اب فٹافٹ کمرے کی چیزیں اپنی جگہ پہ واپس لا رہی تھی۔ "اگر میں غلط ہوں اور تم سب ٹھیک ہو، اور شاید ایسا ہی ہو، تو میں ہار مانتی ہوں۔"

"میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ ہار مانیں۔" اس کو دکھ ہوا تھا۔

"گڈ! پھر تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ فارس نے جو مجھے کال کی تھی، جو تمہارے بقول جعلی آواز تھی ... واٹ ایور ... اس کی ریکارڈنگ تمہیں کہاں سے ملی؟"

"ریکارڈنگ!" سعدی کے حلق میں کچھ پھنسا۔

"ڈیڑھ سال پہلے تمہارے وکیل نے وہ ریکارڈنگ عدالت میں پیش کی تھی اور تمہارے ایکسپرٹ گواہ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس آواز کا وائس پرنٹ فارس کی آواز کے وائس پرنٹ سے مختلف ہے۔ اور اس ریکارڈنگ کا سورس تم لوگوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے، وہ تمہیں کہاں سے ملی؟" اس کی سنجیدہ، بھوری آنکھیں سعدی پہ جمی تھیں۔

سعدی نے اس کو دیکھتے ہوئے لب کھولے، پھر بند کیے۔ ذرا سا سوچا، پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں اس بنیاد پہ کہ میرا جواب مجھے مرتکب جرم ظاہر کر سکتا ہے۔"

"قانون شہادت آرٹیکل 15 کے تحت تمہیں یہ استثنیٰ حاصل نہیں ہے کیوں کہ ایسے جواب پہ تمہارے خلاف کارروائی کی جا سکتی ہے۔"

"چونکہ ہم کورٹ میں نہیں ہیں اس لیے میں جواب نہ دینے کا حق رکھتا ہوں۔"

"او کے۔" زمر گہری سانس لے کر مسکرائی، سر کو خم دیا اور باہر آ کر صداقت کو چائے کے لیے آواز دی۔ سعدی الجھا ہوا کھڑا رہا۔ پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"کیا آپ فارس غازی کو بے گناہ کہہ رہی ہیں؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میں دوبارہ اس پر الزام نہیں لگاؤں گی۔" وہ مطمئن سی کہتی راہداری میں چلتی گئی۔

سعدی نے نظریں موڑ کر بورڈ کو دیکھا جو مختلف کاغذات سے بھرا تھا۔ زمر نے کیس پڑھا، شہادتیں، ثبوت، وہ سب دیکھا جس سے وہ ہمیشہ منہ پھیر کر چلی جاتی تھی اور اسے یقین آگیا کہ فارس بے گناہ ہے۔ سیدھی سی بات تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے۔ مگر پزل کا کون سا ٹکڑا غائب تھا؟ سادہ بات میں چھپی کون سی پیچیدگی اسے الجھا رہی تھی۔

سعدی نے کئی سال اس لمحے کا انتظار کیا تھا جب پھپھو تسلیم کر لیں کہ فارس بے گناہ تھا۔

وہ لمحہ آیا اور گزر گیا، مگر وہ مطمئن کیوں نہیں تھا؟

کیا اس لیے کہ وہ کئی سال پہلے والا معصوم سعدی نہیں تھا؟ اور آج کے سعدی کا دماغ اسے بتا رہا تھا کہ زمر اتنی آسانی سے مڑنے والی ٹہنی نہیں تھی۔ پھر ...؟

وہ خود سے الجھتا باہر آگیا۔ ابھی اسے ایک جگہ اور بھی جانا تھا۔

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں

کاردار قصر پہ وہ اتوار معمول کی چستی اور گہما گہمی کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔ سعدی نے اونچی چار دیواری پہ ہارن دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈز نے دروازہ کھول دیا۔ کار مخصوص چیک پوائنٹس سے گزر کر آگے آئی ڈھلان عبور کی اور وہ رہا سامنے اونچا محل اور اس کے عقب میں، نشیب میں چھوٹی سی انیکسی۔

وہ کار اس روش پہ آگے لے گیا جو اونچے نیچے سبزے کے درمیان سے گزر کر انیکسی تک جاتی تھی۔ دفعتاً اس نے رفتار آہستہ کر دی۔ ہاشم کی عقبی بالکونی کا منظر سامنے آیا، وہ نیچے سبزے پہ کھڑا تھا۔ ٹراؤزر اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں ہنستے ہوئے جھک کر اپنے پالتو لیبر ڈار کتے کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ ساتھ بے اختیار ہنستی پرجوش سی سونیا کھڑی تھی۔ وہ دونوں مدھم آواز میں باتیں کرتے ہنستے جا رہے تھے۔

گاڑی کی آواز پہ ہاشم نے سر اٹھایا، ایک نظر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے سعدی کو دیکھا، دوسری کار کے رخ پہ ڈالی۔ (مطلب وہ انیکسی جا رہا تھا)۔ پھر مسکرا کر سیدھا ہوا، ہلکا سا ہاتھ ہلایا۔

سعدی نے جواب میں بنا مسکرائے دایاں ہاتھ اٹھایا، پیشانی کے قریب لے جا کر سر کو خم دیا، خاموش سلام (ادب پہلا قرینہ ہے دشمنی کے قرینوں میں) اور کار آگے لے گیا۔ ہاشم سرد سی مسکراہٹ سے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر سونیا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے کچھ کہہ رہی تھی ...

سعدی نے کار انیکسی کے قریب کھڑی کی۔ پیچھے دیکھے بغیر برآمدے میں آیا۔ بیل دبائی، بجلی نہیں تھی تبھی گھنٹی نہیں بجی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب ندارد۔ اس نے انتظار نہیں کیا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ فارس نے جیل کے زمانے سے اسے دے رکھی تھی۔

اندر آیا تو گھر خاموش کھڑا تھا' وہ قدرے حیران سا ایک کمرے سے دوسرے تک گیا۔ باہر فارس کی کار تو کھڑی تھی.... پھر؟

"ادھر ہوں نیچے۔" فارس کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ پھر گہری سانس لے کر بیسمنٹ کو جاتی سیڑھیوں تک آیا۔ نیچے پورے گھر کے رقبے جتنا بڑا سا کمرہ تھا۔ جس میں بڑے بڑے ستون تھے۔ اردگرد کاٹھ کباڑ' پرانا فریزر' گاڑی کا سامان وغیرہ رکھا تھا۔ ایک دیوار پر خالی ریکس تھے۔ یہاں کسی زمانے میں فارس کی پستولوں اور بندوقوں کی کلیکشن ہوتی تھی۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو سب لے گئی۔ کچھ بھی واپس نہیں کیا۔

سعدی زینے اترتا تہ خانے کے فرش تک آیا۔ اندر سفید بلب جل رہے تھے۔ پھر بھی روشنی کم لگتی تھی۔ فارس دیوار سے لگی میز کے آگے کھڑا تھا۔ سعدی کی طرف پشت تھی۔ سر جھکا کر منہ میں کچھ چباتا کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ مگر سعدی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ میز کے پیچھے موجود دیوار کو دیکھتا قدم قدم آگے آیا۔

وہاں کوئی بورڈ وغیرہ نہ تھا۔ دیوار پہ ہی تصاویر' کاغذات' کٹنگز وغیرہ چسپاں تھیں۔ اوپر نیچے' دائیں بائیں' یہ زمر کی دیوار سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ سعدی کے ابرو فکر مندی سے اکٹھے ہوئے۔ ذرا خفگی سے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔

"تو آپ دو ہفتے سے یہ کر رہے تھے؟"

"کوئی اعتراض؟" وہ پیالے میں رکھی سونف کے دانے اٹھا کر منہ میں رکھتا مڑے بنا بولا۔ ابھی تک سعدی کو نہیں دیکھا تھا۔

"مگر آپ کر کیا رہے ہیں؟" وہ اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا' آنکھیں سکیڑ کر اس کا داہنا رخ دیکھا۔ چھوٹے کٹے بال اور سنجیدگی سے سکڑی سنہری زرد آنکھیں' جواب دیوار پہ جمی تھیں۔

"جو ساری زندگی کیا ہے۔ تفتیش۔" وہ سرخ مارکر لے کر دیوار تک گیا۔ ایک کٹنگ چسپاں کی' اور مارکر سے اوپر سوالیہ نشان بنایا۔ پھر واپس مڑ کر سعدی کو سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

"تم کیسے آئے؟"

مگر وہ اب گردن موڑ کر میز کے کنارے پہ رکھے بیگ کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں اس کی تازہ تازہ منگوائی گئی گنز تھیں اور گولیاں۔ اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سعدی کو غصہ آنے لگا۔ وہ اس کی بے گناہی کے ثبوت دیتا تھک گیا' اور ادھر آ کر کوئی یہ سب دیکھ لے تو....؟

"کیا یہ آپ کے نام پہ لائسنس شدہ ہیں؟" ناپسندیدگی سے گنز کو دیکھ کر اس نے مشکوک نظروں سے فارس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔ اگر گرفتار کرنا ہے تو کر لو۔" تلخی سے کہتا وہ میز تک واپس آیا' اور کاغذات اٹھا کر دوسری طرف رکھنے لگا۔ سعدی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"ڈیڑھ سال پہلے میں یہی کر رہا تھا۔ مگر یہ تفتیش آپ کو کہیں نہیں لے کر جائے گی۔ اس کے آگے بند گلی ہے۔"

"تو پھر تم مجھے سکھا دو کہ تفتیش کیسے کرتے ہیں' میں ساری کلاسز اٹینڈ کروں گا۔" ناک سے مکھی اڑاتا وہ اثر لیے بنا بولا۔ سعدی اف کر کے رہ گیا۔ پھر گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

"اگر آپ کو پتا چل بھی گیا کہ یہ سب کس نے کیا ہے' تو آپ نے یہ اسلحہ اس لیے لیا ہے نا تاکہ اس کو جا کر گولی مار دیں۔"

"تم خون کے بدلے خون پر یقین نہیں رکھتے؟"

"بالکل رکھتا ہوں مگر انتقام لینے کے بھی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ اس کو ماریں گے کل کو اس کے خاندان والے کسی اور کو ماریں گے اور یہ سائیکل آف ریوینج (انتقام کا چکر) کبھی نہیں ختم ہو گا۔" اس نے فکر مندی سے سمجھاتے ہوئے آہستہ سے فارس کی کہنی تھامی۔

"ماموں! ہم ان کو سزا ضرور دلوائیں گے مگر قانونی طریقے سے۔ اس طرح نہیں۔"

فارس تیکھی آنکھیں کر کے اسے دیکھتا رہا۔

"اور اس "ان" میں کون کون شامل ہے' وضاحت کرو گے؟"

سعدی نے کہنی چھوڑی' پیچھے ہوا' تھوک نگلا۔ ذرا سے شانے اچکائے۔ "مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں جو تمہیں پتا ہے' وہ کیسے پتا ہے؟"

سعدی نے ٹھہر ٹھہر کر' نظر ملائے بنا' دیوار کو دیکھتے ہوئے جواباً" کہا۔

"میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں اس بنیاد پہ کہ میرا جواب مجھے مرتکب جرم ثابت ہو سکتا ہے۔"

"اوہ کم آن' تمہیں یہ استثنیٰ....."

"قانون شہادت آرٹیکل 15 کے تحت حاصل نہیں ہے' وغیرہ وغیرہ مجھے پتا ہے۔" وہ مسکرایا۔ فارس نے واقعی ابرو اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھا۔ سعدی نے کندھے اچکائے۔ "زمر پھپھو کا بھتیجا ہوں آخر! اتنا قانون تو مجھے بھی آتا ہے۔"

فارس کے تاثرات قدرے پتھرا گئے' وہ سنجیدہ سا واپس مڑ گیا۔ سعدی کی مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ "کیا ہوا؟"

"جو تمہاری پھپھو نے میرے ساتھ کیا' وہ میں نہیں بھولا' اس لیے بہتر ہے ہم اس طرف نہ جائیں۔ چائے پیو گے؟"

سعدی کا دل بری طرح دکھا' مگر اس نے لب کھول کر بند کر لیے۔ پھر سر ہلایا۔ "جی پیوں گا۔" اور کرسی کھینچنے لگا۔

"اوپر کچن میں سارا سامان رکھا ہے' بنا لو۔ دو کپ۔ میرے میں چینی نہ ہو۔"

وہ جو بیٹھنے لگا تھا' رکا' ناراضی سے اسے دیکھا اور "بہت اچھا" کہہ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ فارس بدستور گردن جھکائے کاغذات کھنگال رہا تھا۔

انیکسی کا کچن لاؤنج سے ملحقہ تھا۔ بالکل اوپن۔ اس نے سامان ڈھونڈا۔ چولہا جلایا۔ پانی میں پتی گویا جھونکی۔ پھر کھڑکی کو دیکھا۔ اس پہ کوئی پردہ وغیرہ نہ تھا' کھڑکیوں کے شیشے پہ گفٹ پیپر لگا کر بھونڈی سی بچت کی گئی تھی' اور یہ تو سب کو پتا تھا کہ زرتاشہ ایک انتہائی پھوہڑ لڑکی تھی۔

سعدی نے کھڑکی کھولی تو سامنے اونچے قصر کا عقبی حصہ نمایاں ہوا۔ ہاشم بال کتے کی طرف اچھالتا' وہ اسے منہ میں تیچ کر کے سونیا کی طرف بھاگتا۔ سونیا ہنس ہنس کے دوہری ہو رہی تھی۔

سعدی کے چہرے پہ زخمی سا تاثر آیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ زور سے ٹھک۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا' ہاشم کی فائلز وہ لے کر بھی بے بسی سے بیٹھا تھا۔ اسے جلد از جلد ثبوت اکٹھے کر کے ہاشم کے پاس جانا تھا ———— تاکہ زمر اور فارس کی آپس کی غلط فہمی دور ہو جائے.... ذہن میں آگے کا لائحہ عمل ترتیب دیتا' وہ چائے بنا کر نیچے لایا تو فارس اپنی بھری دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ نچلا لب دانت سے دبائے' آنکھیں سکیڑ کر' کچھ سوچتا۔

"یہ آدمی!" اس نے الیاس فاطمی کی تصویر پہ انگلی سے دستک دی۔ "یہ وارث کا باس تھا' اور اس نے وارث سے استعفیٰ مانگا تھا۔ ہر بند گلی کا سرا اس شخص تک جاتا ہے۔ یہ یقیناً" کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔" اس نے تائیدی نظروں سے سعدی کو دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے' اور کپ فارس کی طرف بڑھا دیا۔

فارس نے گھونٹ بھرا' پھر بدمزگی سے اسے دیکھا۔

"اس میں چینی ہے۔"

"اوہ میں بھول گیا۔ سوری۔" سعدی نے معصومیت سے معذرت کی' کرسی پہ بیٹھا اور اپنے کپ سے گھونٹ گھونٹ بھرنے لگا۔ فارس نے اسے گھور کر سر جھٹکا' پھر دوبارہ دیوار کو دیکھنے لگا۔ وہاں چسپاں تصویریں بلیک اینڈ وائٹ تھیں۔ پھر یکایک ان میں رنگ بھرنے لگے۔ کوئی قوس قزح چھائی اور زرد موسم میں بہار اتر آئی۔

فارس بالکل خاموش سا ان تصویروں کو دیکھتا گیا' یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے لگیں' گویا چار سال پہلے کے مناظر ابھی ان کے آس پاس پیش آ رہے ہوں....

☼ ☼ ☼

شہر ہوا میں جلتے رہنا اندیشوں کی چوکھٹ پر
رات گئے تک الجھے رہنا بے مفہوم خیالوں میں
چار سال قبل (وارث غازی قتل کے سات دن بعد)

قصر کاردار کے لونگ روم کی اونچی کھڑکیوں سے دھوپ چھن کر آرہی تھی۔ اورنگ زیب کاردار' بگڑے تاثر اور خفا آنکھوں کے ساتھ فون پہ بات کر کے ہٹے' اور موبائل پھینکنے کے انداز میں صوفے پہ اچھالا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی' ضبط کرتے ہوئے صوفے کے آگے دو تین چکروں میں ٹہلے۔ دفعتاً ہیل کی ٹک ٹک آتی سنائی دی۔ اورنگ زیب نے پلٹ کر خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

راہداری سے جواہرات چلتی آرہی تھی۔ بند گلے کا سفید لمبا گاؤن پہنے' دبلی پتلی اسمارٹ' جوان اور خوب صورت سی۔ یقیناً" ابھی کہیں سے لوٹی تھی۔ کہنی پہ ٹنگا پرس مسکراتے ہوئے میز پہ رکھا' اور قریب آئی۔

"گڈ ایوننگ!" گاؤن کے گلے پہ لگے بٹن کو دو انگلیوں سے چھیڑتی' وہ میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ اورنگزیب کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ فارس کے بھائی کے قتل کا کیا چکر ہے؟ پولیس میرے گھر کیوں آرہی ہے؟" وہ سخت نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"تمہارا مطلب ہے "تمہارے" بھانجے کے سوتیلے بھائی کا کیا چکر ہے' اور یہ کہ پولیس تمہارے گھر کی انیکسی میں کیوں آرہی ہے؟ اوہ سوری' وہ تو تم کئی سال پہلے اپنے بھانجے کو دے چکے ہو۔"

"جواہرات!" وہ بظاہر طیش سے غرائے مگر اس جارحیت میں مدافعانہ سی جھلک تھی۔

"بے فکر رہو' کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس کے بھائی کی خودکشی کو قتل قرار دے رہے ہیں' اور اس کا الزام فارس پہ لگا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ فارس قتل کے وقت پارٹی میں نہیں تھا۔۔۔" وہ نرمی سے کہتی آگے آئی' کارنر میں نصب ایکویریم تک آرکی' گردن جھکا کر اس میں جھانکا "اور ٹھیک ہے وارث کا موبائل فارس کی کار سے ملا ہے۔۔۔" دو انگلیوں سے ایکویریم کا شیشہ بجایا' مچھلیوں میں ہلچل سی مچی' جواہرات مسکرائی۔ "اور ہاں' وہ رسی جس سے وارث کے ہاتھ پیر باندھے گئے' وہ بھی اس کے پاس سے ملی ہے اور وہ تھا بھی فارس کا سوتیلا بھائی مگر۔۔۔" سیدھی ہوئی' اسٹینڈ میں رکھے جار سے خوراک کی مٹھی بھری اور پانی کے اوپر کھول دی۔ سارے دانے پانی میں گر گئے۔

"مگر اس سب سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہارے بھانجے کو گنز جمع کرنے کا شوق ہے' استعمال کرنے کا تھوڑی ہے۔ یقیناً" یہ ایک خودکشی ہوگی' ناکہ قتل۔" وہ دانہ ڈال کر' ہاتھ ٹشو سے صاف کرتی' چمکتی آنکھوں سے مسکراتی ان کے سامنے آئی۔ "ہے نا؟" اور غصے سے کھولتے اورنگ زیب اس سے پہلے کہ مزید کچھ کہتے' وہ ان کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

تیز تیز چلتی وہ راہداری میں آگے آئی تو مسکراہٹ اضطراب میں تبدیل ہو گئی۔ کنٹرول روم کے دروازے کو کھولا تو اندر موجود خاور اور ہاشم دونوں چونکے۔ وہ دروازہ بند کر کے ہاشم کے سامنے آکھڑی ہوئی اور سلگتی نظروں سے اسے گھورا۔

"تمہارے باپ کی کیمپین ڈسٹرب ہو رہی ہے اس سب سے' اور وہ خوش نہیں ہے۔"

"دیکھ چکا ہوں۔" ہاشم نے بےزاری سے دیوار پہ نصب اسکرینز میں سے ایک کی جانب اشارہ کیا' جہاں لاؤنج کے سی سی ٹی وی کیمرہ کی فوٹیج چل رہی تھی۔ بنا آواز کے ویڈیو۔ باقی اسکرینز پہ دوسرے مناظر تھے۔ (لاؤنج کے علاوہ گیٹ' لان' بیرونی برآمدہ جیسے چند مقامات پہ ہی یہ کیمرے نصب تھے۔)

"میں نہیں چاہتی کہ وہ فارس کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔ اس لیے جو کرنا ہے جلدی کرو۔"

"ہاشم سنبھال لے گا' آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔" وہ مضطرب سا یہ کہہ کر آگے آیا' اور خاور کی کرسی کے ساتھ جھک کر لیپ ٹاپ کو دیکھنے لگا' جس پہ خاور ٹھک ٹھک کام کیے جا رہا تھا۔

"آج تم سعدی اور فارس کے ساتھ پراسیکیوٹر کے پاس گئے تھے' کیا کہا اس نے؟"

"اسے فارس کی بے گناہی کا یقین ہے' کیونکہ فارس کے پاس قتل کی وجہ نہیں ہے۔"

"تو تمہیں ہاشم' اسے قتل کروانے سے پہلے وجہ ڈھونڈ کر فارس پہ یہ سب پلانٹ کرنا چاہیے تھا۔" جواہرات غرائی تھی۔ وہ طیش سے اس کی طرف مڑا۔

"میں کارپوریٹ لایر ہوں' کرائے کا قاتل نہیں اور میں نے کچھ بھی پلاننگ سے نہیں کیا تھا' آپ کو معلوم ہے یہ ایک غلطی تھی اور مجھے اس کو فکس کرنا ہے۔" رک کر اس نے غصے سے ماں کو دیکھتے ہوئے ایک دو سانسیں لیں۔ "اور یہ سب اتنے آرام سے فکس نہیں ہو گا۔ صرف فارس نہیں' خاور بھی قتل کے وقت پارٹی میں نہیں تھا۔" اسی پل دروازہ رسمی سی دستک کے ساتھ کھلا۔ ہاشم اور جواہرات کرنٹ کھا کر اس طرف گھومے۔ خاور بھی بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہ آئی ایم سوری' میں۔۔۔ انکل نے بلایا تھا تو۔۔۔"
وہ زرتاشہ تھی' چوکھٹ پہ رک کر واپس جانے لگی تھی۔ "آپ لوگ بزی ہیں' اٹس اوکے۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔" قدرے تذبذب سے معذرت کرتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ باری باری سب کے چہرے دیکھے' جو سفید پڑ گئے تھے۔

"نہیں۔۔۔ ہم بس۔۔۔ بات کر رہے تھے۔" ہاشم نے تھوک نگلا تھا' چہرے پہ زبردستی مسکراہٹ لاتا آگے آیا' مگر اڑی رنگت اور آنکھوں میں آتی پریشانی دبا نہیں پا رہا تھا۔

"سوری' میں ایسے ہی آگئی۔" وہ ذرا شرمندہ' ذرا سوچتی' الجھتی نگاہوں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آپس میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ اسے آتے اسکرینز کی فوٹیج میں نہیں دیکھا۔ اف!

"کوئی بات نہیں' ہم ایک ہی خاندان ہیں۔" جواہرات پھیکا سا مسکرائی' اپنی جگہ سے وہ ایک انچ بھی نہیں ہل پا رہی تھی۔ کہیں اس نے کچھ سن تو نہیں لیا۔

"انکل فارس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وارث بھائی کے کیس کی پیش رفت وغیرہ۔ میں یہی آپ سے پوچھنے آئی تھی۔ مجھے تو کوئی کچھ بتاتا ہی نہیں ہے۔" کہتے کہتے اس نے ترچھی نظر خاور پہ ڈالی جو بالکل دم سادھے کھڑا تھا۔

ساؤنڈ پروف دروازے کو کھولتے وقت آخری فقرہ کان میں پڑا تھا۔

"صرف فارس نہیں' خاور بھی اس وقت پارٹی میں نہیں تھا۔"

"اہم۔۔۔" ہاشم کھنکار کر گلا صاف کرتا باہر آیا' زرتاشہ بھی چوکھٹ سے ہٹ کر راہداری میں آکھڑی ہوئی۔ ہاشم نے بات شروع کرنے سے قبل ذرا احتیاط سے اسے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس برس کی خوش شکل' سیاہ آنکھوں اور اسٹیپ میں کٹے بالوں والی لڑکی تھی۔ اس وقت ابرو ذرا الجھن سے سکوڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہم سب کو پتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ اس کی گاڑی سے کچھ ملنے سے کچھ ثابت نہیں ہو جاتا زرتاشہ۔" وہ کافی سنبھل کر' اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ "رہی بات پراسیکیوٹر کی تو وہ خوامخواہ فارس پہ شک کر رہی ہے اور اس کو بار بار سوال جواب کے لیے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ پراسیکیوٹرز مر یونو! سعدی کی پھپھو۔ ابھی دوپہر کو بھی فارس وہیں تھا۔"
زرتاشہ کی الجھن مدھم ہوئی' اس کی جگہ ناگواری سی ابھری۔

"وہ فارس پہ شک کر رہی ہیں؟"

"اس نے فارس کو کہا ہے کہ وہ اسے اپنی alibi لڑکی سے ملوائے' اس کو فارس کی بے گناہی کا ثبوت چاہیے۔ اب معلوم نہیں کتنے دن وہ بے چارہ اس کے آفس کے چکر لگاتا رہے گا۔ مگر زمر کو کون سمجھائے؟"

"تو جب تک اس کو یقین نہیں آئے گا' وہ فارس کو اپنے پاس بلواتی رہے گی؟" وہ تیزی سے اسے دیکھتی

بولی۔

"اوہ کم آن۔" ہاشم نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔ "روز کے چند گھنٹے اس کے ساتھ گزار لینے سے ان کے درمیان کوئی پرانی بات پھر سے نہیں شروع ہو جائے گی' بھروسا کرو اپنے شوہر پہ۔"

اور ہاشم کے لیے الفاظ تاش کے پتے تھے۔ آگے پیچھے' الٹ پلٹ کر کے ان کو ترتیب دیا' مرضی کے سامنے لایا' مرضی کے چھپا گیا' اور مرضی کا مطلب نکال لیا۔ زر تاشہ لب بھینچے' ضبط سے واپس مڑ گئی۔ وہ فوراً" اس کے پیچھے آیا۔

"سنو' تمہیں بھی فارس پہ شک ہے؟ بے شک وہ پارٹی میں اس وقت نہیں تھا' مگر...." وہ دونوں ساتھ ساتھ راہداری میں چل رہے تھے جب ہاشم نے پتے پھر سے سجائے' مگر وہ تیزی سے اس کی طرف گھومی۔

"صرف فارس کیوں؟ خاور بھی تو پارٹی میں نہیں تھا۔ پھر پولیس صرف فارس کے پیچھے کیوں آرہی ہے؟"

اس نے جو سنا تھا' اگل دیا۔

مگر ہاشم تیار تھا اور بظاہر حیرت سے سر اثبات میں ہلایا۔

"واقعی' عجیب بات ہے' میں بھی ابھی ممی سے یہی کہہ رہا تھا کہ خاور بھی اس وقت نہیں تھا اور بھی کچھ لوگ نہیں تھے' مگر...."

"اور کون؟" اس نے اسی تیزی سے بات کاٹی۔

"یہی' ہمارے کچھ دوست' مگر میری پارٹی کوئی ایسا پیمانہ تو نہیں ہے کہ جو اس میں نہیں ہو گا' وہی قاتل ہے لہٰذا اسی پہ شک کیا جائے.... یو نو واٹ' یہ فارس پہ شک' پراسیکیوٹر کی اس سے تفتیش' یہ سب جان بوجھ کے کیا جا رہا ہے۔"

"مجھے نہیں پتا۔" وہ الجھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ہاشم کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

وہ واپس آیا تو دم سادھے کھڑی جواہرات تب تک نہیں بولی جب تک اس نے دروازہ بند کر کے لاک نہ کر دیا۔ پھر گہری سانس لے کر ان دونوں کی طرف گھومی۔

"اس نے کوئی نقصان پہنچانے والی بات نہیں سنی۔"

"میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں ہاشم!" جواہرات چیخ پڑی۔ "اس سب کو ختم کرو۔ فارس پہ سب الزام ثابت کرواؤ' اسے جیل بھجواؤ تاکہ میں سکون کی نیند سو سکوں۔"

"جانتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتا خاور کے لیپ ٹاپ تک آیا' اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کہاں تک پہنچا کام؟"

"ہو گیا ہے' سر۔" وہ تابع داری سے اسکرین پہ اسے کچھ دکھانے لگا۔ جواہرات سامنے کھڑی تھی' فکر مند الجھی ہوئی سی ان کو دیکھنے لگی۔

"تم لوگ کیا پلان کر رہے ہو؟"

باہر لان میں زر تاشہ سینے پہ بازو لپیٹے' سر جھکائے کسی عجیب کشمکش میں چلتی جا رہی تھی۔ دفعتاً" آوازوں پہ وہ رکی۔ گردن گھما کر دیکھا۔

لان کے کنارے مصنوعی آبشار تھی۔ وہ اس وقت بند تھی' اور اس کے اسٹیپ پہ شہرین بیٹھی تھی۔ ٹائیٹس کے ساتھ سرخ کفتان نما شرٹ پہنے' وہ چیونگم چباتی' سر جھکائے موبائل پہ بٹن دبا رہی تھی۔ زر تاشہ نے لمحے بھر کو سوچا کہ اس کی شرٹ' گردن کی مالا' کلائی کا کڑا' اور اوہ! یہ لانگ شوز.... یہ کس کس برانڈ کے ہوں گے؟ مگر پھر.... اس نے سر جھٹکا اور اس طرف آئی۔

"شہرین...." شہرین نے چونک کر سر اٹھایا' پھر آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھتے' چہرے پہ سامنے کو آئے سنہری بال پیچھے ہٹائے۔

"ہیلو زر تاشہ۔" وہ کروفر سے مسکرائی۔

"کیا تم مجھے سونی کی برتھ ڈے پارٹی کی ویڈیو دے سکتی ہو؟ مجھے اپنی کزنز کو تمہاری ساڑھی دکھانی ہے۔ ایکسٹرا کاپی ہو گی نا تمہارے پاس؟"

"شیور۔ خاور نے بہت سی سی ڈیز مجھے دی تھیں' میں میری انیجیو کے ہاتھ بھجواتی ہوں۔" تفاخرانہ شانے اچکائے۔ زر تاشہ نرمی سے تھینکس کر کے آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

چلنے ہی کو ہے اک سموم ابھی
رقص فرما ہے روح بربادی

"تم ایک تیر سے کتنے شکار کرنا چاہ رہے ہو ہاشم؟ اگر کچھ غلط ہو گیا تو؟"

"پھر سے سن لیں پلان' کچھ غلط نہیں ہو گا۔ ہم زمر پہ فائرنگ کریں گے' گن فارس کی استعمال ہو گی' ہوٹل کے جس کمرے سے گولی چلے گی وہ بھی اسی کے نام پہ ہو گا۔ گن پہ فارس کے فنگر پرنٹس بھی ملیں گے۔"

"اور اگر وہ مر گئی تو؟" جواہرات کو ہول اٹھ رہے تھے۔

"اس کو نہیں مارنا ہم نے ممی۔ وہ بظاہر فارس سے تفتیش کر رہی ہے' اس پہ شک کر رہی ہے' ایسے میں زمر کو یہ حملہ ایک مجرم کو خود کو چھپانے کا حربہ لگے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ گرفتاری کے خوف سے فارس نے یہ سب کیا ہے۔"

"اور اگر اس نے اسے فارس کے خلاف سازش سمجھا تو؟"

"اونہوں...." ہاشم پہلی دفعہ کھل کر مسکرایا اور خاور کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرایا۔ جواہرات نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

"کیا میں کچھ مس کر رہی ہوں؟"

"زمر کبھی بھی نہیں سمجھے گی کہ یہ فارس کے خلاف سازش ہے۔ وہ فارس کو ہی قصوروار سمجھے گی کیونکہ یہ بات اسے فارس خود کہے گا۔"

"او کے' اور فارس اسے یہ بات کیوں کہے گا؟" جواہرات اب ذرا اکتانے لگی تھی۔

"وہ اس طرح ممی کہ ہم فارس کی طرف سے زمر کو یہی بات کہلوائیں گے۔"

"ہرگز نہیں ہاشم۔" جواہرات نے کوفت سے سر جھٹکا۔

"زمر کو آج بھی فارس کی بے گناہی کا یقین ہے' کل بھی ہو گا۔"

"ہم اس کو فارس کی طرف سے کال کریں گے۔" کہتے ہوئے ہاشم نے خاور کی طرف اشارہ کیا۔ خاور نے لیپ ٹاپ اسکرین جواہرات کے سامنے کی۔ وہ مشتبہ نظروں سے اسے دیکھتی قریب آئی۔

"کیا تم دونوں وضاحت کرنا پسند کرو گے؟" خاور نے سر کو اثبات میں ہلایا اور اسکرین کو دیکھتے ہوئے مودب انداز میں سمجھانے لگا۔

"میں نے اس سافٹ ویر میں فارس کی تمام ریکارڈنگز ڈال دی ہیں جو میرے پاس ہیں۔ ہم پچھلے ایک ہفتے سے اس کا فون ٹیپ کر رہے تھے۔ اب دیکھیے۔" وہ چند بٹن دبا کر مزید صفحے کھولنے لگا۔ جواہرات بدستور مشکوک سی اسے دیکھے گئی۔

"میں جو بھی ٹائپ کروں گا' وہ فارس کی آواز میں ابھر کر سامنے آئے گا۔ ہم فارس کے فون سے پراسیکیوٹر کو کال کریں گے۔ اور ہمارا لکھا ہوا اسکرپٹ اس کی آواز میں پڑھا جائے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ یہ فارس ہے اور اس پہ حملہ کرنے سے پہلے اس کے سامنے اعتراف جرم کر کے اپنے ضمیر کی آخری چبھن نکال رہا ہے اور اس کو ختم کر کے آخری ثبوت بھی مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندہ بچ جائے گی' اس لیے وہ اسی کال کو فارس کے خلاف استعمال کرے گی۔"

"آف کورس' زمر کے پاس یہ ریکارڈنگ نہیں ہو گی۔ لیکن اس کو فارس کے یہ الفاظ ساری زندگی یاد رہیں گے۔ اس بنیاد پر وہ اسے جیل بھی بھجوائے گی اور وہ اس کے خلاف سب سے بڑی گواہ ہو گی۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سب سے بڑے دشمن بن جائیں گے۔"

جواہرات قدرے اچنبھے سے دونوں کے چہرے دیکھنے لگی' لب دانت سے کاٹتے ہوئے وہ کافی متفکر نظر آرہی تھی۔

"ہاشم! اگر کچھ غلط ہو گیا۔ اگر زمر ہماری چال میں

نہ آئی' اگر اس نے اس سب کو ایک سوچا سمجھا پلان سمجھا تو؟"

"تو پھر ہماری قسمت کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہو گا مگر میں اپنے خاندان کے لیے اچھی امید رکھنا چاہتا ہوں۔" وہ شانے اچکا کر سپاٹ سا نظر آنے لگا۔

جواہرات نے بدقت مسکرا کر سر ہلایا' مگر وہ ابھی بھی خوش نہیں تھی۔ آنکھوں میں شدید اضطراب تھا' پھر یکایک کسی خیال کے تحت اس نے چونک کر ہاشم کو دیکھا۔

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی' اگر فارس نے واقعی وارث کا قتل کیا ہے' اور وہ زمر کے سامنے اپنی کال میں اعتراف جرم بھی کرلے گا' تو بھی وجہ قتل کیا ہو گی؟ کم از کم اس سارے پلان میں مجھے وجہ قتل نظر نہیں آرہی۔"

ہاشم کے تاثرات قدرے سخت ہو گئے۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اور ان میں ایک عجیب سا جذبہ ہلکورے لینے لگا۔ اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا' جہاں سے ابھی ابھی زرتاشہ واپس گئی تھی اور پھر دوبارہ ماں کی طرف رخ پھیرا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں زخمی پن سا تھا۔

"وجہ قتل سامنے ہے اور میں اس کو اس سب میں فٹ کرلوں گا۔ بھروسا رکھیے۔ ہاشم ہر چیز سنبھال سکتا ہے۔" جواہرات بس اس کو دیکھ کر رہ گئی' اس نے سوچا کہ وہ ہاشم سے پوچھے کہ وہ وجہ قتل کیا بنا رہا ہے؟ لیکن پھر اس سے پوچھا نہیں گیا۔ دل پر پڑے بوجھ بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر وہاں سے آ گئی۔

باہر آئی تو اورنگ زیب لاؤنج میں بیٹھے تھے' ان کے سامنے جواہرات نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ ویسے ہی سجالی۔ اور بڑی تمکنت سے آکر بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھی' بازو صوفے کے ہتھے پر جمایا اور مسکرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

ان کے تنے تاثرات مزید تن گئے۔ قدرے مدافعانہ سی جارحیت سے وہ اس کو دیکھ کر بولے۔

"ہاشم سے کہو' جلد از جلد یہ معاملہ ختم کرے۔ میں اس وقت اس طرح کا کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا۔" جواہرات نے مسکرا کر اثبات میں خم دیا۔ کم از کم اس معاملے میں وہ دونوں متفق تھے۔

☼ ☼ ☼

رستے دیار دل کے بھی کتنے عجیب تھے
سب راہرو تھے' کوئی یہاں رہنما نہ تھا

انیکسی کے باہر شام گہری ہو رہی تھی۔ بالائی منزل کے ماسٹر بیڈ روم میں بیڈ کے کنارے بیٹھی زرتاشہ کے چہرے پہ سوچوں کا جال تھا۔ وہ ہتھیلی پہ تھوڑی گرائے انگلی پہ سامنے کی لٹ لپیٹتی' دور کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہی تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ کبھی کبھار وہ گردن موڑ کر اس طرف دیکھتی' اور پھر دوبارہ سے خلا میں دیکھنے لگتی۔ اس کا ذہن منقسم تھا۔ ہاشم سے کی گئی باتیں' زمر کا ذکر' فارس کی غیر موجودگی' سب کچھ اسے بہت الجھا رہا تھا۔ اگر خاور کا پارٹی میں موجود نہ ہونا اتنا اہم نہیں تھا تو پھر ہاشم نے بطور خاص اس بات کا ذکر کیوں کیا۔ پھر اس کو آتے دیکھ کر ان کے چہرے اتنے فق کیوں ہو گئے تھے؟ زرتاشہ کے پاس بہت سے سوال تھے' جواب ایک کا بھی نہیں تھا۔

دفعتاً" فون کی گھنٹی بجی۔ وہ بے زاری سے اٹھی اور گھوم کر سائڈ ٹیبل تک آئی۔ فارس کا موبائل بج رہا تھا' اوپر لکھا آرہا تھا "میڈم زمر"۔ زرتاشہ کے لب بھنچ گئے' آنکھوں میں عجیب سی ناگواری ابھری' چند لمحے وہ فون کو دیکھتی رہی' پھر جھپٹ کر اٹھایا۔ زور سے بٹن پریس کر کے کان سے لگایا۔

"جی فرمایئے؟"

"میں ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر یوسف بات کر رہی ہوں۔" زمر کہتے ہوئے ذرا جھجکی۔ "مجھے فارس سے بات کرنی ہے۔"

"میں فارس کی بیوی بول رہی ہوں' آپ کو فارس سے کیا بات کرنی ہے؟" زرتاشہ کا لہجہ خشک اور سرد

تھا۔ زمر لمحے بھر کے لیے چپ ہو گئی۔

"کیسی ہیں آپ زرتاشہ؟"

"فی الحال تک تو ٹھیک ہوں۔ لیکن جس طرح آپ میرے شوہر کے ساتھ بی ہیو کر رہی ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ اگلی دفعہ ہم اتنی ہی خوشگواری سے بات کر سکیں گے۔" لائن پر چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی، پھر زمر کی آواز ابھری تو اس میں گہرا تعجب تھا۔

"سوری۔ میں آپ کی بات سمجھی نہیں؟"

"حالانکہ آپ کو سمجھنا چاہیے تھا کہ میرا شوہر بے گناہ ہے۔ پھر بھی جس طرح آپ اس کیس کو پرسیو کر رہی ہیں، جس طرح آپ میرے شوہر کو بار بار مجرم ثابت کرنے پہ تلی ہیں، اس سب سے مجھے یہی لگتا ہے کہ آپ اس سے کوئی پرانا بدلہ اتار رہی ہیں۔ آخر میرے شوہر نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟" وہ بمشکل غصہ ضبط کر کے کہے جا رہی تھی۔ اتنے دنوں کا اندر ابلتا لاوا کسی نہ کسی طرح پھٹنا ہی تھا۔ دوسری جانب زمر اچنبھے اور حیرت سے فون کو دیکھ کر رہ گئی، پھر اس کے تاثرات بھی سخت ہو گئے، آواز سپاٹ ہو گئی۔

"میں بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہی آپ کس طرف اشارہ کر رہی ہیں، میں صرف اور صرف فارس اور سعدی کی مدد کرنا چاہ رہی تھی، بہر حال جب فارس مجھ سے بات کرنے کے لیے فارغ ہو جائیں تو انہیں بتا دیجیے گا کہ انہوں نے کل مجھے اپنی ایلی بائی سے ملوانا ہے۔ اور ہاں ان سے کہیے گا کہ اگلی کال وہ ہی مجھے کریں گے، کیونکہ میرے پاس فی الحال کرنے کو اور بہت سے کام پڑے ہیں" کھٹ سے فون بند ہو گیا۔

زرتاشہ طیش سے فون کو دیکھ کر رہ گئی، پھر زور سے واپس پھینکا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا تو وہ چونک کر مڑی، فارس باہر نکل رہا تھا، تولیے سے گیلے بال رگڑتا اس کی آنکھوں اور چہرے پہ شدید اضطراب سا تھا۔ یقیناً اس نے یہ گفتگو نہیں سنی تھی، وہ قریب آیا تو زرتاشہ نے بمشکل چہرے کے تاثرات نارمل کیے، ہلکا سا مسکرائی۔

"میڈم پراسیکیوٹر کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ انہیں کال بیک کر لیں۔" فارس نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھیں سکیڑ کر اس کے تاثرات پہ غور کیا۔

"اور کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کچھ خاص نہیں" وہ گھوم کر بیڈ کے دوسری طرف چلی گئی۔ ڈریسنگ مرر کے سامنے بیٹھی، اور برش اٹھا کر بالوں میں اوپر سے نیچے پھیرنے لگی۔ البتہ چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ فارس جیسے آدمی کو دھوکا دینا کم از کم زرتاشہ کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ رخ پھیر کر بیٹھی آئینے میں اس کو دیکھتی رہی۔ فارس اب فون پر نمبر ملا کر اسے کان سے لگا رہا تھا۔ پھر پلٹ کر وہ کمرے سے ملحقہ بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ زرتاشہ کی سماعتیں وہیں لگی تھیں۔ بالوں میں ہیئر برش پھیرتا ہاتھ رک گیا۔

"جی السلام علیکم! میڈم کیسی ہیں آپ؟ آپ کا فون آیا تھا۔" اسے فارس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہیئر برش رکھ کے دبے قدموں اٹھی اور چوکھٹ میں جا کھڑی ہوئی، فارس کی اس کی طرف پشت تھی۔

سامنے لان نظر آتا تھا اور اس کے پار ہاشم کے کمرے کی بالکونی، ہاشم کا کمرہ ہمیشہ ہی اونچائی پہ ہوتا تھا اور ان کا کمرہ نشیب میں، یہ فرق زرتاشہ کو آج پہلے سے زیادہ محسوس ہوا تھا۔

"جی شیور میم! میں کل آپ کو اس سے ملوا دوں گا۔ ٹائم اور جگہ میں آپ کو ٹیکسٹ کر دیتا ہوں۔"

"اوکے۔" فارس شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ مگر دوسری جانب سے غالباً "خشک لہجے میں کی گئی بات کاٹ دی گئی تھی، تب ہی وہ خاموش ہو گیا اور پھر فون بند کر دیا جب وہ پلٹا تو زرتاشہ کو وہیں کھڑا پایا۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے بظاہر انجان سی بن کر پوچھا، دل البتہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ فارس فون بند کرتا آگے آیا، ذرا سے کندھے اچکائے، خود بھی کچھ الجھا ہوا سا تھا۔

"کل مجھے انہیں اپنی ایلی بائی سے ملوانا ہے۔ اس کا بتا رہا تھا۔" پھر خاموش ہو گیا، جیسے اسے بھی زمر کے خشک جواب پہ پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی، یا پھر شاید اسے برا لگا تھا۔ کیا واقعی زمر اس کو مجرم سمجھ رہی تھی؟

"کیا آپ کو یہ لگتا ہے کہ ڈی اے آپ کو مجرم سمجھتی ہے؟" زرتاشہ ذرا کی ذرا احتیاط سے اس کا چہرہ دیکھتی قریب آئی، وہ جو بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا تھا چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا، چہرے کے تاثرات ذرا نرم پڑے۔ آخر وہ اس کی بیوی تھی اس کی سوچ پڑھ سکتی تھی، اس نے مبہم سا اثبات میں سر ہلایا "شاید۔"

زرتاشہ کو ذرا تقویت ملی۔ گردن اٹھا کر پہلے سے زیادہ اعتماد سے وہ قریب آئی، اس کے کندھے پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"زمر جو بھی کہے میں جانتی ہوں، آپ نے کچھ نہیں کیا اور میں جانتی ہوں کہ آپ مجرم نہیں ہیں۔ یقیناً" کوئی اس میں آپ کو پھنسا رہا ہے۔" فارس کے تاثرات کی نرمی بڑھتی گئی، اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر کو خم دیا، ایسی مسکراہٹ جس میں سوگواریت بھی تھی اور زخمی پن بھی۔

"تھینک یو زرتاشہ! تمہاری سپورٹ میرے لیے بہت معنی رکھتی ہے۔" وہ بھی جواباً" مسکرا دی، البتہ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب تھی، اس کو کیا چیز تنگ کر رہی تھی؟ ہاشم کا ایک بے معنی، بے سبب سا جملہ؟ کیا بس یہی زرتاشہ کو تنگ کر رہا تھا؟

اس نے سر جھٹکنا چاہا مگر سوچوں کو جھٹکنا اتنا آسان نہ تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں میری اینجیو کے ہاتھ بھجوائی گئی ویڈیو سی ڈی رکھی تھی، چونکہ شہرین نے بھجوائی تھی اس لیے خاور کو پتا نہیں چل سکا، اور نہ ہی ہاشم کو۔ اس نے سوچا کہ وہ کل اسے دیکھے گی۔ ہاں کل!

☆ ☆ ☆

لمحوں سے اب معاملہ کیا ہو
دل پہ اب کچھ گزر رہا بھی نہیں

جس وقت زمر نے فارس کا فون بند کیا وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی اس کے چہرے پہ عجیب سی بے زاری اور قدرے ناگواری تھی۔ موبائل پرس میں رکھتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بڑبڑائی، جیسے وہ اس سارے کھڑاگ سے تنگ آ رہی تھی، مگر سعدی.... صرف سعدی کے لیے اسے یہ سب کچھ عرصہ مزید برداشت کرنا تھا۔ پتا نہیں شادی کے بعد کیا ہو گا؟ اف....!!

مین ڈور کھول کر وہ راہداری میں آئی پھر ڈرائنگ روم کے قریب سے گزرتی وہ ٹھہری، جالی دار پردے کے پار مہمانوں کی باتیں اور چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ ذرا اوٹ میں ہو کر اس نے دیکھا، یہاں سے صرف سامنے صوفے پہ بیٹھا حماد دکھائی دے رہا تھا۔ خوش شکل سا نوجوان، جس کی آنکھوں پہ گلاسز تھے مگر اس وقت وہ قدرے غیر مطمئن سی صورت حال میں بیٹھا ہوا تھا۔ باقی اس کی والدہ کا چہرہ تو یہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا، مگر ان کی آواز وہ بہر حال سن سکتی تھی۔ وہ بڑے ابا سے کہہ رہی تھیں۔

"ہمیں بخوبی احساس ہے کہ آپ کے خاندان کی بہت قریبی وفات ہوئی ہے، لیکن آپ بھی خیال کیجیے کہ ہمارے کارڈز بٹ چکے ہیں، ہمارے سارے مہمان آ چکے ہیں، کتنے ہی لوگوں نے باہر سے آنا تھا، وہ چھٹی لے کر آئے ہیں، وہ اس سے زیادہ ٹھہر بھی نہیں سکتے، ایسے میں ہم بھی مجبور ہیں۔"

"میں بالکل سمجھ سکتا ہوں آپ کی ساری بات، میں آپ کو شادی آگے کرنے کا بھی نہیں کہہ رہا، شادی اسی دن ہو گی جو کارڈز پہ لکھا ہے، میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہم اس شادی کو قدرے سادگی سے بھی کر سکتے ہیں۔ بجائے بے حد دھوم دھام کے۔"

"ہمارا ایک ہی ایک بیٹا ہے، کیا ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اپنے تمام ارمان اس پہ پورے کر سکیں؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے اس میں سب کی خوشی شامل ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے، آپ ولیمہ پر اپنے تمام ارمان

پورے کر لیجیے گا۔ لیکن صرف اپنی طرف کے فنکشنز ہم سادگی سے سرانجام دینا چاہتے ہیں' یہ ڈیتھ ہمارے خاندان کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھی۔ میں نہیں چاہتا ہمارے کسی بھی عمل سے میری بہو اور پوتے اپ سیٹ ہوں۔" بڑے ابا بہت متانت اور بارعب لہجے میں ان کو اپنا مدعا سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوئی لاحاصل سی بحث تھی' جو زمر کو مزید بے زار کر رہی تھی۔

دفعتاً" بے حد تکلف میں بیٹھے حماد کی نظر اس پہ پڑی تو وہ بدقت مسکرایا۔ زمر بھی اتنی ہی دقت سے مسکرائی' سر کو خم دیا اور پلٹ کر اندر چلی گئی۔ حماد سے بس اس کا اتنا ہی تعلق تھا۔ بظاہر رہی پسندیدگی کی بات تو اپنے جیسی بہت سی لڑکیوں کی طرح منگنی' نکاح' شادی جیسے لائسنس کے بعد اس کو پسندیدگی کا اختیار تو مل ہی چکا تھا۔ اچھا تھا وہ اس کو پسند بھی تھا اور شادی کے حوالے سے امیدیں بھی بہت تھیں۔ لیکن وارث غازی قتل..... یہ ایک واقعہ ہر چیز بدل رہا تھا۔

کمرے میں آکر اس نے موبائل کھولا' فارس کی ابھی ابھی اٹینڈ کی ہوئی کال کا ریکارڈ دیکھا۔ زرتاشہ کی باتیں ذہن میں دوبارہ سے گونجیں' چہرے پہ آئی ہوئی تلخی مزید بڑھ گئی۔ بے دلی سے اس نے فون پرے رکھ دیا۔ تبھی وہ دوبارہ سے بجا۔ زمر نے کال اٹھالی' یہ آفس سے تھی۔

"اچھا..... ہوں..... ٹھیک ہے میں سمجھ گئی' مجھے معلوم ہے کہ وارث غازی کا باس اس طرح اپنی کلاسیفائڈ فائلز نہیں دے گا۔ کل پیشی کی تیاری کرو۔ ہم کورٹ سے آرڈر لیں گے ان کی فائلز کو کھلوانے کے لیے' آخر ہم نے ان کو بھی تو شامل تفتیش رکھنا ہے' اگر فارس غازی ٹھیک کہہ رہا ہے کہ اس مرڈر کا تعلق اس کیس سے ہے' جس کی تفتیش مقتول کر رہا تھا تو ہمیں کورٹ سے آرڈر لازمی لینا ہے۔ سمجھ گئے؟ اوکے!" فون بند کرکے زمر نے پہلے سے زیادہ بے دلی سے اسے بیڈ پہ پھینکا' اور کنپٹی دونوں انگلیوں سے مسلتی' سر ہاتھوں میں گرا کر وہیں بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

یہ اور بات کہ بازی اسی کے ہاتھ رہی
وگرنہ فرق تو لے دے کے ایک چال کا تھا

وہ صبح پہلے سے زیادہ تعفن زدہ تھی۔ حبس' گھٹن اور فضا میں چھائی عجیب سی سڑاند۔ ایسے جیسے دور کہیں زیر زمین کوئی چیز جل رہی ہو' بھن رہی ہو۔ کوئی نادیدہ شے۔

آفس سے نکلتے ہوئے زمر نے کار کی طرف جاتے ہوئے موبائل دیکھا' فارس نے صبح اسے ہوٹل کا نام ایس ایم ایس کردیا تھا' ساتھ ہی کال کرکے تاکید بھی کردی تھی' یہ وہ جگہ تھی جہاں اسے فارس کی ایلی بائی سے ملنا تھا۔ وقت قریب تھا' دوبارہ سے ہوٹل کا نام ذہن نشیں کرنے کے لیے اس نے میسج کھولا ہی تھا کہ موبائل بجا۔ فارس کا نمبر آرہا تھا' اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"میں فارس نکلنے ہی والی....."

"چینج آف پلان..... ہوٹل نہیں اس کے سامنے ریسٹورنٹ ہے وہاں آجائیے زمر! میں تفصیلات ایس ایم ایس کررہا ہوں۔" اور فون بند۔ زمر کے ابرو تعجب میں بھنچے' وہ فارس ہی تھا' مگر اس کا انداز کچھ عجیب سا تھا' مختلف سا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے کبھی اس طرح دوٹوک بات نہیں کی تھی' مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ زمر کی بات سنے بغیر فون کاٹ دیا ہو۔ اسے کچھ ناگوار گزرا۔ شاید کل اس کے خشک اور مختصر انداز گفتگو کی وجہ سے اس نے اس طرح بات کی ہو۔ خیر' سر جھٹک کر اس نے کار اسٹارٹ کی اور مرر میں اپنا چہرہ دیکھا۔ بھوری آنکھوں میں سنجیدگی تھی اور ناک کی لونگ چمک رہی تھی۔ گھنگھریالے بال جوڑے میں بندھے تھے۔ وہ ہر روز کی طرح آج بھی تازہ دم نظر آرہی تھی۔

ہاشم اپنے آفس میں پاور چیئر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کوٹ کرسی کی پشت پہ پھیلا تھا۔ کف موڑ رکھے تھے۔ بالکل تھکے تھکے' خون سے نچڑے چہرے کے

ساتھ وہ میز پہ کھلے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہا تھا۔ خاور سے رابطہ مسلسل جڑا تھا۔ وہ فارس اور زمر کی کال سن سکتا تھا۔ آنکھوں میں البتہ ناخوشی تھی' جب کال ختم ہوئی تو وہ آگے کو جھکا اور مائیک میں بولا۔

"یہ فارس کا لہجہ بالکل نہیں تھا۔ وہ پہچان جائے گی۔"

"سر! یہ قریب ترین ہے۔ اس سے زیادہ مشابہت ممکن نہیں' ہم آواز کاپی کرسکتے ہیں' لہجہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں ہر آواز کا ایک مختلف وائس پرنٹ ہوتا ہے۔ اسی لیے میں ان ریکارڈنگز کو دوٹوک رکھ رہا ہوں' تاکہ وہ لہجے پہ غور نہ کرسکے۔" وہ اپنے کام کا ماہر تھا' مگر ہاشم بے حد چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کروں گا خاور!" وہ سخت بدمزہ اور مضطرب ہو کر مٹھی بھینچتا واپس پیچھا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا' غصہ تھا' گلٹ تھا۔ ہاشم کے پاس اس وقت ہر چیز تھی' سوائے سکون کے۔

ہوٹل کے کمرے میں خاور کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پردہ ہٹا تھا۔ گن اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ اس نے باریک دستانے پہن رکھے تھے' جن کی انگلیوں کے پوروں کی جگہ پہ باریک پلاسٹک چپکا تھا۔ اس پلاسٹک پہ فارس کے فنگر پرنٹس تھے۔ وہ جہاں جہاں ہاتھ لگاتا' وہاں فارس کے نشان لگتے جاتے جو بعد میں پولیس تلاش کرلے گی۔ بہت احتیاط سے وہ گن کو اسٹینڈ سے فکس کر رہا تھا۔ اتنی احتیاط سے کہ اس پہ موجود فارس کے اصلی فنگر پرنٹس خراب نہ ہوں۔ (یہ گن اس نے فارس کے گھر کی بیسمنٹ سے اٹھائی تھی۔) گن سیٹ کرکے اس نے نال میں سے دیکھا' نشانہ باندھا۔ دور نیچے بنے ریسٹورنٹ کی شیشے کی دیوار سامنے تھی۔ وہاں پہ کارنر میں ایک ٹیبل دیکھا' ہر چیز پلان کے مطابق جارہی تھی۔ وہ مڑا' لیپ ٹاپ پہ چند کیز دبائیں' کال جانے لگی۔

زرتاشہ انیکسی کے برآمدے میں کرسی پہ بیٹھی اداسی سے سامنے کھڑے بلند و بالا محل کے عقب کو دیکھ رہی تھی' وہیں پہ ہاشم کی بالکونی تھی اور نیچے شہرین اپنی دو سالہ بیٹی سونیا کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتی' کسی بات پہ ہلکا سا ہنستی گھاس پہ چل رہی تھی۔

"شہرین نے ٹائٹس پہ ڈھیلی سی ڈیزائنر شرٹ پہن رکھی تھی' جس کے ایک کندھے سے آستین نیچے تک لٹکتی تھی۔ گردن میں پتھروں کی لمبی سی مالا تھی۔ سب برانڈڈ تھا اور وہ جانتی تھی کہ سب کتنا قیمتی ہوگا۔ فارس کی تین مہینے کی تنخواہ سے بھی کئی گنا زیادہ قیمتی۔ مگر نہیں' وہ چاہتا تو بہت کچھ افورڈ کرسکتا تھا' اگر وہ بلیک میں خریدی گئی سات آٹھ لاکھ کی گن خرید سکتا ہے تو اس کو پارٹی کے لیے دو لاکھ کی ساڑھی بھی دلا سکتا تھا' مگر نہیں....."

زرتاشہ یاسیت سے دیکھتی رہی' دفعتاً" دور کھڑی شہرین نے اسے دیکھا۔ سورج کی روشنی کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھیں سکیڑ کر دیکھا' پھر ہاتھ ہلایا' مسکرا کر تفاخر سے' تمسخر سے۔ زرتاشہ پھیکا سا مسکرائی اور ہاتھ ہلایا۔ شہرین آگے بڑھ گئی۔ وہ اونچائی پہ تھی' یہاں سے ڈھلان آجاتی' زرتاشہ اوپر دیکھتی رہی' وہ اوپر دیکھنے کی عادی تھی۔

پھر وہ بے دلی سے اٹھی' سامنے رکھا لیپ ٹاپ اور ویڈیو سی ڈی اٹھا کر اندر لے آئی۔ ساری ویڈیو وہ دیکھ چکی تھی۔ خاور جو عموماً" ہاشم کے آگے پیچھے' کہیں نہ کہیں نظر آجاتا تھا' ادھر درمیان میں ایک لمبے دورانیے کو غائب تھا۔ مگر غائب تو فارس بھی تھا۔ اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ خاور کو زیادہ دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ جس منظر میں زمر ہوتی' کم از کم اس میں وہ کسی اور کو نہ دیکھتی۔

تب ہی موبائل بجا۔ اس نے دیکھا۔ غیر شناسا نمبر تھا۔ برے دل سے اٹھایا۔

"جی؟"

"میں ایک ریسٹورنٹ کا ایڈریس ایس ایم ایس کر رہا ہوں' جہاں پر اس وقت آپ کے شوہر ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر صاحبہ کے ساتھ لنچ کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو خود آکر دیکھ لیں۔"

غیر شناسا آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ وہ "ہیں ہیں" کرتی رہ گئی، پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا اور پھر سمجھ آنے پر وہ تیزی سے اٹھی۔ چہرے پہ شدید قسم کا طیش غصہ اور الجھن سی بکھر گئی۔ فارس نے اس سے ملنا ہی تھا۔ یہ تو وہ جانتی تھی، لیکن کسی ریسٹورنٹ میں لنچ یہ دو الفاظ اس کو بری طرح کھب گئے تھے۔ اور وہ زرتاشہ تھی، اسے حقیقت جاننی تھی۔ اس کو اپنے دل میں موجود شک کے کیڑے کو نکالنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔

اس نے موبائل اٹھایا اور فارس کو کال ملائی۔ ایک گھنٹی بجی پھر دوسری، اس نے فون اٹھالیا۔

"ہاں زرتاشہ بولو؟"

"آپ کدھر ہیں؟" قدرے ہچکچاہٹ سے اس نے پوچھا۔ ساتھ میں اسے خود پر افسوس ہونے لگا، وہ کیسے کسی اجنبی کی کال پہ اعتبار کر سکتی تھی؟

"میں کام سے آیا ہوا ہوں باہر، کوئی کام ہے؟"

"نہیں، بس میں آپ کا پتا کرنا چاہ رہی تھی۔ آج آپ نے پراسیکیوٹر سے ملوانا تھا اس لڑکی کو، وہ سب ہو گیا خیر سے؟"

"ہاں مگر میڈم ابھی تک نہیں آئیں۔ میں اور حنین، علیشا کے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ہوٹل میں یعنی کہ....؟" اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فارس نے "بائے" کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ ایک دم کلس کر رہ گئی، پھر موبائل رکھ کر ایک نئے ارادے سے اٹھی۔

ہوٹل کے کمرے میں خاور تیار بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں گھڑی کی سوئیوں پہ تھی، اپنے ٹارگٹ کے انتظار میں وہ لمحے گن رہا تھا۔ لیپ ٹاپ پہ ہاشم سے رابطہ فی الحال خاموش تھا۔ یہ نہیں تھا کہ ہاشم دوسری جانب موجود نہیں تھا، ہاشم بس چپ تھا۔ بالکل چپ۔ وہ دونوں منتظر تھے کسی کی زندگی کی تحریر لکھنے کے لیے

....

خاور کے ہوٹل کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں علیشا قدرے مضطرب سی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے سامنے خاموش بیٹھی حنین اور مقابل مضطرب سے ٹہلتے فارس کو دیکھتی۔ اس کے اپنے چہرے پہ بھی تفکر چھایا تھا۔

"میں عدالت نہیں جاؤں گی، میں خود کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ فارس نے رک کر جیسے بہت ضبط سے اسے دیکھا۔

"کم از کم ابھی کے لیے تمہیں پراسیکیوٹر کے سامنے میری ایلی بائی مضبوط کرنی ہے کیونکہ یہ سچ ہے، میں قتل کے وقت ادھر ہی تھا۔"

"لیکن میں عدالت نہیں جاؤں گی۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔"

مگر علیشا بے چین ہو رہی تھی۔

"حنین بھی تو تھی اس رات ہمارے ساتھ۔ کیا صرف حنین گواہی نہیں دے سکتی؟" اسے کوئی چیز بہت زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

"میں سولہ سال کی لڑکی ہوں، ان کی رشتے دار ہوں میں کریڈیبل (قابل اعتماد) گواہ نہیں ہوں۔" حنین نے پہلی دفعہ گفتگو میں مداخلت کی، اور وہ بھی کافی اعتماد سے۔ فارس اور علیشا دونوں نے اسے دیکھا۔ حنین نے شانے اچکائے۔

"ایلی مک بیل، دی گڈ وائف، بوسٹن لیگل وغیرہ دیکھ کر اتنا تو پتا چل ہی جاتا ہے۔"

"وہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کہوں گی کیا؟ مجھے سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا ہے، کہیں میں تو کسی مسئلے میں نہیں پڑوں گی؟" علیشا اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ "کیونکہ اگر میں کسی مسئلے میں پڑی تو میں آپ کو ابھی سے بتا رہی ہوں میں اس سب سے نکل جاؤں گی۔"

"کم از کم آج کے لیے تم اس سب سے کہیں نہیں نکل رہیں۔" فارس نے کافی سختی سے اس کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ جہاں ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ پھر گہری سانس لی، سامنے صوفے پہ آ کر بیٹھا اور سمجھانے والے مگر دو ٹوک انداز میں بولا۔

"یہ نیٹ جیو والی کہانی پراسیکیوٹر کو مت سنانا، تم بس ایک ٹورسٹ کے طور پر یہاں آئی ہو اپنی دوست سے ملنے، بات ختم۔ سمجھ آئی؟"

علیشا کے چہرے پر ندامت سی پھیل گئی، مگر اس نے سر ہلا دیا۔ "اوکے۔"

فارس بے چینی سے اٹھ کر آگے پیچھے ٹہلنے لگا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ حنین نے اس کی کیفیت دیکھ کر کہا۔

"آپ پھپھو... کو کال کر لیں۔" فارس نے سر ہلا کر فون نکالا، کال ملا کر کان سے لگایا۔ گھنٹی جانے لگی۔

ملحقہ کمرے میں موجود خاور کے لیپ ٹاپ پہ سگنل آنے لگا۔ فارس کے نمبر سے کال جا رہی تھی۔ اس نے چند کیز دبائیں، کال کا رستہ کاٹا اور فارس کو فون بند ہونے کا پیغام ملنے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔

"یقیناً وہ آ رہی ہوں گی۔" حنین نے خاموشی سے سر کو خم دیا، وہ اس کارروائی میں فارس کا ساتھ ضرور دے رہی تھی، البتہ وہ خوش نہیں تھی۔ اسے زمر کا فارس کے اوپر شک کرنا، علیشا کا اس سارے معاملے میں گھسیٹے جانا، سعدی کی بے چینی، ہر چیز ناخوش کر رہی تھی۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر زمر صرف اس کی بات کا اعتبار کر لیتی، مگر اس نے صاف بے رخی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کیس میں کسی کی رشتہ دار نہیں ہے۔ حنین نے یہ سب یاد کر کے ناگواری سے سر جھٹکا۔ آنکھیں ابھی تک سرخ، متورم تھیں، پہلے وارث ماموں کا غم، اور اس کے بعد شروع ہونے والا یہ عجیب سا پولیس، کچہری، قانون کا چکر....

☼ ☼ ☼

مرحلے اور بھی تھے جاں سے گزرنے کے لیے
کربلا کس نے پس کرب و بلا بھیجی ہے

زمر نے کار ریسٹورنٹ کے باہر روکی، موبائل اور پرس اٹھا کر باہر نکلی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ دروازے کے قریب میز پر ریزروڈ لکھا، یہاں سے بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ کا گلاس ڈور کھول کر اندر آئی۔ ویٹر سے اس میز کے متعلق پوچھا، یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اسی کے نام ریزروڈ ہے، وہ وہاں بیٹھ گئی۔ پھر گھڑی دیکھی، وہاں ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے کافی آرڈر کی۔ اور پھر انگلیاں آپس میں مسلتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔

کیا وہ واقعی ٹھیک کر رہی تھی؟ کیا واقعی اسے فارس کے ایلی بائی سے ملنے یہاں تک آنا چاہیے تھا؟ اصولاً تو فارس کو چاہیے تھا کہ وہ اس لڑکی کو اس سے ملوانے لے کر آتا۔ لیکن کوئی بات نہیں، وہ اپنی حجت تمام کر لے۔ وہ سعدی کو دکھا دے کہ وہ واقعی اس کے ماموں کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ لیکن کیا یہ سب دکھانے کا کوئی فائدہ ہو گا؟ کیا واقعی اس کے اوپر سے خود غرضی کا لیبل اترے گا؟

ان تمام سوچوں سے سر جھٹک کر زمر نے اپنی توجہ ویٹر کی طرف مبذول کی، جو اب کافی لا کر سامنے رکھ رہا تھا۔ جب تک اس نے کپ اٹھایا، سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ زمر نے چونک کر ادھر دیکھا۔ وہ زرتاشہ تھی سیاہ لباس پہ سرمئی دوپٹہ گردن میں لپیٹے وہ خاموش نظروں سے دیکھتی قریب آئی، کرسی کھینچی، سامنے بیٹھی، کہنیاں میز پہ رکھیں، ہتھیلی پہ تھوڑی ٹکائی، کافی کینہ توز نظروں سے زمر کو دیکھنے لگی۔ زمر قدرے غیر مطمئن انداز میں کرسی کے کنارے پہ آگے ہوئی، سر کے خم سے سلام کیا اور پوچھا۔

"فارس کہاں ہے؟"

زرتاشہ نے ہلکے سے شانے اچکائے اور زمر کو بدستور بنا پلک جھپکے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کیا آپ نے ابھی ان کے ساتھ لنچ نہیں کیا؟"

"لنچ؟ میں تو کافی دیر سے ان کا انتظار کر رہی ہوں، انہوں نے مجھے یہاں بلایا تھا، مجھے کسی سے ملوانا تھا۔"

"لیکن مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا، آخر کس سے ملوانا تھا ان کو؟"

"اپنی ایلی بائی سے، قتل کے وقت وہ جس کے ساتھ تھے۔" زمر کو اب کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ مگر نہ وہ اپنے

محسوسات سمجھ پارہی تھی نہ زرتاشہ کا رویہ، جو عجیب نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کے لیے کچھ آرڈر کروں؟" زمر نے کہتے ہوئے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو زرتاشہ نے اس پر سے نگاہ ہٹائے بغیر محض جوس کا آرڈر دیا۔ وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ زمر نے دوبارہ گھڑی دیکھی اور پھر موبائل کو۔ آخر فارس کہاں رہ گیا؟ اور آخر اس نے اپنی بیوی کو یہاں پہ کیوں بلالیا؟ اس کے دل میں تو کوئی گلٹ نہیں تھا، وہ تو اس کا پرانا اسٹوڈنٹ تھا اور کچھ بھی نہیں۔ اور ہاں وہ سعدی کا ماموں بھی تھا۔ مگر پھر بھی زرتاشہ کا انداز کچھ عجیب سا تھا، جیسے وہ کوئی "دوسری" عورت ہو۔

دوسری جانب زرتاشہ مسلسل اسے دیکھے جارہی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی لاوا سا پک رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ فون زمر نے ہی اسے کروایا تھا۔ فارس پہ شک، اور باقی سب، وہ صرف فارس کی توجہ کے لیے اس کا گھر خراب کرنے کے لیے کر رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھی، گھنگھریالے بالوں والی، کافی کا مگ گھونٹ گھونٹ پیتی لڑکی بہت بری لگی۔

"آپ کی اور فارس کی منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی، یہ سچ ہے نا؟" زرتاشہ نے اچانک سے سوال کیا تھا۔ زمر کو حیرت اور شاک کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ کپ میز پہ آواز کے ساتھ رکھا۔

"زرتاشہ؟" اندر ایک ابال سا اٹھا، حیرت اور پھر غصہ۔ بمشکل وہ ضبط کرپائی۔ "آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، ایسا کچھ نہیں تھا۔"

"آپ انکار کیوں کر رہی ہیں؟ فارس نے خود اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتے تھے، لیکن کسی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔" ابرو اچکا کر وہ بولی۔ اس کے انداز میں جیلسی تھی، معصوم سی جیلسی۔

زمر بالکل سن رہ گئی۔ اندر کوئی جوار بھاٹا سا پکنے لگا، اس نے سنا تھا کہ کچھ مرد بیویوں پہ دھاک بٹھانے کو کہتے ہیں کہ خاندان کی فلاں اور فلاں لڑکی مجھ پہ مرتی تھی، یہ اور وہ۔ مگر فارس سے اس قسم کی بات کی توقع نہ تھی، اس کا دل مزید برا ہوا۔

"یہ انتہائی احمقانہ بات ہے۔ ابھی فارس آنے ہی والا ہوگا، آپ میرے سامنے یہ بات ان سے پوچھ لیجیے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری شادی تیار ہے۔ ایسے وقت میں اس قسم کی بات آپ کو کرنا اور مجھے سننا زیب نہیں دیتا۔"

وہ شدید برہمی سے بولتی رخ موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ وہ دو عورتیں غلط وقت اور غلط موقع پہ غلط موضوع چھیڑ بیٹھی تھیں۔ زرتاشہ نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

"جو آپ کہیں۔"

وقت گزرتا جارہا تھا اور فارس کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ زمر نے کوئی دسویں دفعہ گھڑی دیکھی، پھر سرد لہجے میں زرتاشہ کو دیکھے بنا بولی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ فارس وقت اور وعدے کا اتنا کچا ہے۔ اس وقت اس کو یہاں پر ہونا چاہیے تھا، مجھے اور بھی بہت سارے کام کرنے ہیں۔"

"میں نہیں جانتی وہ کدھر ہیں۔" زرتاشہ اب کے ذرا مدافعانہ انداز میں بولی۔ "مجھے تو ان فیکٹ پتا بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر آرہے ہیں۔ میں تو یہاں شاپنگ کرنے آئی تھی، آپ کو دیکھا تو ادھر آگئی۔"

وہ لمحے بھر کو رکی۔ اب اسے خیال آرہا تھا کہ اگر فارس ادھر آگیا اور اسے یہاں دیکھا تو پھر کس طرح وضاحت کرپائے گی؟ کیا پتا زمر نے یہ سب اس کو فارس کی نظروں سے گرانے کے لیے کیا ہو۔ لہجے کو ذرا دھیما کر کے اس نے بات جاری رکھی۔

"کل انہوں نے ذکر کیا تھا کہ انہیں آج آپ سے ملنا ہے، اسی لیے میرا خیال تھا کہ وہ یہیں آنے والے ہوں گے۔" زمر نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ وہ اسی طرح نظر انداز کیے دوسری جانب دیکھتی رہی۔ اس کی فضول اور احمقانہ باتوں پہ ابھی تک اسے غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ کوئی مذاق تھا تو بہت برا مذاق تھا۔

اور تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ فارس کا نمبر آرہا تھا۔

زمر نے کال اٹھائی، اور خشک لہجے میں بولی۔

"آپ کدھر ہیں فارس؟ میں آپ کا کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔" چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر آواز ابھری۔

"زمر آئی ایم سوری۔"

ہاشم نے لیپ ٹاپ پہ ابھرتے الفاظ سنے اور تھکے تھکے انداز میں سر کرسی کی پشت پہ گرادیا۔

"جی؟ آپ نہیں آرہے۔" زمر نے کہا مگر یوں لگتا تھا وہ نہیں سن رہا۔ وہ کہہ رہا تھا جو اسے کہنا تھا۔ کچھ عجیب تھا اس کے انداز میں، رک رک کر بولتا، بے تاثر سا انداز۔ مشینی آٹومیٹک۔

"میں تمہارے قریب ہی ہوں زمر! لیکن میں یہاں پر آ نہیں سکتا، یہ میری مجبوری ہے۔ مجھے تمہیں اپنی ایلی بائی سے ملوانا تھا کیونکہ صرف تم ہی ہو، جسے میرے قاتل ہونے پہ شک ہے، مگر میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے۔" زمر دھک سے رہ گئی، اس نے بے اختیار فون کو گھورا اور پھر دوبارہ کان سے لگالیا۔

"فارس مجھے بالکل سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" (اسے کب شک تھا فارس پہ؟ وہ سوال جواب تو تفتیش کا حصہ تھے، وہ کیا برا مان گیا تھا؟)

ہاشم میز کا سہارا لیے کرسی سے اٹھا اور پھر اسی کرسی کے قدموں میں اکڑوں، بے دم سا بیٹھ گیا۔ میز کی اوٹ میں، چھپ کر۔ سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا۔ مگر فارس زمر کی بات سننے کے لیے بھی نہیں رکا۔ وہ کہے جارہا تھا۔

"اور چونکہ میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وارث غازی کا قاتل میں ہی ہوں، اور میں اسے واقعی نہیں مارنا چاہتا تھا، لیکن مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ وہ میری بیوی کے ساتھ مل کر مجھے دھوکا دے رہا تھا۔" زمر کا دماغ بھک سے اڑ گیا، اس نے بے یقینی سے سامنے بیٹھی زرتاشہ کو دیکھا جس کا جوس آگیا تھا، اور وہ اسٹرا اس میں گھماتی کچھ مکس کر رہی تھی، مگن سی۔ فارس کی بات پر اس سے ذرا ذرا جلن کا شکار، مگر پھر بھی اس کے چہرے پہ ایک معصومیت تھی، بچکانہ سا انداز۔

"فارس آپ.... آپ کہاں ہیں؟" اسے لگا وہ مذاق کر رہا ہے۔

ہاشم اسی طرح، بند آنکھوں کو انگلیوں سے مسلتا، سر گھٹنوں میں دیے بیٹھا رہا۔ کرب سا کرب تھا۔

"آئی ایم سو سوری زمر! مگر میں وہاں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے۔ مجھے اپنی بیوی اور اپنے بھائی دونوں کو ختم کرنا تھا، ایسا کیے بغیر مجھے کبھی بھی سکون نہیں آئے گا اور ہر چیز صحیح جارہی تھی۔ میں سارا شک وارث کے متعلقہ کیس پہ ڈالنے میں کامیاب ہو رہا تھا مگر مجھے ایسا لگا کہ تمہیں مجھ پہ شک ہے، تو میں نے سوچا کہ میں شک کی تصدیق کرلوں۔ میں تمہیں بتادوں کہ میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے۔ تم اس کیس کی پراسیکیوٹر ہو، سوائے تمہارے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وارث غازی قتل کیس میں سب سے زیادہ بھاگ دوڑ میں کر رہا ہوں تو میں بے گناہ ہوں، سوائے تمہارے کوئی بھی مجھ پہ شک نہیں کر رہا۔ اب ایسی صورت میں جبکہ تم وارث غازی کی متعلقہ فائلز نکلوانے کے لیے کورٹ سے آرڈر لینے جارہی ہو، اگر کوئی تمہیں گولی مار دے تو سب کا شک اس متعلقہ کیس تک جائے گا، جس کی وارث تفتیش کر رہا تھا۔ فارس غازی پہ کبھی کوئی شک نہیں کرے گا اور رہی زرتاشہ تو تم اصل ٹارگٹ سمجھی جاؤ گی، اور وہ صرف کولیٹرل ڈیمج۔"

"فارس آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ فارس کیا آپ میری بات سن رہے ہیں؟" زمر نے گھبرا کر بمشکل کہنا چاہا، اس کے اردگرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔

ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ اسے میز کا اندرونی خلا نظر آرہا تھا۔ اندھیرا، گھٹن۔ اس نے پھر سے آنکھیں بند کردیں، سر مزید اندر کرلیا۔ اوپر رکھے لیپ ٹاپ سے آوازیں بدستور آرہی تھیں۔

"زمر میں تمہیں کال کر کے صرف ایک بار معذرت کرنا چاہتا ہوں، میں بالکل بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا، مگر میں مجبور ہوں مجھے معاف کردینا، لیکن تمہیں

بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا' صرف ایک گولی' دل میں۔ اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

زمر کرنٹ کھا کر کھڑی ہوئی' فون کان سے لگائے اس نے بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ زرتاشہ بھی سر اٹھا کر اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی تھی' ریسٹورنٹ تقریباً" ویران تھا۔ اس کے پار اونچی بلڈنگز تھیں' ہوٹلز تھے۔ یہیں سامنے والے ہوٹل میں تو فارس نے اسے بلایا تھا' پھر اچانک سے چینج آف پلان.... اچانک سے سب کچھ.... وہ بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اور فارس کہے جا رہا تھا۔

"میں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں یہ میری تم سے آخری گفتگو ہے' اور اس آخری گفتگو میں' میں تمہیں اپنی حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ زرتاشہ اور تمہارے مرنے کے بعد میں جانتا ہوں مجھے سکون نہیں ملے گا۔ لیکن کم از کم میں اس قانونی کارروائی سے بچ جاؤں گا۔ آئی ایم سوری زمر!"

"فارس تم کدھر ہو؟ پلیز مجھے بتاؤ؟ میں تمہاری مدد کروں گی جس طرح بھی ہوا میں تمہاری مدد کروں گی۔" زمر بے چینی سے جلدی جلدی کہے جا رہی تھی۔ حالات کی نزاکت بھانپ کر اسے جو بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ "میں تمہارا کیس لڑوں گی' تم نے جو بھی کیا اس سب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ میں کورٹ میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی' تم جو بھی مجھے کہہ رہے ہو یہ سب اٹارنی کلائنٹ پریولج کے تحت محفوظ رہے گا میں تمہاری اٹارنی ہوں فارس! میری بات سنو!

مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ اسی طرح کی باتیں کیے جا رہا تھا' بالکل کسی روبوٹ کی طرح۔ جیسے اسے زمر کی کسی بات میں دلچسپی نہ ہو۔

"اپنی جگہ سے ہلنا مت' میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم بدحواس ہو رہی ہو' مگر بالکل بھی مت ہلنا ورنہ تمہیں تکلیف ہوگی۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا' دل میں۔ باقی میری بے وفا بیوی کے لیے ہیں۔" خاور نے barrett M95 کی نال میں سے ایک آنکھ بند کیے جھانکا۔ نشانہ سیٹ کیا۔

"فارس پلیز ایسا مت کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی میں تمہارا کیس لڑوں گی۔ پلیز' میری بات سنو۔" اسے لگا وہ منت کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شاید آنسو آئے تھے۔ زرتاشہ بالکل حق دق سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے ڈی اے؟" اس نے پوچھا مگر زمر کو کچھ ہوش نہیں تھا' وہ اسی طرح کھڑی فون کان سے لگائے فارس کی منت کر رہی تھی۔

"پلیز فارس! میرے ساتھ اس طرح مت کرو' تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایک اچھے انسان ہو' تمہارے اندر اچھائی ہے۔ ہر شخص کے اندر ہوتی ہے' ہمیں صرف اس کو باہر لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں یاد ہے یہ میں نے تم سے کہا تھا۔ پلیز میں تمہاری ٹیچر رہی ہوں' میری شادی ہونے والی ہے۔" اس نے کبھی زندگی میں کسی کی اتنی منت نہیں کی تھی۔ ایسے کسی کے سامنے نہیں گڑگڑائی تھی۔ مگر وہ اس کی سن ہی نہیں رہا تھا۔

"آئی ایم سو سوری زمر! مگر مجھے ایسا کرنا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ آئی ایم سو سوری...." اور وہ اس کے ساتھ بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر اب کے زمر اس کو نہیں سن رہی تھی' وہ اسی طرح بھیگتی آنکھوں کے ساتھ مسلسل اسے کہے جا رہی تھی۔

"فارس! میں تمہاری ٹیچر رہی ہوں' میں سعدی کی پھپھو ہوں۔ میری شادی ہونے والی ہے' پلیز میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔ اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح مت کرو۔" زرتاشہ ہکا بکا سی اٹھ کھڑی ہوئی' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زمر فارس سے یہ سب کیوں کہہ رہی ہے۔

"فارس! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے' پلیز میری بات سنو' تم یاد کرو میں تمہارا ٹیچر ہوں' میں نے تمہیں پڑھایا ہے۔ میں سعدی کی پھپھو ہوں تم میرے ساتھ

ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔ تم میرے پاس آؤ' ادھر آؤ' میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔ ہم اس بارے میں بات کریں گے۔ جو بھی بات تمہیں کرنی ہے' ہم کریں گے' میں تمہارا کیس لڑوں گی' میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گی فارس! تم صرف میری بات سنو۔"

لیکن اب فارس کی طرف سے خاموشی چھاگئی تھی وہ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ سانس لینے کی آواز تک نہ تھی۔

خاور نے انگلی ٹریگر پہ رکھے' کان سے لگے ہینڈز فری میں کہا "سر' آر یو شیور آپ اگلے الفاظ سننا چاہتے ہیں؟"

میز کی اوٹ میں' زمین پہ بیٹھے ہاشم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ایک ایک لفظ۔" اس کی سختی سے میچی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "کیا تم اس کو دیکھ سکتے ہو خاور؟"

"یس سر! ابھی بیس سیکنڈ ہیں۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ میں ہیں' ڈی اے گھبرا گئی ہے' مگر وہ ایک بہادر عورت ہے' وہ بھاگے گی نہیں۔ وہ آخری سانس تک فارس کو کنوینس کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"اس کے چہرے پہ اس وقت کیا ہے خاور؟" وہ شدت سے کنپٹی مسل رہا تھا۔ سر میں عجیب درد اٹھنے لگا تھا۔

"نہ خوف' نہ پریشانی۔ صرف شاک اور بے یقینی!"

نیچے ریسٹورنٹ میں زمر کے سامنے کھڑی زرتاشہ کو اب فکر ہونے لگی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟ آپ فارس سے کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ کدھر ہے؟" مگر زمر کو اس وقت کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ وہ فوراً" زرتاشہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے بھاگ جائے' مگر دل کو ابھی بھی یقین تھا کہ فارس ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے آخری کوشش کرنی چاہی۔

"فارس پلیز تم کچھ ایسا مت کرنا جس پہ تم پچھتاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' میں تمہارا کیس بھی لڑوں گی اور میں تمہیں سپورٹ بھی کروں گی۔ پلیز فارس! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ فارس پلیز میری شادی ہونے والی ہے' میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔ اپنی بیوی کے ساتھ ایسے مت کرو۔ فارس..... فارس؟"

خاور نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک' دو' تین' چار..... ٹاک ٹاک کر.....

اور زمر نے محسوس کیا کہ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا ہے' وہ فرش پہ جالگا' مگر آواز نہیں آئی۔ زمر کو اس وقت کسی بھی چیز کی آواز نہیں آئی۔

بس یوں لگا کمر کو کچھ چیر کر نکلا ہے۔ ایک دو تین..... کوئی برچھی تھی' نس نس پہ آگ لگی تھی' کوئی عجیب سا احساس' درد بے پناہ درد۔ اس نے جھک کر میز کے کنارے کو دونوں ہاتھوں سے تھامنا چاہا۔ مگر توازن برقرار نہیں رکھ پا رہی تھی۔ زرتاشہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ زمر نے دیکھا وہ کھڑی تھی' زمر کو اب وہ اونچائی پہ لگ رہی تھی' کیونکہ وہ خود گرتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا' اس نے زرتاشہ کو گرتے دیکھا۔ وہ اوندھے منہ زمین پہ جا گری' اسے ماربل کا فرش اپنے گال سے ٹکراتا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈا فرش' سخت سے سخت دل جیسا ٹھنڈا۔ اس کے علاوہ زندگی میں ہر احساس ختم ہو چکا تھا۔ ہاں شاید کوئی اس کے آس پاس تھا' کچھ سرخ سرخ سا تھا' کوئی سرخ سی شے تھی جو اس کی کمر سے نکل کر اس کے اردگرد بکھر رہی تھی۔ سفید ماربل کے فرش پہ اس کے ہاتھوں پر' اس کے چہرے کے قریب وہ بہتی جا رہی تھی۔ وہ پانی نہیں تھا' وہ پانی سے گاڑھا تھا۔

ہاشم کے آفس میں اب خاموشی چھائی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں' شکستگی سے اٹھا' تھکا تھکا سا کرسی پہ بیٹھا' لیپ ٹاپ بند کیا اور سست روی سے انٹر کام اٹھا کر بولا۔

"حلیمہ' ایک کپ کافی لاؤ اور پھر جب تک میں باہر نہ نکلوں کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ میں کچھ وقت تنہا رہنا چاہتا ہوں۔" پھر آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

سوگ کی ایک سہ پہر' زمر یوسف کے نام! زرتاشہ غازی کے نام!

"تمہیں کسی جنت میں رہنے کا شوق تھا زرتاشہ! تمہاری یہ خواہش بھی فارس کی جگہ میں نے پوری کی!"

☆ ☆ ☆

وقت کے کتنے ہی دھاروں سے گزرنا ہے ابھی
زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنا ہے ابھی

ہر شے اندھیر تھی' پلکوں پہ بہت بوجھ تھا۔ بمشکل اس نے اس بار کو آنکھوں سے ہٹانا چاہا۔ سفید روشنیوں والی چھت تھی' اردگرد لوگ تھے۔ اپنے اوپر سفید چادر تھی' کیا یہ زندگی کا اختتام تھا' یا پھر ایک نئی زندگی کا آغاز تھا؟

بازوؤں میں سوئیاں تھیں' اور اس سے زیادہ چبھتا ہوا احساس دل میں تھا۔ زمر نے دو تین دفعہ پلکیں جھپکیں' کچھ دھندلے دھندلے سے وجود اپنے سرہانے کھڑے نظر آئے۔ ایک گھنگھریالے بالوں والا لڑکا تھا' ایک عورت تھی فربہی مائل' وہ رو رہی تھی اس کو جاگتے دیکھ کر روتے ہوئے وہ مسکرائی۔ زمر نے مسکرانا چاہا' کچھ کہنا چاہا۔ مگر لبوں سے بس یہی الفاظ نکلے۔ "فارس کہاں ہے؟"

گھنگھریالے بالوں والے لڑکے نے سر جھکا دیا' اس کی آنکھیں بھی شاید گلابی تھیں جیسے وہ رویا ہو' ابھی نہیں' بہت پہلے رویا ہو۔ اب اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے' وہ نرمی سے اس کے اوپر جھکا اس کے ماتھے سے بال ہلکے سے ہٹائے اور آہستہ سے بولا۔

"زمر! کیا آپ مجھے دیکھ سکتی ہیں؟" اور وہ اس کو دیکھ رہی تھی بنا پلک جھپکے۔ اس نے ہلکی سی آواز میں صرف اتنا پوچھا۔ "فارس کہاں ہے؟" کسی نے جواب نہیں دیا۔ شاید آگے پیچھے کوئی اور لوگ بھی تھے۔ ہاں اس کی بائیں طرف ایک لڑکی بھی کھڑی تھی' ماتھے پہ کٹے بال' اور گلاسز والی۔ لیکن زمر اس کو نہیں دیکھ رہی تھی' گھنگھریالے بالوں والے لڑکے کے ہوتے ہوئے وہ اس لڑکی کو کم ہی دیکھا کرتی تھی۔ وہ دوبارہ اس کے اوپر جھکا۔

"آپ ٹھیک ہو جائیں گی' بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا آپ کو کہیں تکلیف ہو رہی ہے؟ کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

اس نے ہلکا سا پوچھا' اتنا ہلکا کہ لڑکے کو سننے کے لیے کان اس کے چہرے کے قریب لے جانا پڑا۔

"فارس کہاں..... ہے؟"

پھر اندھیرا سا دوبارہ چھانے لگا' ساری دنیا کا نور چلا گیا۔ سیاہی پہ سیاہی کے پردے تھے۔ اس کا دماغ پانی پہ بہتے پر کی طرح ہلکا اور کہیں دور اڑتا گیا۔

دوبارہ آنکھ کھولی تو چہرے بدل چکے تھے' اب صرف لڑکا کھڑا تھا۔ بائیں طرف شاید کوئی اور بھی تھا' مگر بائیں طرف والوں کو وہ کم دیکھا کرتی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ کھڑے لڑکے پہ نگاہیں مرکوز کیے لب ہلائے' تو وہ پھر سے جھکا۔ اب اس کا لباس بدلا ہوا تھا' شاید وہ کوئی اور دن تھا۔

"آپ کیسی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

اس کے لب ہلکے سے پھڑپھڑائے "فارس کہاں ہے؟" لڑکے کے چہرے پہ کرب سا بکھرا' اس نے سر جھکا کر اٹھایا۔

"ان کی وائف....." وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی' اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

"ان کی وائف کو بھی گولی لگی تھی' وہ نہیں رہیں۔" وہ بمشکل بول پایا۔ شاید اس کے گلے میں کوئی چیز اٹکی تھی' پانی یا کچھ ایسا جو پانی سے بھی گاڑھا تھا۔

"زرتاشہ مر گئی؟" اس کی آنکھوں میں استعجاب ابھرا' یک ٹک وہ سعدی کو دیکھتی رہی۔ سعدی نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ایسی خبر اس کو اس موقع پہ دینا نہیں چاہتا تھا' مگر وہ پھپھو سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتا تھا۔

"فارس کہاں ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔ مگر

اندھیرے بڑھتے گئے' عجیب سے اندھیرے تھے' وہ نہ کچھ سننے دیتے نہ کچھ بولنے دیتے' پلکیں بھی اٹھانے نہیں دیتے۔ وہ دوبارہ اسی کھائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ پھر آنکھ کھلی' تو منظر بدلا ہوا تھا۔ اب کہ اس کا چہرہ بائیں طرف تھا۔ گھنگھریالے بالوں والا لڑکا نجانے کہاں تھا۔ بائیں جانب لڑکی کھڑی تھی' گلاسز والی خاموش' مگر روئی روئی آنکھوں والی۔ وہ اس کو پہچانتی تھی' جانتی تھی یا نہیں یہ اس کو ابھی نہیں معلوم تھا' اس نے انہی ویران آنکھوں سے اس کو دیکھا اور لبوں پہ صرف ایک ہی سوال تھا۔ "فارس کہاں ہے؟"

"وہ آئے تھے آپ کو دیکھنے صبح' **علیشا** بھی آئی تھی' ہم اس دن آپ کا انتظار کرتے رہے' ہمیں نہیں پتا تھا یہ سب ہو جائے گا۔" وہ بولی تو اس کی آواز مدھم تھی' اس میں ہمدردی تھی شاید کہیں پیار بھی تھا۔ زمر بس اس کو دیکھ رہی تھی۔ لڑکی قریب جھکی۔

"پھپھو آپ..." وہ رکی' ہچکچائی۔ "آپ ٹھیک ہیں؟ میں ڈاکٹر کو بلا لاؤں؟"

"فارس کہاں ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے رہا تھا۔

"ابھی شاید وہ گھر پہ ہی ہوں' وہ بہت اپ سیٹ ہیں بہت زیادہ ٹوٹ گئے ہیں۔" اور زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی' اسے سب یاد تھا' اندھیری کھائیوں میں یادداشت کی روشنی ہر شے از سر نو زندہ کرلائی تھی۔ اسے ایک ایک چیز یاد تھی' دل میں اٹھتا درد پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ اور پھر اس نے ہلکی سی نگاہ جھکائی' اسے اپنے اوپر سفید چادر پڑی دکھائی دے رہی تھی اس نے نگاہ پھر سے حنین کے چہرے پہ کی۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟" حنین خاموش رہی' اس نے نظر اٹھا کر سامنے کسی کو دیکھا' جیسے کوئی سگنل مانگا ہو۔ شاید جواب نفی میں تھا' تبھی وہ دوبارہ زمر کو دیکھنے لگی۔

"میرے گردے ضائع ہو گئے ہیں' ہے نا؟" شاید اس نے خود ہی کچھ سنا تھا' شاید نیم بے ہوشی میں اس نے کچھ سنا تھا۔

"آپ کے گردے..." وہ رکی "وہ متاثر ہوئے ہیں۔" اس سے زیادہ مہذب الفاظ اس کو نہیں ملے تھے۔ زمر کے چہرے پہ حیرت نہیں آئی' دکھ بھی نہیں ابھرا۔ شاید وہ اپنی حالت بے ہوشی میں ایسا کچھ سن چکی تھی' شاید وہ کئی دفعہ سن چکی تھی' "یقیناً" وہ جانتی تھی' وہ صرف تصدیق چاہ رہی تھی۔ اب کہ اس نے ہلکی سی گردن سیدھی کی' ہاں اتنا اسے یاد تھا کہ دوبارہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے گردن سیدھی کی تھی' اب نہ وہ دائیں تھی نہ بائیں' درمیان میں تھی معلق۔

سیاہ تارکول جیسی چادر اب کے سرکی تو وہ پلکیں بہتر طور پہ جھپک پا رہی تھی۔ فربہی مائل خاتون اس کے سرہانے اب کھڑی تھیں' اس نے ہلکا سا ہاتھ اٹھانا چاہا تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا' بہت محبت سے اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کیسی ہے؟ کیا کھانا پسند کرے گی؟ کیا اسے کہیں تکلیف ہے؟ کیا وہ ڈاکٹر کو بلائیں؟ کیا وہ اسے پانی دیں؟ وہ بس ان کو دیکھے گئی اور جب بولی تو سرگوشی میں۔

"فارس کہاں ہے؟" ندرت کی آنکھوں میں اچنبھا سا ابھرا' زمر کا اس سے ایسا کوئی تعلق تھا تو نہیں جو وہ بار بار پوچھتی' شاید زرتاشہ کی وجہ سے...

بہر حال زبردستی مسکراتے ہوئے قریب آئیں۔

"وہ گھر پہ ہے' شام کو آئے گا ادھر تمہیں دیکھنے۔ وہ بھی بہت پریشان ہے اس سب سے' بلکہ پریشانی تو ایک بہت چھوٹا لفظ ہے۔" زمر یک ٹک ان کو دیکھتی رہی۔ ہر بات ہر لفظ اسے یاد تھا اور پھر ایک دم سے وہ چونکی۔ بدقت تمام اس نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ اس نے ان چند دنوں میں.... پتا نہیں کتنے دن تھے وہ سب کے چہرے دیکھے تھے' گھنگھریالے بالوں والا لڑکا' عینک والی لڑکی' وہ فربہی مائل خاتون۔ صرف ایک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ بے حد خوف اور وحشت سے اس نے رخ ندرت کی طرف پھیرا۔

"ابا' ابا کدھر ہیں؟" ندرت کی آنکھوں سے آنسو ابلنے کو بے تاب ہو گئے۔ اسے لگا کہ وہ کوئی اور خبر سننے جا رہی ہے' کوئی ایسی خبر جس کو سننے کے بعد اس کا دل

بھی کام کرنا چھوڑ دے گا۔ اس نے کہنیوں کے بل اٹھنا چاہا' مگر نہیں اٹھ سکی۔ جسم میں درد تھا شدید درد' بے حد کرب سے اس نے دوبارہ پوچھا۔

"بتا ئیے ابا کہاں ہیں؟ جب تک آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گی' میرا دل انکار رہے گا۔" مگر ندرت خاموش تھیں' انہوں نے سر جھکا لیا پھر چہرہ موڑا شاید آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

"کیا ابا بھی مر گئے؟" اس کے لبوں سے نکلا' ندرت نے تڑپ کے رخ اس کی طرف پھیرا' آنسوؤں کو ابلنے دیا' مگر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں" وہ رکیں "وہ اب ٹھیک ہیں۔" پھر چپ ہو گئیں۔

"اب... اب سے کیا مطلب؟ انہیں کیا ہوا تھا؟" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ اٹھنا بھی چاہتی تھی مگر اٹھ نہیں سکتی تھی' اس کے چہرے پہ تڑپ تھی۔ ایسا لگتا تھا بس وہ کسی طرح سب کچھ چھوڑ کر اس کمرے سے بھاگ جائے' اس اسپتال کے کمرے سے بھاگ جائے۔ مگر وہ جیسے مفلوج سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"کدھر ہیں ابا؟" الفاظ بمشکل حلق سے نکل رہے تھے۔

"ان کو فالج کا اٹیک ہوا تھا' مگر اب وہ ٹھیک ہیں۔ وہ گھر پہ ہیں' ہم انہیں اسپتال نہیں لا سکتے' اب وہ ٹھیک ہیں زمر! تم پریشان مت ہو۔" ندرت نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو تسلی دی۔ وہ یک ٹک ان کو دیکھے گئی' بالکل خاموشی سے' جیسے ساری دنیا ختم ہو گئی ہو۔ اوپر اٹھنے کی کوشش ختم کر دی' اور سر نڈھال طریقے سے تکیے پہ گرا دیا۔

"میرے ابا مفلوج ہو گئے؟ میرے حادثے کی وجہ سے؟ میرے ابا مفلوج ہو گئے؟" اس نے ندرت سے سوال نہیں کیا تھا۔ خالی خالی نگاہوں سے چھت کو دیکھتے خود کو بتایا۔

ندرت کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔ زمر کی گردن اب سیدھی تھی' ایک دفعہ پھر وہ نہ دائیں تھی نہ بائیں۔ چند گہری سانسیں لیں' آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ اب چیزیں بہتر نظر آ رہی تھیں۔ ندرت نے آہستہ سے اس کے قریب ہو کر کہا۔

"پولیس والے کب سے چکر لگاتے رہے ہیں' باہر بھی موجود ہیں۔ انہیں تمہارا بیان لینا ہے۔" زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تیار تھی۔

"ان کو اندر بھیجیں' ایک بیان ہے جو مجھے دینا ہے۔" اس کی آواز اب بھی درد سے بھرپور اور ہلکی تھی' مگر اس کی نوعیت مختلف تھی۔ سخت' مستحکم' آگ سے بھرپور۔

☼ ☼ ☼

جو تخت و تاج کے مالک ہیں کیا وہ معتبر بھی ہیں
شر انگیزی میں ڈوبی حکمرانی کا تماشا کر

آفس کاریڈور بتیوں سے جگمگا رہا تھا۔ **علیشا** فون کان سے لگائے سبک رفتاری سے چلتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔

"ہاں حنین! تم بالکل بھی فکر مت کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' خدا بہتر کرے گا۔ میں آج ہی آؤں گی تمہاری آنٹی سے ملنے۔ اب وہ کیسی ہیں؟" کاریڈور کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے فکر مندی سے پوچھا۔ پھر دوسری طرف ملنے والا جواب سن کر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے لفٹ کی طرف آئی۔

"تم بالکل پریشان مت ہونا' میں ضرور آؤں گی۔ خدا نے چاہا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا ان کی کڈنیز مکمل طور پر فیل ہو چکی ہیں؟" لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے اس کے چہرے پہ سوگواریت اتری۔

"آئی ایم سو سوری حنین۔ چلو اوکے شام کو ملتے ہیں۔" موبائل بند کیا اور سامنے دیکھا۔ لفٹ کے دروازے کھل چکے تھے۔ وہ اندر آئی مطلوبہ فلور پہ انگلی رکھی اور گہری سانس لے کر گردن اکڑا کر خود کو جیسے کسی معرکے کے لیے تیار کیا۔ دروازے بند ہوئے لفٹ اوپر کی طرف بڑھنے لگی۔ ہر گزرتی منزل **علیشا** کا اعتماد ڈگمگا رہی تھی' اسے لگا اس کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔ اس نے رخ پھیر کر لفٹ کی دھاتی دیوار میں اپنا

عکس دیکھا، پھر سیاہ سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سرمئی آنکھوں کو سکیڑ کر تنقیدی نظروں سے دیکھا کہ کہیں وہ گھبرائی ہوئی تو نہیں لگ رہی، مگر نہیں۔ بظاہر وہ پر اعتماد لگ رہی تھی۔ سرخ شرٹ، سفید پینٹس، اور لمبی ہیل کی سینڈل میں ملبوس، کہنی پہ پرس ٹکائے وہ اندر سے جتنی ڈری سہمی تھی اتنی لگ نہیں رہی تھی۔

مطلوبہ فلور آن پہنچا تھا۔ دروازے کھلے۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ہوئی راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔ کتنے ہی آفسز کراس کیے، کتنے لوگوں کے سامنے سے گزری، بغیر نظر ملائے۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کس آفس میں جانا ہے۔ سب سے بڑا آفس سب سے آخر میں تھا، علیشا اس کے قریب بس لمحے بھر کو ٹھہری، باہر موجود سیکرٹری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے پکارا، علیشا ذرا سا مسکرائی۔

"اورنگ زیب کاردار نے مجھے بلایا ہے، میری ان سے اپائنٹمنٹ ہے۔"

اس کی بات پر سیکرٹری قدرے اچنبھے سے اپنے نوٹس کھنگالنے لگی۔ علیشا نے گردن پھیر کر بند دروازے کو دیکھا، یہاں سے وہ اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اندر آفس میں کنٹرول چیئر پر اورنگ زیب کاردار اپنی مخصوص تمکنت کے ساتھ بیٹھے تنے ابرو کے ساتھ اس نوجوان کو سن رہے تھے جو سامنے کھڑا ایک پریزنٹیشن دکھا رہا تھا۔ وہ پی کیپ پہنے لاپروا سے حلیے والا نوجوان ان کا امیج کنسلٹنٹ بھی تھا اور کیمپین منیجر بھی۔ وہ کافی متانت اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری سے بولتا ایک ایک چیز سمجھا رہا تھا۔ جسے میز کے مقابل کرسی پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ پہ کام کرتا ہاشم بہت ہی بے زاری سے سن کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

"سر بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آپ کے بھانجے پہ اپنے بھائی کے قتل کا آنے والا الزام آپ کے خلاف جائے گا لیکن....." کیمپین منیجر نے پین اٹھا کر ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا۔ ہاشم نے نگاہ پھیر کر مزید بے زاری سے اسے دیکھا۔ ہونہہ کر کے سر جھٹکا۔ اور دوبارہ سے لیپ ٹاپ پہ ٹائپ کرنے لگا، ایک تو اس کنسلٹنٹ سے اسے چڑ تھی، وہ لڑکا وہ باتیں بتانے کے پیسے لیتا تھا جو وہ اپنے باپ کو مفت میں بھی بتا سکتا تھا۔

"لیکن سر! ہم اس موقعے کو اپنے مفاد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔" اورنگ زیب کاردار کے خفا چہرے پہ شکنیں ابھریں۔

"اور وہ کیسے؟"

"آپ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ ضمنی انتخابات کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں کچھ کی پلیئرز اپنے مطلوبہ امیدواروں کے بجائے آپ کو اٹھتے دیکھ کر آپ کے خلاف استعمال ہونے والا کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے، اس لیے بجائے اس بات پر مدافعانہ انداز اختیار کرنے کے ہم اس کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں، جیسے....." جوش میں کہتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلیٹ کو اورنگ زیب صاحب کے پاس آیا اور ان کو کچھ دکھانے لگا۔ "یہ وہ بیان ہے جو آپ پریس کے سامنے دیں گے۔ جس سے ایسا لگے گا کہ آپ گو کہ اپنے بھانجے کے اس عمل سے خفا ہیں، لیکن اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کیے بغیر اس معاملے کو قانون پر چھوڑ رہے ہیں۔ آپ علی الاعلان یہ کہیں گے کہ بے شک ملزم میرا سگا بھانجا ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ واقعی مجرم ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے..... اور آپ اپنا کوئی بھی ناجائز اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں آپ کو ایک انصاف پسند شخص کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔"

اورنگ زیب نے بگڑ کر اس کو دیکھا۔ "یعنی کہ میں فارس کو اس معاملے سے نکالنے کی کوئی کوشش نہ کروں؟" کیمپین منیجر احمر شفیع مسکرایا اور چٹکی بجائی۔

"یہی تو ساری گیم ہے سر! آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس اسکینڈل پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آپ کے مخالفین کسی بھی صورت آپ کو اس اسکینڈل کو کور کرنے نہیں دیں گے، تو پھر کیا ہی اچھا ہو ہم بھی اسے کور کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ہم انہی کا داؤ انہیں پہ کھیل جائیں۔ دیکھیں....." وہ اب اپنی اس اسٹریٹجی کی مزید مین میخ سمجھانے لگا، اورنگ زیب بظاہر برے موڈ کے ساتھ لیکن توجہ سے سن رہے تھے۔ ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دوبارہ بے حد بے زاری اور تلخی سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کی بورڈ پہ ٹائپ کرنے لگا۔ اس کو جس خبر کا انتظار تھا، زمر کے بیان کا، وہ آگے نہیں دے رہی تھی۔ پانچ دن ہو چکے تھے زمر کو گولی لگے، فارس آزاد گھوم رہا تھا، بیوی کی موت کا سوگ منا رہا تھا، اور فی الحال کوئی بھی نہیں تھا جو یہ کہہ سکے کہ یہ قتل فارس نے کیا ہے۔ گو کہ ہوٹل کے کمرے سے مخبری کے بعد گن برآمد کر لی گئی تھی، مگر فارنزک رپورٹ کو اس نے ابھی روک رکھا تھا۔ فارنزک اور فنگر پرنٹ رپورٹ زمر کے بیان کے بعد آنی چاہیے۔ یہ پلان تھا، مگر زمر..... اگر زمر مر گئی..... اف..... اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک لاش کا مزید بوجھ اپنے کندھوں پر..... نہیں!

وہ سر جھٹک کر اپنی ای میل کھولنے لگا۔ خاور نے دو روز پہلے اس کو فارس کی آیلی بائی لڑکی کی تفصیلات بھیج دی تھیں۔ اس کے واہمے درست تھے۔ وہ علیشا ہی تھی۔ مگر اس نے ہاشم سے رابطے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسی سے ملنے ادھر آئی تھی، ہاشم کو معلوم تھا، اسی لیے اس نے بھی علیشا کو نہیں چھیڑا۔ وہ خود چل کر اس کے آفس آئے گی۔ کب؟ وہ منتظر تھا۔ باہر کھڑی علیشا نے سیکرٹری کو نفی میں سر ہلاتے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ ریکارڈ نہیں ہے، کیا آپ سر سے اپائنٹمنٹ لینا چاہیں گی؟" مگر علیشا نے بغیر مڑے اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا، اس نے دروازہ کھول لیا۔

سب سے پہلے ہاشم نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل سپاٹ، سرد سا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیب پہ احمر شفیع کی پریزنٹیشن دیکھتے جیسے سر اٹھایا تو وہ بھی ایک دم بالکل ٹھہر سے گئے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی اور سیکرٹری پیچھے سے آ کر اسے روکتے ہوئے سخت سست سنا رہی تھی۔ اورنگ زیب صاحب کے ساتھ جھکے کنسلٹنٹ لڑکے نے باری باری ان دونوں باپ بیٹے کے تاثرات دیکھے اور پھر سیدھا ہوا۔ سیکرٹری کو اشارہ کیا، وہ خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ علیشا دو قدم مزید اندر آئی، وہ مسلسل اورنگ زیب کاردار کو دیکھ رہی تھی، بنا پلک جھپکے، سپاٹ چہرے کے ساتھ، جیسے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہاشم ایک دم مڑا، سختی سے احمر کو دیکھا۔ "باہر جاؤ، فوراً!"

کنسلٹنٹ لڑکا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا سمجھانے لگا۔

"سر! اگر تو یہ کوئی اسکینڈل ہے تو میرا خیال ہے میرا یہاں موجود ہونا سب سے ضروری ہے۔ کیونکہ میں ہی آگے پیش آنے والی صورت حال کا تجزیہ کر سکتا ہوں اور میں ہی آپ کو بہتر طریقے سے گائیڈ کر سکتا ہوں کہ آپ کو اس سچویشن کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے؟ کیونکہ میں نے....."

ہاشم گھوم کر اس طرف آیا، باپ کے ہاتھ سے ٹیب لے کر کنسلٹنٹ کو دے مارنے کے انداز میں تھمایا، اسے کہنی سے پکڑا، کھینچ کر دروازے تک لے کے گیا اور ہکا بکا سے احمر کو باہر نکال، گویا دفعان کر کے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس مڑ کر علیشا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سخت شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔

"کیا چاہیے؟ کس لیے آئی ہو؟"

اورنگ زیب بھی اب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے اور تیکھی خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ علیشا نے نظروں کا رخ ہاشم کی طرف پھیرا۔ پھر خود کو با اعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"پیسے چاہئیں۔" ہاشم نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ گھوم کر آگے آیا اور باپ کی کرسی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں ایک سمت تھے اور ان کے مقابل

علیشا میز کے دوسری جانب کھڑی تھی۔ اپنے پرس کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑے خود کو مضبوط رکھتے ہوئے۔

"میں بہت پیسے دے چکا ہوں‘ تم ماں بیٹی کو۔ اب کیا چاہیے؟" اورنگ زیب بولے تو انداز میں حقارت تھی۔

"جس پیسے کی بات آپ کر رہے ہیں‘ میں آپ کو یاد دلاتی چلوں‘ وہ میری ماں کے اس علاج پر خرچ ہوئے تھے۔ جو ان کو آپ کی مارپیٹ کی وجہ سے کروانا پڑا۔" وہ جذبات کو قابو میں رکھے‘ ضبط سے ایک ایک حرف ادا کر رہی تھی۔ "آپ کو شاید بھول گیا ہے کہ میری ماں کو چھوڑتے وقت آپ نے اسے بری طرح مارا پیٹا تھا جس کے باعث وہ کئی ہفتے ہسپتال میں رہی تھیں‘ ان کی بیک بون متاثر ہوئی تھی۔ اور ان کے میڈیکل بلز پے کرتے کرتے ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں چھ سال پہلے تھے۔"

اورنگ زیب نے استہزائیہ انداز میں ناک سے مکھی اڑائی۔ "تم میرے خلاف کہیں پہ کچھ ثابت نہیں کر سکتیں۔"

علیشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ تو بالکل درست بات ہے۔ کیونکہ جب میں نے آپ پر سو کرنا چاہا تھا‘ تو آپ کے ماہر وکیل بیٹے نے....." ایک زخمی نظر ہاشم پہ ڈالی اور پھر اورنگ زیب کو دیکھنے لگی۔

"عدالت میں جیوری کے سامنے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نا صرف میری ماں سیڑھیوں سے اپنی غلطی کی وجہ سے گری تھی‘ بلکہ وہ دماغی توازن سے محروم عورت ہے۔ شاید اس میں سارا کمال آپ کے بیٹے کا بھی نہیں ہے‘ کیونکہ جس لا فرم نے میرا کیس Pro Bono لیا تھا‘ اگر وہ میرے وکیل کے طور پہ ایک ناتجربہ کار فرسٹ ایئر ایسوسی ایٹ کو نہ مقرر کرتے تو شاید ہم عدالت میں اتنی بری طرح سے بے عزت نہ ہوتے۔ چاہے یہ ملک ہو یا میرا ملک‘ قانون وہاں بھی آپ کا تھا‘ یہاں بھی آپ کا ہے‘ اس لیے میں لمبی بات نہیں کروں گی۔"

کہتے ہوئے وہ رکی‘ اندر سے دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے خود کو دوبارہ بہادر ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ دونوں باپ بیٹا تندہی سے اس کو گھور رہے تھے۔ دو قدم آگے آئی‘ میز کے سامنے بڑی کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھا‘ اور جی کڑا کر پھر سے بولنے لگی۔

"میں ہارورڈ جانا چاہتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ میں سارے ٹیسٹ کلیئر کر لوں گی۔ اگر مجھے صرف اتنی امید ہو کہ میری ٹیوشن فیس پے کر دی جائے گی اور چونکہ آپ میرے والد ہیں اور ناجائز ہی سہی‘ مگر میں آپ کی بیٹی ہوں‘ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ مجھے سپورٹ کریں‘ میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گی۔ مجھے کوئی جذباتی اٹیچمنٹ ہے آپ سے‘ نہ کوئی امید‘ صرف پیسے چاہئیں‘ آپ کے پاکستانی روپوں میں چند ملین کی بات ہے۔ آپ کے لیے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف چند ملین۔" اس نے رک کر موہوم سی امید سے دونوں باپ بیٹا کو دیکھا‘ پھر ایک کاغذ سامنے رکھا جس پہ اس کی تعلیم پہ اگلے چند سالوں میں خرچ آنے والی رقم کی تفصیل لکھی تھی۔

ان کے تاثرات ایک جیسے رہے۔ سخت‘ سرد۔

"اور تم یہ سب کہنے اس وقت آئی ہو جب میرا باپ الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ تمہارا خیال تھا کہ ایک اسکینڈل کے خوف سے ہم تمہیں پیسے دے دیں گے اور تم ہنسی خوشی رہو گی؟" ہاشم نے یہ کہتے ہوئے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ "تمہاری جیسی بہت سی لڑکیاں گزری ہیں جنہوں نے آکر عزت دار لوگوں پہ الزام لگائے‘ مگر یو نو واٹ علیشا‘ وہ لڑکیاں وہ عورتیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں‘ آج کسی کو وہ یاد بھی نہیں ہیں لیکن وہ مرد جن پہ انہوں نے الزام لگائے‘ چاہے سچے‘ چاہے جھوٹے‘ وہ مرد آج بھی خبروں میں ہیں۔ وہ آج بھی طاقت میں ہیں‘ آج بھی حکومت کر رہے ہیں‘ تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے علیشا‘ تم جہاں سے آئی ہو وہاں چلی جاؤ۔ کیونکہ اگر اس سے زیادہ تم ہمیں ڈسٹرب کرو گی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا پیش آؤں گا اور تم یہ بات جانتی ہو۔" اس کی مسکراہٹ اب سنگین نتائج کی دھمکی میں بدل چکی تھی۔ علیشا کی آنکھوں میں سرخ سی نمی ابھرنے لگی‘ اس کے لب کپکپائے۔

"میں آپ کی بہن ہوں۔"

"تم میرے لیے ایک ایسا مسئلہ ہو جس کو میں کبھی حل نہیں کرنا چاہوں گا۔ تم اور تمہاری ماں میرے باپ کے پیسے پہ happily everafter رہنا چاہتے ہو جبکہ ایسا نہیں ہو گا!"

"میں وہ بات ساری زندگی یاد رکھوں گی "ہمیشہ کے لیے چیونٹیاں" ..... کیس جیتنے اور مجھے خیرات کی طرح ماں کے علاج کی رقم دینے کے بعد آپ نے یہ مجھے کہا تھا‘ میں چیونٹی ہی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ چیونٹیاں کیا ہوتی ہیں مگر شاید آپ خود بھی نہیں جانتے ہاشم!" وہ تیکھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ہاشم پہلی بار استہزائیہ مسکرایا۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ تم یہاں پر ہو تو تم غلط ہو۔" یہ کہتے ہوئے ہاشم آگے آیا۔ اپنے لیپ ٹاپ پہ جھکا‘ چند بٹن دبائے اور اسکرین اس کی طرف کی۔ یہ خاور کی ای میل تھی جس میں اس نے علیشا کے ٹکٹ کی کاپی اور اس کے ہوٹل میں ٹھہرنے کے دوران دیے گئے تمام کاغذات کی کاپی اور چند ایک دوسری معلومات کے ساتھ دو روز پہلے بھیجی تھی۔ علیشا نے پہلے اسکرین کو دیکھا پھر چونک کر ہاشم کو۔

"میں تمہارے یہاں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ تم یہاں پر کسی نیٹ جیوڈا کومینٹری کے لیے نہیں آئی تھیں جیسا کہ تم نے میرے کزن اور میری بھابھی کو بتایا تھا۔ میں جانتا تھا تم یہاں پر ہمارے لیے آئی ہو‘ پیسے مانگنے یا بلیک میل کرنے‘ یا دھمکی دینے کیونکہ تم خود کو ہمارے خاندان کا حصہ سمجھتی ہو‘ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے میں تمہارا یہاں انتظار کیوں کر رہا تھا؟" وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین فولڈ کر کے سیدھا ہوا۔ دوبارہ اس کے سامنے آیا‘ قد میں اس سے کافی لمبا تھا‘ گردن جھکا کر سفید پڑتی علیشا کو تندہی سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

"اس لیے نہیں کہ مجھے تمہیں انکار کرنا تھا یا کوئی دھمکی دینی تھی۔ صرف ایک سوال تھا۔ تم نے میرے خاندان کو ٹارگٹ کیوں کیا؟ میں قطعاً" نہیں مان سکتا کہ تم بالکل اتفاق سے میرے کزن کی ایلی بائی ہو۔ تم بالکل اتفاق سے اس کی بھابھی کی دوست ہو۔ میں علیشا‘ اتفاقات پہ یقین رکھنے والا آدمی بالکل نہیں ہوں۔ اس لیے تم ابھی مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ گی کہ تم نے میری بھابھی کو دوست کیسے بنایا؟" یہ سب علیشا کی توقع سے زیادہ تھا‘ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری‘ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ مدد طلب نظروں سے پاور سیٹ پہ بیٹھے اورنگ زیب کاردار کو دیکھا جو حقارت اور رعونت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر قدرے ہراساں نظروں سے ہاشم کو۔ اس کا سارا اعتماد زائل ہو رہا تھا۔ اسے یاد تھا چند برس پہلے جب ہاشم اس کے گھر آیا تھا‘ چیک منہ پہ مارنے کسی خیرات کی طرح اور تب اس نے اسے کہا تھا۔

"تم Happily Ever After رہنا چاہتی ہو‘ ایسا نہیں ہو گا‘ تم Ants Ever After ہو (ہمیشہ چیونٹیاں ہی) تم اور تمہاری ماں ایسے ہی رہو گے۔" اور اس نے یہ بات لکھ کے رکھ لی تھی‘ اپنے کمرے میں ڈائریز پہ‘ الماری کے اندرونی دروازوں پہ‘ فوٹو البمز میں لگی تصویروں کے پیچھے‘ اپنے کی چین پہ علیشا نے یہ بات ہر جگہ پہ لکھ کے رکھ لی تھی۔ سوائے اپنے دل کے۔ اور آج یہ الفاظ اس کے سیدھے دل پہ آ کے لگے تھے۔

"حنین میری دوست ہے‘ اس سے زیادہ میں کسی چیز کی وضاحت نہیں دینا چاہتی۔" ہاشم چند لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں مستقبل میں کبھی تمہاری کوئی امید پوری کروں‘ تو ہو سکتا ہے تمہارے سچ بتانے سے میں واقعی تمہاری کوئی امید پوری کر

عکس دیکھا، پھر سیاہ سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سرمئی آنکھوں کو سکیڑ کر تنقیدی نظروں سے دیکھا کہ کہیں وہ گھبرائی ہوئی تو نہیں لگ رہی، مگر نہیں۔ بظاہر وہ پر اعتماد لگ رہی تھی۔ سرخ شرٹ، سفید پینٹس اور لمبی ہیل کی سینڈل میں ملبوس، کہنی پہ پرس ٹکائے وہ اندر سے جتنی ڈری سہمی تھی اتنی لگ نہیں رہی تھی۔

مطلوبہ فلور آن پہنچا تھا۔ دروازے کھلے۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ہوئی راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔ کتنے ہی آفسز کراس کیے، کتنے لوگوں کے سامنے سے گزری، بغیر نظر ملائے۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کس آفس میں جانا ہے۔ سب سے بڑا آفس سب سے آخر میں تھا، علیشا اس کے قریب بس لحظے بھر کو ٹھہری، باہر موجود سیکرٹری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے پکارا، علیشا ذرا سا مسکرائی۔

"اورنگ زیب کاردار نے مجھے بلایا ہے، میری ان سے اپائنٹمنٹ ہے۔"

اس کی بات پر سیکرٹری قدرے اچنبھے سے اپنے نوٹس کھنگالنے لگی۔ علیشا نے گردن پھیر کر بند دروازے کو دیکھا، یہاں سے وہ اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اندر آفس میں کنٹرول چیئر پر اورنگ زیب کاردار اپنی مخصوص تمکنت کے ساتھ بیٹھے تنے ابرو کے ساتھ اس نوجوان کو سن رہے تھے جو سامنے کھڑا ایک پریزنٹیشن دکھا رہا تھا۔ وہ پی کیپ پہنے لاپروا سے حلیے والا نوجوان ان کا امیج کنسلٹنٹ بھی تھا اور کیمپین منیجر بھی۔ وہ کافی متانت اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری سے بولتا ایک ایک چیز سمجھا رہا تھا۔ جبکہ میز کے مقابل کرسی پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ پہ کام کرتا ہاشم بہت ہی بے زاری سے سن کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

"سر بظاہر ایسا لگتا ہے کہ آپ کے بھانجے پہ اپنے بھائی کے قتل کا آنے والا الزام آپ کے خلاف جائے گا لیکن..." کیمپین منیجر نے پین اٹھا کر ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا۔ ہاشم نے نگاہ پھیر کر مزید بے زاری سے اسے دیکھا۔ ہونہہ کر کے سر جھٹکا۔ اور دوبارہ سے لیپ ٹاپ پہ ٹائپ کرنے لگا، ایک تو اس کنسلٹنٹ سے اسے چڑ تھی، وہ لڑکا وہ باتیں بتانے کے پیسے لیتا تھا جو وہ اپنے باپ کو مفت میں بھی بتا سکتا تھا۔

"لیکن سر! ہم اس موقعے کو اپنے مفاد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔" اورنگ زیب کاردار کے خفا چہرے پہ شکنیں ابھریں۔

"اور وہ کیسے؟"

"آپ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ ضمنی انتخابات کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں کچھ کی پلیئرز اپنے مطلوبہ امیدواروں کے بجائے آپ کو اٹھتے دیکھ کر آپ کے خلاف استعمال ہونے والا کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے، اس لیے بجائے اس بات پر مدافعانہ انداز اختیار کرنے کے ہم اس کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں، جیسے..." جوش میں کہتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلیٹ کو اورنگ زیب صاحب کے پاس آیا اور ان کو کچھ دکھانے لگا۔ "یہ وہ بیان ہے جو آپ پریس کے سامنے دیں گے۔ جس سے ایسا لگے گا کہ آپ گو کہ اپنے بھانجے کے اس عمل سے خفا ہیں، لیکن اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کیے بغیر اس معاملے کو قانون پر چھوڑ رہے ہیں۔ آپ علی الاعلان یہ کہیں گے کہ بے شک ملزم میرا سگا بھانجا ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ واقعی مجرم ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے... اور آپ اپنا کوئی بھی ناجائز اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں آپ کو ایک انصاف پسند شخص کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔"

اورنگ زیب نے بگڑ کر اس کو دیکھا۔ "یعنی کہ میں فارس کو اس معاملے سے نکالنے کی کوئی کوشش نہ کروں؟" کیمپین منیجر احمر شفیع مسکرایا اور چٹکی بجائی۔

"یہی تو ساری گیم ہے سر! آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس اسکینڈل پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آپ کے مخالفین کسی بھی صورت آپ کو اس

اسکینڈل کو کور کرنے نہیں دیں گے، تو پھر کیا ہی اچھا ہو ہم بھی اسے کور کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ہم انہی کا داؤ انہیں پہ کھیل جائیں۔ دیکھیں..." وہ اب اپنی اس اسٹریٹجی کی مزید مین میخ سمجھانے لگا، اورنگ زیب بظاہر برے موڈ کے ساتھ لیکن توجہ سے سن رہے تھے۔ ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دوبارہ بے حد بے زاری اور تلخی سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کی بورڈ پہ ٹائپ کرنے لگا۔ اس کو جس خبر کا انتظار تھا، زمر کے بیان کا، وہ آ کے نہیں دے رہی تھی۔ پانچ دن ہو چکے تھے زمر کو گولی لگے، فارس آزاد گھوم رہا تھا، بیوی کی موت کا سوگ منا رہا تھا، اور فی الحال کوئی بھی نہیں تھا جو یہ کہہ سکے کہ یہ قتل فارس نے کیا ہے۔ گو کہ ہوٹل کے کمرے سے مخبری کے بعد گن برآمد کر لی گئی تھی، مگر فارنزک رپورٹ کو اس نے ابھی روک رکھا تھا۔ فارنزک اور فنگر پرنٹ رپورٹ زمر کے بیان کے بعد آنی چاہیے۔ یہ پلان تھا، مگر زمر... اگر زمر مر گئی... اف... اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک لاش کا مزید بوجھ اپنے کندھوں پر ...... نہیں!

وہ سر جھٹک کر اپنی ای میل کھولنے لگا۔ خاور نے دو روز پہلے اس کو فارس کی آیلی بائی لڑکی کی تفصیلات بھیج دی تھیں۔ اس کے واہمے درست تھے۔ وہ علیشا ہی تھی۔ مگر اس نے ہاشم سے رابطے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسی سے ملنے ادھر آئی تھی، ہاشم کو معلوم تھا، اسی لیے اس نے بھی علیشا کو نہیں چھیڑا۔ وہ خود چل کر اس کے آفس آئے گی۔ کب؟ وہ منتظر تھا۔ باہر کھڑی علیشا نے سیکرٹری کو نفی میں سر ہلاتے دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ ریکارڈ نہیں ہے، کیا آپ سر سے اپائنٹمنٹ لینا چاہیں گی؟" مگر علیشا نے بغیر مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا، اس نے دروازہ کھول لیا۔

سب سے پہلے ہاشم نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل سپاٹ، سرد سا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیب پہ احمر شفیع کی پریزنٹیشن دیکھتے جیسے سر اٹھایا تو وہ بھی ایک دم بالکل ٹھہر سے گئے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی اور سیکرٹری پیچھے سے آ کر اسے روکتے ہوئے سخت سست سنا رہی تھی۔ اورنگ زیب صاحب کے ساتھ جھکے کنسلٹنٹ لڑکے نے باری باری ان دونوں باپ بیٹے کے تاثرات دیکھے اور پھر سیدھا ہوا۔ سیکرٹری کو اشارہ کیا، وہ خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ علیشا دو قدم مزید اندر آئی، وہ مسلسل اورنگ زیب کاردار کو دیکھ رہی تھی، بنا پلک جھپکے، سپاٹ چہرے کے ساتھ، جیسے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہاشم ایک دم مڑا، سختی سے احمر کو دیکھا۔ "باہر جاؤ، فوراً"

کنسلٹنٹ لڑکا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا سمجھانے لگا۔

"سر! اگر تو یہ کوئی اسکینڈل ہے تو میرا خیال ہے میرا یہاں موجود ہونا سب سے ضروری ہے۔ کیونکہ میں ہی آگے پیش آنے والی صورت حال کا تجزیہ کر سکتا ہوں اور میں ہی آپ کو بہتر طریقے سے گائیڈ کر سکتا ہوں کہ آپ کو اس سچویشن کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے؟ کیونکہ میں نے..."

ہاشم گھوم کر اس طرف آیا، باپ کے ہاتھ سے ٹیب لے کر کنسلٹنٹ کو دے مارنے کے انداز میں تھمایا، اسے کہنی سے پکڑا، کھینچ کر دروازے تک لے کے گیا اور ہکا بکا سے احمر کو باہر نکال، گویا دفعان کر کے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس مڑ کر علیشا کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سخت شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔

"کیا چاہیے؟ کس لیے آئی ہو؟"

اورنگ زیب بھی اب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے اور تیکھی خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ علیشا نے نظروں کا رخ ہاشم کی طرف پھیرا۔ پھر خود کو بااعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"پیسے چاہئیں۔" ہاشم نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ گھوم کر آگے آیا اور باپ کی کرسی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں ایک سمت تھے اور ان کے مقابل

سکوں۔" وہ اب کہ بولا تو لہجے میں ذرا نرمی تھی، اورنگ زیب نے ناگواری سے ہاشم کو دیکھا، مگر بولے کچھ نہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ہاشم یہ سب اس سے کچھ کہلوانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ علیشا کو حوصلہ ہوا۔

"شاید آپ بھول گئے میں کمپیوٹرز میں اچھی ہوں، میں نے آپ کے والد (اس نے "آپ کے" پہ زور دیا) کا ای میل اکاؤنٹ ہیک کر رکھا تھا اور میں دیکھتی تھی کہ وہ کس طرح ایک چھوٹی لڑکی کو ای میلز بھی کرتے تھے اس کی میلز کا جواب بھی دیتے تھے اور اس کو سراہتے بھی تھے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر اپنے خون کو چھوڑ کر کسی اور کی بیٹی سے اتنا پیار کوئی کیسے رکھ سکتا ہے؟"

"اور اب تم اس کسی اور کی بیٹی کو نقصان پہنچانا چاہتی ہو؟ رائٹ؟"

ہاشم کے چہرے کی سختی لوٹ آئی، وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا اور علیشا دو قدم پیچھے ہٹی۔ وہ اب خوف زدہ نظر آ رہی تھی، جیسے اسے لگ رہا ہو، ہاشم ابھی اس پر جھپٹ پڑے گا۔

"تم نے اسے کیسے ٹریپ کیا، بالکل سچ سچ بتانا، ورنہ مجھے سچ نکلوانے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔" علیشا کی گردن خود بخود نفی میں ہلی۔ حلق سوکھ چکا تھا۔ لمحے بھر کی نرمی نے اسے دھوکا دیا تھا۔

"میں نے اسے ٹریپ نہیں کیا۔ میں وہ گیم کھیلنے لگی جو وہ کھیلتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے کانٹیکٹ کرے گی اور پھر ہم دوست بن گئے۔" پھر اس کے چہرے پہ بے چینی ابھری۔ "ہم واقعی دوست ہیں، پلیز اس کو کچھ مت کہنا۔ پلیز"

وہ کمزور پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی وہ اس طاقتور اور رعب دار باپ بیٹے کے سامنے کمزور پڑ جائے گی اور بالکل ایسا ہوا تھا۔ ایسا ہی ہونا تھا۔

"میں اس کو بہت پسند کرتی ہوں وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ پلیز میری اور اس کی دوستی کو کسی اور نظر سے مت دیکھو۔" ہاشم نے گہری سانس لی۔ اثبات میں سر ہلایا، اپنی سابقہ کرسی کھینچی، بیٹھا، ٹانگ پہ ٹانگ رکھی۔ اور گردن اٹھا کر تمکنت اور رعونت سے علیشا کو دیکھا۔

"اب تمہیں جو کرنا ہے کر لو، کیونکہ تمہیں میرے پاس سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ اپنے ملک واپس جاؤ، محنت مزدوری کرو اور پھر جس اسکول میں جانا ہے جاؤ۔ اور نہیں تو کہیں اسکالرشپ کے لیے اپلائی کر دو۔ کوئی نہ کوئی تم پہ ترس کھا کے کچھ دے دے گا۔ لیکن وہ شخص کم از کم میرا باپ نہیں ہو گا۔" اس کے بعد سختی سے انگلی اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "آؤٹ۔" علیشا کی آنکھوں میں ابھرتی نمی بڑھنے لگی۔ اس نے تڑپ کر اپنے باپ کو دیکھا۔

"خداوند تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اس کا یہاں آنا، اس کا یہاں ٹھہرنا، ان کے پاس آ کے منت کرنا سب بے کار لگ رہا تھا۔

اس کے نکلتے ہی ہاشم کے تاثرات بدلے۔ وہ تیزی سے اٹھا، اورنگ زیب کے چہرے پہ بھی اب قدرے تفکر تھا۔

"ہاشم!" انہوں نے پکارا مگر اس سے پہلے ہی وہ ان کی طرف گھوما، میز پر ہاتھ رکھے ان کے سامنے جھکا۔ اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر چبا چبا کر بولا۔ "میں ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی آپ کا پھیلایا کچرا صاف کر لوں گا، کیونکہ ہاشم ہے ہی اس کام کے لیے۔ ہاشم ہر چیز سنبھال سکتا ہے، یہ بھی سنبھال لے گا۔ لیکن میری بات یاد رکھیے گا۔ اگر میری ماں کو اس بارے میں کچھ بھی پتا چلا، یا وہ ہرٹ ہوئیں تو میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔"

پھر سیدھا ہوا۔ اپنا لیپ ٹاپ اٹھایا اور انہیں گھور کر دیکھتا مڑ کر باہر نکل گیا۔ اورنگ زیب غصے سے منہ میں کچھ بڑبڑا کر سر جھٹک کر رہ گئے۔ ابھی فارس کا مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مسئلہ آن پہنچا تھا۔ برے وقت کی ایک غلطی۔ اف!

☼ ☼ ☼

شیشہ گروں نے اس کی بصیرت بھی چھین لی
آنکھیں تھیں اس کے پاس مگر دیکھتا نہ تھا

اسپتال کا ویٹنگ روم یخ ٹھنڈا تھا، حنین گھٹنے ملا کر سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ علیشا ساتھ کھڑی اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے تسلی دینے والے فکر مند انداز میں کہہ رہی تھی۔

"آئی ایم سو سوری، جو بھی تمہاری آنٹی کے ساتھ ہوا، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کے زخم اتنے گہرے ہوں گے۔ مجھے بتاؤ کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟" وہ بے حد پر ملال نظر آ رہی تھی۔ چہرے پہ چند گھنٹے پہلے کی ہاشم کے ساتھ کی گئی ملاقات کا اثر اور شکستگی ابھی تک برقرار تھی۔ اور وہ حنین کے لیے فکر مند بھی تھی۔

حنین نے سوگواریت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چہرہ اٹھایا، عینک کے پیچھے اس کی آنکھوں میں بے حد دکھ تھا۔

"میرا نہیں خیال ہم پھپھو کے لیے اب کچھ کر سکتے ہیں، میں ان کے لیے پہلے بھی کچھ نہیں کر سکی تھی۔ اب مجھے ہر اس رویے پر شرمندگی ہے جو میں نے ان کے ساتھ رکھا۔"

علیشا اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھی، پرس اپنے قدموں کے قریب رکھا۔ اور پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگی۔

"تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ، دلوں کے سارے میل دھو ڈالو۔ جن رشتوں کی مشترک شے "خون" ہوتی ہے، وہ ایک دوسرے کی طرف پلٹ کے ضرور آتے ہیں۔" حنین بے دلی سے اس کی ساری باتیں سنتی گئی۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی پریشان نگاہیں بار بار کوریڈور کی طرف اٹھتی تھیں، جس کے پار کمرے میں زمر تھی۔ اس نے بیان دینے کے لیے رضامندی ظاہر کی تھی اور ابھی پولیس آ گئی تھی۔ تب سے سعدی اور پولیس آفیسرز باہر نہیں نکلے تھے۔

"تمہاری امی کدھر ہیں؟ میں ان سے افسوس ہی کر لیتی۔" علیشا رکی، پھر وضاحت دینے والے انداز میں بولی۔

"آئی ایم سوری میں پچھلے کچھ دن بہت مصروف رہی۔ اپنی ڈاکومینٹری کے سلسلے میں۔" کہتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ قدرے پھیکا پڑا، مگر حنین نے نوٹ نہیں کیا۔ علیشا نے شکر ادا کیا، اپنی دوستی کو کسی بھی قیمت پہ وہ داؤ پہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔

"وہ میرے دادا کے پاس ہیں۔ ان کو گھر شفٹ کر دیا گیا ہے، وہ بہت بیمار ہیں۔ پھپھو کے حادثے نے ان پہ بہت برا اثر ڈالا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ پیش آنے والے تمام حالات بتانے لگی۔ علیشا سنتی گئی۔ ان سے ہٹ کر کوریڈور کے اس پار کمرے میں، زمر بستر پر لیٹی تھی۔ چادر گردن تک ڈالے سرہانے کی طرف سے بیڈ اوپر کو اٹھا تھا اور وہ تکیوں سے ٹیک لگائے سپاٹ چہرے اور خشک ویران آنکھوں کے ساتھ اپنے سینے پہ رکھے باہم ملے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ سعدی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ بالکل ساتھ۔ دو پولیس والے سامنے موجود تھے، بیان قلم بند کیا جا رہا تھا۔

"پھر فارس غازی نے مجھے کال کر کے جگہ کی تبدیلی کا بتایا، اس کے کہنے پہ میں اس ریسٹورنٹ گئی جہاں پہ اس نے مجھے بلایا تھا۔" سعدی نے چونک کر اسے دیکھا، اسے حیرت ہوئی یہ بات فارس یا حنین نے اسے نہیں بتائی تھی۔

"ریسٹورنٹ میں جانے کے بعد کیا ہوا؟" اے ایس پی سرمد شاہ پوچھ رہا تھا۔ زمر نے جواب دینے کے لیے نگاہیں اٹھائیں، پہلے اس کو دیکھا پھر گردن پھیر کے سعدی کو اور ایک ہاتھ سعدی کی طرف بڑھایا، سعدی اس کا ہاتھ پکڑتے قریب ہوا۔ جیسے کوئی مورل سپورٹ تھی جس کی اس کو ضرورت تھی۔ اب کہ اس نے زیادہ اعتماد سے پولیس آفیسر کو دیکھا اور بولی تو آواز ٹھنڈی تھی۔

"فارس نے مجھے کال کی اور اس نے مجھے کہا کہ اسی نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کے پاس کوئی ایلی بائی نہیں تھا....." سعدی نے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ

اس کے ہاتھ سے نکلا۔ بے حد بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جو فارس کے کہے تمام الفاظ من و عن دوہرا رہی تھی۔

"زمر؟" اس نے استعجاب سے پکارا۔ زمر رکی، اپنے خالی رہ جانے والے ہاتھ کو دیکھا اور پھر سعدی کو۔ یہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ آفیسر پوچھ رہا تھا کہ پھر کیا ہوا؟ اور زمر سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل گنگ تھا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ماموں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"سعدی میں ادھر تھی، فارس نے مجھے کال کیا، اس نے یہ سب مجھے کہا، یہ سب جو میں نے ابھی لکھوایا ہے۔ اور پھر اس نے کہا کہ وہ مجھے صرف ایک گولی مارے گا، وہ بھی دل میں۔ لیکن اس نے مجھے تین گولیاں ماریں۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی قتل کرنا چاہتا ہے اور مجھے بھی۔ اور پھر ایسا ہی ہوا اس نے شوٹ کیا۔ آپ اس کے گھر جائیں اس کی گنز تلاش کریں، اس کے پاس گنز کی ایک بہت بڑی کلیکشن ہے۔ مجھے یقین ہے انہی میں سے کوئی گن اس نے ہمارے اوپر استعمال کی ہوگی۔ میں تو یہ سمجھ نہیں پا رہی کہ وہ ابھی تک آزاد کیوں گھوم رہا ہے؟ سعدی تم میری بات سن رہے ہو؟" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کا اعتماد کم ہو رہا تھا۔ سعدی بے حد بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا۔

"زمر! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔" پھر تیزی سے وہ آفیسرز کی طرف مڑا۔

"آپ پلیز اس کو بند کر دیں۔ مجھے اپنی پھپھو سے بات کرنی ہے۔ یہ بیان اس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے، پلیز آپ ابھی باہر جائیں۔" وہ ان کو باہر بھیجنا چاہتا تھا۔ زمر کے چہرے کا رنگ بدلا، لب بھنچ گئے۔ اس نے قدرے غصے سے سعدی کو دیکھا۔

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ اس نے کہا، اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے، اس نے کہا وہ اپنی بیوی کو اور مجھے قتل کرنے جا رہا ہے۔ اور اس نے ہم پہ گولی چلائی۔ یہ گولی ہم پہ فارس نے چلائی۔ میں اس بات کی گواہ ہوں۔"

"زمر پلیز خاموش ہو جائیں۔ کچھ بھی مت کہیں۔ یہ سب کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہے، پلیز خاموش ہو جائیں۔" وہ بے حد الارمڈ سا ہو کر اس کو باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح پولیس والوں کو وہاں سے نکالے۔

"سعدی! میری بات سنو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، میرا دماغی توازن بھی بالکل برقرار ہے۔ میں کسی بھی Duress میں آ کر یہ بیان نہیں دے رہی، میں ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر یوسف ہوں، میری ایک کریڈیبلٹی ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ سب فارس نے کیا ہے، اسی نے اپنے بھائی کو مارا، اسی نے ہمیں بھی مارنا چاہا۔ آپ اس کو بلالیں، آپ اس کو میرے سامنے لا کر یہ سب پوچھ سکتے ہیں۔"

"زمر! پلیز خاموش ہو جائیں۔" وہ تڑپ کر اس کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن زمر نے دیکھا سعدی کا ہاتھ اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس نے اپنا خالی ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ چہرے کے تاثرات مزید سرد ہو گئے۔ اے ایس پی سرمد آگے بڑھا۔ سعدی کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور تنبیہی انداز میں اس کو دیکھا۔

"آپ باہر چلے جائیں اور اگر آپ نے کال کر کے فارس غازی کو متنبہ کرنے کی کوشش کی تو میں آپ کو قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں، اور مجھے امید ہے آپ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کریں گے، جس کا نقصان صرف اور صرف آپ کے ماموں کا ہوگا۔" دوسرے آفیسر نے دروازہ کھولا، وہ سعدی کو باہر جانے کو کہہ رہے تھے۔ وہ پھر بھی اس کو دیکھتی رہی بظاہر سپاٹ، سرد نظروں سے، لیکن ان میں جیسے بے چینی بھی تھی، امید تھی۔ وہ ابھی آئے گا اور اس کا ہاتھ تھام کر کہے گا، میری پھپھو سچ کہہ رہی ہیں، میری پھپھو جھوٹ نہیں بول سکتیں، مگر وہ بے یقین حق دق سا لڑکا مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ "یہ سب غلط ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے میرے ماموں ایسا نہیں کر سکتے، میں سچ کہہ رہا ہوں میری بات سنیں، آپ پلیز یہ بیان روک دیں۔" مگر آفیسر نے اس کی اگلی بات نہیں سنی تھی، اس نے بہت عزت اور احترام سے اس کی کہنی کو تھامے اس کو باہر کا رستہ دکھایا، اور دروازہ بند کر دیا۔ زمر نے آنکھیں بند کیں، چند گہرے سانس اندر اتارے۔ اور پھر کھولیں تو وہ پہلے سے زیادہ خود کو سمیٹ چکی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ وہی سب جو اس کے نزدیک سچ تھا اور یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے اسپتال کے بستر پہ لیٹا اپنا وجود تھا، نہ ہی اردگرد لگی نالیاں تھیں، مشینز اور فضا میں رچی بسی اسپرٹ کی عجیب سی بو.... ناکارہ گردے.... ڈائیلیسز والی زندگی.... کچھ بھی نہ تھا.... صرف فالج زدہ بڑے ابا تھے.... صرف وہی۔

بے حد مضمحل اور پریشان سا سعدی باہر آیا۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہ ویٹنگ روم کے سامنے رکا، پھر تیزی سے اندر آیا۔ حنہ اور علیشا وہاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

"حنین" اس کے انداز پہ حنین بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی، متفکر نگاہوں سے اس کا چہرہ کھوجا۔ "کیا ہوا بھائی؟"

"جب تم اور ماموں اور...." ایک نگاہ ساتھ کھڑی فارنر لڑکی پہ ڈالی، پھر حنین کو دیکھا۔

"اور تمہاری فرینڈ، زمر کا انتظار کر رہے تھے ہوٹل میں کیا تب ماموں نے ان کو کوئی کال کی تھی؟" حنین نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"کیا مطلب کیسی کال؟"

"حنین! جب تم سب لوگ ساتھ تھے تو کیا ماموں نے زمر کو کسی ریسٹورنٹ میں بلایا تھا؟ انہوں نے انہیں کوئی کال کی تھی؟ جس میں انہوں نے کہا کہ وہ،" وہ رکا۔ یہ الفاظ تو وہ خود بھی ادا نہیں کر پا رہا تھا۔ بمشکل ہمت مجتمع کر کے بولا۔

"انہوں نے کہا کہ وہ، وہی وارث ماموں کے قاتل ہیں اور وہ زمر کو بھی مارنا چاہتے ہیں اور زرتاشہ آنٹی کو بھی۔" حنین کے چہرے پہ پہلے حیرت ابھری اور پھر شدید شاک۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" پھر اس نے **علیشا** کو دیکھا۔ "**علیشا**.... ہم سب ساتھ تھے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ایک دو دفعہ کال کی تھی مگر پھپھو کا فون بند جا رہا تھا۔" **علیشا** نے بھی اتنی ہی الجھن سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔

"میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی لیکن ہم لوگ کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ وہیں پہ رہے۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں اور ہم باتیں کرتے رہے تھے یا زیادہ وقت خاموش رہے تھے۔ پھر فون آیا کہ زرتاشہ کو گولی لگی ہے، جو حنین کے انکل کی بیوی تھی۔ اس پر یہ دونوں اکٹھے وہاں سے نکل گئے۔" سعدی اس کی طرف مڑا۔ اس نے ٹھہر کر اس سے پوچھا۔

"کیا جب تم لوگ ساتھ تھے، تم تینوں تو کسی ایک لمحے کے لیے بھی فارس ماموں تم لوگوں سے الگ ہوئے تھے؟" حنین اور علیشا دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا بھائی۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کیں، کنپٹی دونوں ہاتھوں سے مسلی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔

"زمر کہہ رہی ہیں کہ ماموں نے انہیں کال کیا اور ماموں نے انہیں کہا کہ وہ ان کو شوٹ کرنے لگے ہیں اور یہ کہ ماموں نے ان کے سامنے اعتراف جرم کیا۔" حنین کے چہرے کا شاک ایک دم ناگواری اور غصے میں ڈھلا۔ وہ تیزی سے آگے آئی۔

"کیا مطلب ماموں نے یہ سب کہا؟ پھپھو جھوٹ بول رہی ہیں، ماموں ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ کیا مذاق ہے؟" وہ طیش سے بھپر رہی تھی۔ زمر اس قسم کی حرکت کیوں کر، کر سکتی تھی؟ سعدی نے نفی میں گردن ہلائی، اور تھکا تھکا سا کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا کیا ہو رہا ہے؟ مگر زمر کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ماموں پہ الزام لگا رہی ہیں، ماموں تو خود اتنے ٹوٹ گئے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچا بھی

نہیں تھا کہ یہ سب ہو گا۔ ماموں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہے نا حنین؟" اس نے تائید کے لیے سر اٹھا کر حنین کو دیکھا۔ وہ اس کی طرح پریشان نہیں تھی' وہ غصے میں تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا پھپھو ماموں سے کون سا بدلہ اتار رہی ہیں؟ یہ ایک دہشت گردی کی کارروائی تھی وہ اس میں ماموں کو کیوں گھسیٹ رہی ہیں؟ انہیں ایسا کرنا بالکل زیب نہیں دیتا۔ مجھے کبھی ان سے اس چیز کی توقع نہیں تھی۔" وہ غصے سے واپس بیٹھی' اب چہرے پہ کچھ دیر پہلے کی چھائی زمر کے لیے ہمدردی ختم ہو چکی تھی وہاں صرف اور صرف ملال بھری بے بسی تھی۔ علیشا ان دونوں کے سامنے کھڑی فکر مندی سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس مسئلے میں پھنستی جا رہی ہے۔

"بھائی! آپ ماموں کو کال کریں' ان سے پوچھیں کہ پھپھو کیا کہہ رہی ہیں۔" سعدی نے تھکی تھکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا جو فارس غازی کو مزید مشتبہ بنائے۔ اس بیان کے بعد پولیس ان سے ضرور پوچھ گچھ کرے گی۔ شاید ان کو گرفتار بھی کر لے۔ مجھے واقعی نہیں پتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"اگر آپ نہیں بتائیں گے تو میں انہیں کال کرنے جا رہی ہوں۔ انہیں پتا ہونا چاہیے کہ پھپھو ان پہ کیا الزام لگا رہی ہیں' اور وہ بھی پولیس کے سامنے۔ او گاڈ!" حنین کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالے۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوئی جیسے واقعی کال کرنے جا رہی ہو۔ سعدی نے اسے روکا۔

"نہیں' اس وقت چیزوں کو خراب کرنے کی نہیں ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔" حنین نے سوالیہ نظروں سے بھائی کا چہرہ تکا۔

"پھر ہم کیا کریں؟ کس کو بتائیں؟ کس سے مدد مانگیں؟"

سعدی نے موبائل نکالا' فون بک کھولی' نمبر ڈائل کیا۔ اور فون کان سے لگاتے ہوئے حنین سے بولا۔

"تھینک گاڈ' ہمارے رشتے داروں میں کوئی ایک شخص تو ایسا ہے' جس کے بارے میں' میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہر مسئلہ سنبھال سکتا ہے۔" دوسری طرف گھنٹی جا رہی تھی۔

حنین نے بھنویں سکیڑ کر اچنبھے سے سوچا اور پھر تاثرات ڈھیلے پڑے۔

"اوہ ہاشم بھائی' آپ ہاشم بھائی کو بلا رہے ہیں۔ اوکے!" وہ غیر آرام دہ سی ہو کر کرسی کے کنارے بیٹھ گئی۔ البتہ وہ ابھی بھی بے چین تھی اور ناخوش بھی۔ سامنے کھڑی علیشا کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ اس ساری گفتگو میں ہاشم کا نام سب سے واضح تھا۔ ہاشم پھر ہاشم' ادھر بھی ہاشم.....

اس نے کھنکھار کے ان دونوں کو متوجہ کیا۔

"میرا خیال ہے' مجھے چلنا چاہیے۔ میری ممی کی کال آنے والی ہے' وہ ہوٹل میں مجھے اس وقت نہ پا کر پریشان ہو جائیں گی۔ میں رات کو پھر آؤں گی' تم پریشان مت ہونا۔" قریب ہو کے حنین کا کندھا تھام کر وہ کہہ رہی تھی۔ سعدی نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس فارنر لڑکی کو دیکھا جو ان کے لیے بے حد فکر مند لگ رہی تھی۔ اور پھر دوسری طرف جاتی گھنٹی سننے لگا۔

"جی ہاشم بھائی!" رابطہ ملتے ہی وہ بچوں کی سی بے ساختگی سے بولا۔

"پلیز آپ ادھر آ جائیں' جی ادھر ہی اسپتال میں' مجھے نہیں پتا یہاں کیا ہو رہا ہے لیکن پھپھو کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو تفصیل یہاں آنے پہ بتاؤں گا' لیکن وہ ابھی پولیس کو اپنا بیان دے رہی ہیں۔ اور جو وہ بیان دے رہی ہیں' وہ ہمارے خاندان کے لیے بہت تباہ کن ہو سکتا ہے۔" اور دوسری طرف کار ڈرائیو کرتے ہوئے' کانوں میں ہینڈز فری لگائے ہاشم نے تھک کر آنکھیں بند کیں۔ اور پھر گہری سانس لے کر کھولیں۔ بالآخر وہ بیان آ ہی گیا تھا جس کا وہ انتظار کر رہا تھا۔

"میں آ رہا ہوں سعدی! تم بالکل فکر مت کرو' میں

سب سنبھال لوں گا۔ ہاشم سب سنبھال سکتا ہے۔" ہلکی سی مسکراہٹ سے اس نے ہینڈز فری کانوں سے اتارے اور ایکسیلیٹر پہ پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا.....

☼ ☼ ☼

پولیس آفیسرز زمر کے کمرے سے نکل رہے تھے' جب کوریڈور کی دیوار کے ساتھ لگے مایوس اور فکر مند سے کھڑے سعدی نے کوئی آہٹ سی محسوس کر کے گردن موڑی۔ ریسپشن کی طرف سے ہاشم چلتا ہوا آ رہا تھا' بلیک سوٹ میں ملبوس' کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتا' دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے وہ تیز قدم اٹھاتا قریب آیا۔ تحکم اور رعونت سے ان آفیسرز کو دیکھا وہ فوراً" سیدھے ہوئے تھے' اے ایس پی نے مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ ہاشم نے محض سر کے خم سے جواب دیا۔ اور ان کو نظر انداز کر کے سعدی کی طرف آیا۔

"مجھے مختصراً" بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟" اور اسے تو جیسے ہاشم بھائی کے آنے سے بہت تقویت مل گئی تھی' وہ پریشانی سے تیز تیز بولتا اس کو ساری صورت حال سمجھانے لگا۔ ہاشم کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا' مگر بظاہر پوری توجہ سے سن کر اس نے سر ہلایا' اور اسے وہیں رکنے کا کہہ کر کمرے کی طرف بڑھا۔

"مجھے زمر سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔" اندر موجود ڈاکٹر کو اس نے بس ایک فقرے سے باہر بھیجا' دروازہ بند کیا اور بیڈ کے سامنے آیا۔ قدرے ٹیک لگا کے لیٹی زمر نے اکتا کر ہاشم کو دیکھا اور بے زاری سے منہ پھیر لیا۔

"آپ جس لیے بھی آئے ہیں' کتنا ہی اچھا ہو واپس چلے جائیں کیونکہ میں اس وقت کم از کم آپ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے فارس کے خلاف بیان دیا ہے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ زمر نے واپس منہ اس کی طرف کیا اور بگڑے تاثرات سے بولی۔

"آپ کو میرے بیان پہ جو بھی اعتراض کرنا ہے' جو بھی واویلا کرنا ہے۔ آپ کورٹ میں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میں اپنی کسی بات سے اک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" ہاشم کے چہرے پہ ملال ابھرا اور بے یقینی بھی۔ وہ قریب آیا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کتنا ناقابل اعتبار سمجھتی ہیں' شوق سے سمجھیے مگر آپ کے بارے میں' میں ایک بات جانتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتیں' اور بلاوجہ کسی کے بارے میں اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتیں۔" وہ جو بے زاری سے اس کو دیکھ رہی تھی' قدرے چونکی' چہرے کے تاثرات ذرا نرم ہوئے۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" آواز میں البتہ وہی بے اعتنائی اور خشکی تھی' جیسے وہ جلد از جلد ہاشم کی کمپنی سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

"میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ کیا واقعی وہی ہوا تھا جو آپ نے پولیس سے کہا؟ کیا واقعی آپ نے فارس کو اعتراف جرم کرتے سنا؟" کافی توجہ اور دھیان سے اس کو دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ جیسے اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہو۔

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نے سب سچ کہا ہے۔ ایک ایک حرف۔" ہاشم نے سمجھنے والے انداز میں "اوکے" کہتے ہوئے' کالر سے نادیدہ گرد جھاڑی' کوٹ کا بٹن بند کیا اور۔

"تو پھر آپ مجھے ہمیشہ اپنی حمایت میں پائیں گی۔" کہہ کر مڑ گیا۔

زمر اس کو باہر جاتے دیکھتی رہی۔ اب بھی اس کی نگاہوں میں بے زاری تھی مگر اس کی شدت کم تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو باہر کھڑا سعدی نظر آیا' زمر کی نگاہوں میں امید سی جاگی۔ اس نے ذرا گردن اٹھا کے دیکھا مگر سعدی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً" ہاشم کی طرف پر امید سا بڑھا تھا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ درمیان کا رستہ رک گیا۔ زمر نے سر بے دلی سے تکیے پہ ڈال دیا۔ آنکھ کے کنارے پر ہلکی سی نمی ابھی

تھی، مگر اس نے جلدی سے انگلی کی نوک سے اسے صاف کر لیا۔ وہ بیٹھ کے رونے والوں میں سے کبھی بھی نہیں تھی۔ تو پھر آج کیوں؟ اونہہ۔

"کیا آپ نے زمر سے بات کی؟" باہر وہ بے قراری سے ہاشم سے پوچھنے لگا۔ ہاشم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا۔

"تم فکر نہ کرو ہم پولیس اسٹیشن چلتے ہیں' وہ فارس کو اریسٹ کر کے وہیں لائیں گے۔" سعدی کو جھٹکا لگا تھا۔

"کیا وہ ماموں کو اریسٹ کرلیں گے؟"

"وہ ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر ہے' اور وہ کہہ رہی ہے کہ اس کے اوپر فارس غازی نامی شخص نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ وہ اس کو ضرور اریسٹ کریں گے' اس لیے تم فارس کے لیے معاملات بگاڑنے کے بجائے ٹھنڈے طریقے سے چیزوں کو حل کرنے کی کوشش کرو۔ آؤ۔" ہاشم باہر کی طرف بڑھا تو متذبذب سا کھڑا سعدی فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ حنین بھی اب کوریڈور کے سرے پہ آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ حنین تک رکا۔

"تم امی کو فون کر لینا' اور ان سے کہنا وہ تمہارے پاس آجائیں۔" حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔ قدرے مشتبہ نظروں سے سامنے جاتے ہاشم کو دیکھا جو اب سعدی کے انتظار میں رک گیا تھا۔ نگاہیں ملیں' ہاشم نے "کیسے ہو بیٹا؟" کہہ کر گویا حال احوال کا فرض نبھایا اور جواب کا انتظار کیے بغیر سعدی کو چلنے کا اشارہ کرتا مڑا اور پھر حنین کے سامنے وہ دونوں تیز تیز باہر نکل گئے۔

حنین لب کاٹتی' وہاں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر زمر کے روم کے دروازے تک آئی' دستک دینے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ نے دروازے کو نہیں چھوا' اس نے ہاتھ گرا دیا۔ کسی بھی چیز کا کوئی بھی فائدہ نہیں تھا۔ کم از کم اس کی زمر سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ ایک بے فائدہ گفتگو اس کے ساتھ کر سکے' وہ برے دل کے ساتھ واپس پلٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

انکار پہ پہرا ہے قانون پہ ٹھرا ہے
جو صاحب عزت ہے' وہ شہر بدر ہوگا

پولیس اسٹیشن کے اس کمرے میں ایک خالی میز بچھی تھی اور اس کے گرد تین کرسیاں' سعدی بے چینی سے کرسی کے کنارے ٹکا میز پہ کہنیاں رکھے سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھا تھا۔ اکیس سالہ کم عمر چہرے پہ بے پناہ فکر مندی تھی۔ ساتھ والی کرسی پہ ہاشم ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا موبائل پہ بٹنز دبائے جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ نظر اٹھا کے سعدی کو بھی دیکھ لیتا۔ کبھی کبھی کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی آمیز انداز میں تھپک دیتا۔

"میں سب سنبھال لوں گا' بے فکر رہو۔"

سعدی نے بدقت مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت کسی بھی چیز کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کتنی دیر سے فارس غازی سے ملاقات کے لیے بیٹھے تھے مگر کوئی اسے لاہی نہیں رہا تھا۔

باہر پچھلی سہ پہر رات میں ڈھل چکی تھی۔ سعدی اٹھ کر کمرے میں ارد گرد مضطرب سا چکر کاٹنے لگا۔

یہ خیال کہ فارس ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے حوالات میں بند ہے اور اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری ہے اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ ہاشم ہنوز موبائل پر بٹنز دبائے جا رہا تھا۔

دفعتاً" دروازہ کھلا' ہاشم نے کافی پر سکون انداز میں اور سعدی نے بے حد بے تابی سے اس طرف دیکھا۔ دو اہلکار فارس غازی کو لیے آرہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ سیاہ جینز پہ راؤنڈ نیک والی گرے شرٹ میں ملبوس جس کی آستینیں کلائی تک آتی تھیں' فارس انتہائی غصے بھری بے بسی کی سی کیفیت میں تھا۔ ابرو بھینچے تھے اور ہلکی سنہری آنکھوں میں شدید تلخی تھی۔

ہاشم موبائل رکھ کر فوراً" اٹھا' ایک کڑی نگاہ اہلکار پہ ڈالی۔

"ہتھکڑی کھولو۔" اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ بنا

چوں چرا فارس کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ فارس نے ہاتھ جھٹکے کرسی کھینچی اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھا' اس کے ماتھے پہ ابھی تک بل تھے۔

"تم ٹھیک ہو؟"

ہاشم مصنوعی ہمدردی سے پوچھتے ہوئے کھڑا رہا جب کہ سعدی جلدی سے آکر اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھا۔ فارس نے ایک تیکھی نظر ہاشم پہ ڈالی اور استہزائیہ سر جھٹکا جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی تمہیں ہی ہوئی ہوگی۔ ہاشم اس کی سرد مہری محسوس کرکے دروازے کی طرف بڑھا۔

"میں اے ایس پی سے مل کر آتا ہوں' تم بات کر لو۔" سعدی کو اشارہ کرکے وہ باہر نکل گیا۔ اب کے فارس نے ان ہی تاثرات سے اسے دیکھا۔

"کیا واقعی تمہاری پھپھو نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے؟" اس کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔ سعدی نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"میں خود سمجھ نہیں پا رہا' یہ کیا ہوا ہے! کیا آپ نے انہیں کال کی تھی؟ کیا جب آپ نے ان کو ریسٹورنٹ میں بلایا تھا..."

"میں نے انہیں کسی ریسٹورنٹ میں نہیں بلایا تھا' ہوٹل میں بلایا تھا' حنین تھی' اس کی وہ دوست تھی' میں نے انہیں کوئی کال نہیں کی تھی' میں سمجھ نہیں پا رہا' میڈم میرے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں' یہ سب جھوٹ ہے' بکواس ہے!" اس نے طیش سے کہتے ہوئے میز پہ مکا مارا۔

سعدی پیچھے کو ہوا' لب کاٹتے ہوئے سوچنے لگا' اب کچھ کچھ صورت حال سمجھ میں آ رہی تھی۔

"مگر انہوں نے کہا' آپ نے انہیں کال کرکے کہا ہے کہ آپ نے ہی وارث غازی کا قتل کیا ہے اور یہ بھی کہ..." سعدی رکا' اسے وہ تمام تکلیف دہ الفاظ یاد تھے جو زمر نے اس کے سامنے آفیسر کو بتائے تھے۔

"اور یہ کہ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا زمر' اور اس طرح کی بہت ساری باتیں۔"

وہ واقعی دہرا نہیں پا رہا تھا' اسے شرمندگی ہو رہی تھی' "آخر زمر اس قسم کی بات کیسے کر سکتی تھیں۔"

"میں میڈم سے ایسی بات کیوں کروں گا؟ میرے پاس دو گواہ ہیں حنین اور **علیشا**' ہم سارا وقت ایک ساتھ رہے' میں نے کسی سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور میں اس کو کیسے گولی مار سکتا ہوں؟ میرے پاس تو اس وقت کوئی گن بھی نہیں تھی۔"

"مگر جو گولی پھپھو کو ماری گئی تھی وہ **علیشا** کے کمرے کے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے ماری گئی اور جب پولیس نے وہاں پر چھاپا مارا تو وہاں موجود گن آپ کی تھی' اس پر آپ کے فنگر پرنٹس تھے' یہ وہی امریکن گن تھی جو آپ نے بلیک میں پشاور سے خریدی تھی۔ اور آپ کے نشان لگے گلاس اور کٹلری بھی وہاں سے قبضے میں لی گئی ہے۔ فنگر پرنٹس کے رزلٹ آگئے ہیں' وہ کمرہ بھی آپ کے نام بک تھا اور ہوٹل کے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمراز بھی خراب تھے' سو آپ **علیشا** کے کمرے میں گئے یا دوسرے کمرے میں' کوئی ثبوت نہیں ہے اور اس پہ مستزاد' زمر کا یہ بیان' میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا' آخر ہو کیا رہا ہے فارس ماموں؟"

وہ ہاشم کی بتائی گئی معلومات جو عین زمر کے بیان کے بعد منظر عام پہ لائی گئی تھیں' دہراتا گیا۔ آخر میں اس کی بے بسی بھی جیسے برہمی میں بدلنے لگی۔ ہاشم واپس آگیا تھا اور اب خاموشی سے کرسی پہ بیٹھا تھا۔

فارس نے اب کے غور سے اس کا چہرہ دیکھا "تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں' میں بکواس کر رہا ہوں' ہاں!"

"میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں... کیا آپ نے پھپھو کو کال کی تھی؟"

"میں نے کسی کو کوئی کال نہیں کی۔ میں میڈم سے ایسی بات کیسے کر سکتا ہوں کہ میں انہیں گولی مارنے والا ہوں! ربش! گولی مارنے سے پہلے کون بتاتا ہے؟"

اس نے اشتعال سے سر جھٹکا' جیسے بس نہ چل رہا ہو اس میز کو اٹھا کر سعدی کے اوپر دے مارے۔

سعدی اک دم رک کر اسے دیکھنے لگا۔ اجنبی عجیب نظروں سے۔

"میڈم کون؟"

"تمہاری پھپھو اور کون!" فارس اکھڑا اکھڑا سا بولا۔

"آپ زمر کو میڈم کہتے ہیں رائٹ؟" اس کے ذہن میں جیسے الارم بج رہا تھا۔ قدرے پرجوش سا ہو کر وہ آگے کو ہوا۔

"لیکن زمر نے جو بیان دیا ہے' اس میں انہوں نے بتایا کہ آپ نے انہیں "زمر" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ مگر آپ کبھی پھپھو کا نام نہیں لیتے' مجھے یاد ہے' آپ ہمیشہ ان کو میڈم کہتے تھے۔"

"اوہ ڈیم اٹ!" ہاشم نے کراہ کر گویا آنکھیں بند کیں۔ اسکرپٹ لکھنے میں ذرا سی غلطی کتنی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی؟

فارس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ ابھی تک سعدی کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

سعدی تیزی سے کھڑا ہوا۔ "میں جانتا ہوں آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں' آپ نے واقعی انہیں کوئی کال نہیں کی۔ آپ فکر مت کریں۔"

اس نے تسلی دینے والے انداز میں فارس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ہاشم بھی اٹھ کھڑا ہوا "میں باہر انتظار کر رہا ہوں تمہارا!" اور باہر نکل گیا۔

"ہاشم بھائی آپ کو بہت جلد یہاں سے نکال لیں گے۔"

"ہاں" فارس نے استہزائیہ سر جھٹکا "ہاشم اور میرے لیے کوشش کرے گا! کبھی بھی نہیں! وہ جو کر رہا ہے' وہ بھی صرف دکھاوے کے لیے ہے۔ میں اس کو جانتا ہوں' اپنا مطلب نہ ہو تو وہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔" سعدی نے متعجب سا ہو کر اسے دیکھا۔

"وہ ان پہلے لوگوں میں تھے جنہوں نے آپ کی بے گناہی پہ یقین کیا تھا' کم از کم ان کے بارے میں آپ کو اتنا منفی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ تسلی رکھیں' ہاشم بھائی آپ کو بہت جلد رہا کروا لیں گے۔"

فارس شاکی سا کچھ بڑبڑا کر چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں پچھلے چند دن سے چھایا ملال اور کرب اب شدید غصے میں ڈھل رہا تھا۔ آخر زمر نے اس پر اتنا بڑا الزام کیا سوچ کر لگایا ہے! وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فارس قتل نہیں کر سکتا' یا شاید وہ کسی اور کی جگہ اس کا نام لے رہی تھی' شاید وہ کسی اور کو کور کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے سر جھٹکا۔ سعدی اب باہر جا رہا تھا' اسے جلد از جلد پھپھو سے ملنا تھا۔

☼ ☼ ☼

جب رات کے پردے سے پھر رات نکل آئے
اس وقت کدھر جائے' جو اہل نظر ہوگا

ہسپتال کے کمرے میں وہی دوائیوں کی بو پھیلی تھی زمر بدستور اسی طرح لیٹی تھی۔ اس کی ویران نگاہیں چھت پر تھیں۔ ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ سعدی جب اندر آیا تو دیکھا' زمر کا چہرا پہلے سے بہت زیادہ مرجھایا ہوا اور رنگت ہلدی کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل مزید ٹوٹ گیا۔ وہ قریب آیا' زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مسکرائی نہیں مگر کوئی امید سی اس کی آنکھوں میں چمکی۔

"کیا ہوا؟" اس نے دو لفظی استفسار کیا۔

"پولیس نے ماموں کو گرفتار کر لیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے زمر کے تاثرات دیکھے۔ زمر کی آنکھوں میں کرب اترا اور ساتھ ہی گردن میں ابھر کر ڈوبتی گلٹی سی نظر آئی۔ سعدی مزید قریب آیا' یہاں تک کہ اس کے کندھے کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ زمر اب نگاہیں پوری اٹھا کر اس کو دیکھ رہی تھی۔

"سعدی! اس نے مجھ پر گولی چلائی' میں نے خود سنا۔ تمہیں مجھ پہ یقین ہے نا؟"

چند گھنٹے پہلے پولیس آفیسرز کے سامنے سپاٹ' سنجیدہ اور مضبوط سی پراسیکیوٹر اب بہت کمزور لگ رہی تھی' اس کے انداز میں بے بسی بھی تھی' خوف بھی' مکڑی کے جالے کا سامان تھا معلوم نہیں کب ٹوٹ

جاتا۔ سعدی نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

"فارس غازی نے آپ سے کیا کہا تھا فون پہ؟"

"اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے صرف ایک گولی مارے گا"

"نہیں، مجھے ان کے الفاظ بتایئے' ایک ایک لفظ۔"

زمر کی آنکھوں میں چمکتی امید مزید گہری ہوئی' مکڑی کے جالے کا سامان مضبوط ہوا۔ وہ پہلے سے زیادہ پراعتماد ہو کر بولی۔

"اس نے کہا میں صرف تمہیں ایک گولی ماروں گا زمر' دل میں اور......"

"مگر فارس غازی نے آپ کو کبھی آپ کے نام سے نہیں پکارا' وہ ہمیشہ آپ کو میڈم کہتے تھے۔"

وہ ایک دم بالکل رک کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

"فارس غازی نے آپ کو کوئی کال نہیں کی تھی' آپ کو فارس نے گولی نہیں ماری تھی' ان کو سیٹ اپ کیا گیا ہے۔ کچھ تو ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔ پلیز مجھے سب کچھ بتایئے' ایک ایک بات!"

زمر بالکل متحیر سی اس کو دیکھے گئی' بنا پلک جھپکے' جیسے سانس تک رک گیا ہو۔

"سعدی! تم کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں!"

"میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔"

"صرف اس بنیاد پر کہ وہ مجھے میرے نام سے نہیں پکارتا تھا! اس نے گولی بھی تو مجھ پر پہلی دفعہ ہی چلائی تھی' بہت ساری چیزیں پہلی بار ہی ہوتی ہیں۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول رہے' انہوں نے آپ کو کوئی کال نہیں کی۔ آپ بتائیں' کچھ ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔ آپ وارث ماموں کے ٹارگٹ کیس کی فائلز نکلوا رہی تھیں۔ کیا آپ کسی کو کور کر رہی ہیں؟ کیا کوئی آپ کو یہ سب کہنے پہ مجبور کر رہا ہے؟" یہ خدشہ ہاشم نے راستے میں ظاہر کیا تھا' یونہی سرسری سا' مگر سعدی کے ذہن میں اس نے جڑ پکڑ لی۔

زمر کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابی سی نمی اتری۔ لب بھینچ گئے۔

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

"زمر! آپ مجھے سب کچھ سچ کیوں نہیں بتاتیں؟" اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے سعدی! وہ کیا تکلیف ہے جو میں نے پچھلے کچھ دنوں میں سہی ہے؟ میرے گردے ضائع ہو گئے ہیں' میرا باپ مفلوج ہو گیا ہے' میری زندگی کی ساری امیدیں ٹوٹ گئی ہیں' میں کبھی نارمل نہیں ہو سکوں گی' ایسے وقت میں بھی تمہیں لگ رہا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں' تمہیں فارس زیادہ قابل اعتبار لگ رہا ہے! کیا تم مجھے نہیں جانتے؟" وہ متحیر' بے یقین تھی۔

"میں آپ کو جانتا ہوں اسی لیے کہہ رہا ہوں آپ کوئی بات مجھے نہیں بتا رہیں' آپ کچھ چھپا رہی ہیں' کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہے۔ علیشا کہہ رہی ہے' حنین کہہ رہی ہے' ماموں ان کے ساتھ تھے' انہوں نے کوئی کال نہیں کی' وہ تین لوگ جھوٹ نہیں بول رہے" وہ ناراضی سے اسے دیکھ کر تیزی سے بولا۔

زمر کے ابرو غصے سے اکٹھے ہوئے۔ اس نے کہنیوں کے بل قدرے اٹھنے کی کوشش کی۔

"ہاں ٹھیک ہے' وہ سب سچ بول رہے ہیں' ایک میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تمہیں نہیں کرنا میرا اعتبار مت کرو۔ لیکن میں دنیا کی ہر عدالت میں جا کر اس کے خلاف گواہی دوں گی۔ میں پوری دنیا کو بتاؤں گی کہ کس طرح اس نے میرے اوپر گولی چلائی' اپنی بیوی کو مارا' اپنے بھائی کو مارا' میری زندگی برباد کر دی!"

سعدی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"آپ کو پتا ہے' آپ کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے زمر؟ جب آپ کے دماغ کی سوئی ایک بات پہ اٹک جاتی ہے تو پھر وہ وہاں سے نہیں ہٹ سکتی' آپ اس کے آگے پیچھے ہر قسم کی سوچ کا دروازہ خود پہ بند کر لیتی ہیں۔ ہو سکتا ہے' آپ بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے؟ تمہیں میرے سچ بولنے میں شک ہے!" وہ بے یقینی سے غرائی تھی۔

"لیکن زمر! میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ کوئی تیسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کیوں ٹھنڈے دل سے اس بات پہ نہیں سوچتیں۔ ایک دفعہ فارس غازی کو بے گناہ تصور کر کے سوچیں۔ ہو سکتا ہے کسی نے انہیں پھنسایا ہو۔ یہ سب ایک سیٹ اپ ہو اور کچھ بھی نہ ہو۔ آپ ایک دفعہ.... صرف ایک دفعہ اپنے مفروضات کو پیچھے کیوں نہیں کر لیتیں؟ اگر واقعی آپ کسی کے دباؤ میں نہیں ہیں تو......"

"مفروضات!" وہ چلائی تھی "میں کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں میں نے اس کی آواز سنی ہے' اس کا فون آیا تھا مجھے' اس نے مجھ پہ گولی چلائی' میں فارس کی آواز کو پہچانتی ہوں' میں جانتی ہوں وہ فارس ہی تھا۔ ہر چیز کی سینس بنتی ہے سوائے اس کے کہ تم میری بات سننا نہیں چاہتے' تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں ہے۔ ٹھیک ہے سعدی! مت کرو مجھ پر اعتبار لیکن ایک وقت آئے گا جب عدالت اس کو سزا سنائے گی اور جب وہ مجرم ثابت ہو گا اور وہ خود اعتراف جرم کرے گا۔ تب میں تم سب کے چہرے دیکھنا چاہوں گی۔ تم' حنین' بھابی' کوئی بھی میری بات پہ یقین نہیں کر رہا۔ میں جانتی ہوں' لیکن تم لوگ دیکھو گے' ضرور دیکھو گے!"

تیز تیز بول کر وہ ہانپنے لگی تھی۔ سر تکیہ پہ گرا لیا۔ سعدی خفگی سے پیچھے ہوا۔

"ایک یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے آپ کا۔ آپ کسی دوسرے کی کوئی بات سمجھتی نہیں ہیں۔ آپ سمجھنے کے لیے بات نہیں سنتیں' آپ جواب دینے کے لیے بات سنتی ہیں' آپ اپنے خیالات میں اتنی فکسڈ ہو جاتی ہیں کہ آپ کسی نئے تصور کے لیے اپنا ذہن کھلا نہیں رکھتیں۔ آپ کو خود بھی پتا ہے کہ آپ غلط کہہ رہی ہیں مگر......" اور زمر کے لیے یہ بہت تھا۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے! ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے چلاتے ہوئے بازو اٹھا کر کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ سعدی بھی غصے سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنی ضدی کیوں ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بات کیوں نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"آپ کو صرف اس بات کا غصہ ہے کہ میں نے آپ کو یہ کیس لینے کے لیے کیوں کہا۔ یہ کہ اس کیس کی وجہ سے آپ کی شادی ڈیلے ہو رہی تھی۔ آپ اس کیس کا غصہ فارس ماموں پہ نکال رہی ہیں اور کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ایک دفعہ پھر وہی کر رہی ہیں۔ ان کی بیوی کا قتل ہوا ہے' ان کے بھائی کا قتل ہوا ہے' ہمارا خاندان تباہ ہو چکا ہے اور آپ اپنی ضد کو لے کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ زمر! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟"

"نکل جاؤ میرے کمرے سے اور دوبارہ مت آنا۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی اس وقت۔ جاؤ سعدی!" وہ زور سے چلائی۔

(باقی آئندہ ماہ)

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الھڑسی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا کر دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آجاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ابیہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی

دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے' ان سے پیسے بٹور کر بلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب' معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کر پاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کر کے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار مقرر کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سیخ پا ہوتی ہیں۔ معیز' ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون' معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی' ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم' ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے' جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً" سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد' ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پرانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کر دیتی ہے مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا' ثانیہ کو فون

کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم' حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے' مگر ثانیہ' ابیہا کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں' مگر معیز سمیت زارا اور ایزد انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے' مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

پندرھویں قسط

ابیہا تو مڑ کر دیکھنے پر پتھر بنی ہی تھی۔ اندر داخل ہوتی رباب کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ **ابیہا** مراد اس گھر میں ہو سکتی ہے۔

دفعتاً" حواس میں لوٹتے ہوئے **ابیہا** جلدی سے نذیراں کے پیچھے لپک کر دروازہ دھکیلتی اندر چلی گئی۔

"آئی ڈونٹ بلیو دس..." رباب جو اپنی جگہ ٹھٹک گئی تھی۔ بڑبڑائی اور سن گلاسز بالوں پہ اٹکاتی تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔

ادھر اندر داخل ہوتے ہی لاؤنج میں براجمان سفینہ بیگم نے **ابیہا** کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"کیا ڈھکوسلے بازیاں کر رہی ہو تم... ذرا سا کام کیا نہیں اور بستر پہ جا لیٹیں..."

وہ اس پر گرجیں۔ ان کا پروگرام لمبا ہی تھا مگر زارا افتاں و خیزاں اپنے کمرے سے باہر آئی۔

"ماما پلیز... رباب آئی ہے باہر۔ اس معاملے کو فی الحال رفع دفع کریں۔" زارا اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھ کر آئی تھی۔ اس نے بعجلت کہتے ہوئے کوریڈور کی طرف قدم بڑھائے۔

"کچن میں جاؤ اور اچھی سی چائے کا اہتمام کر کے لاؤ مہمان کے لیے۔ باقی کا معاملہ میں بعد میں نپٹاؤں گی تم دونوں کے ساتھ۔ چھوڑوں گی تو نہیں میں بھی۔"

سفینہ نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نذیراں کو بھی ساتھ گھورتے ہوئے کرختگی سے آرڈر دیا تو وہ دونوں جلدی سے منظر سے ہٹ گئیں۔

"لو جی تساں دے نال مینوں خوامخواہ پیسے جا رہے ہیں بیگم صاب۔" نذیراں کا موڈ سخت آف تھا۔ کچن میں آتے ہی اس نے **ابیہا** پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو وہ برافروختہ ہونے لگی۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"میں تاں تساں دا ساتھ دین دی گناہگار ہاں بس۔" اسے اپنی نوکری جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ پٹخ کر ساس پین چولہے پر رکھا اور آگ جلانے لگی۔ بخار سے ابھی ابھی اٹھنے والی **ابیہا** کا سر چکرانے لگا تو لڑکھڑا کر کرسی کا سہارا لے لیا۔

نذیراں نے بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ دل کی اچھی تھی' اس کی زرد پڑتی رنگت دیکھ کر فوراً" آگے بڑھی اور اسے پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بٹھا دیا۔

"بیگم صاب نوں ہن کون سمجھائے۔ پتا نہیں کس گل دا غصہ اے اوس نوں۔" نذیراں بڑبڑاتے ہوئے چائے بنانے لگی۔
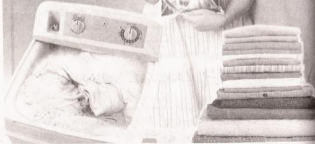
اس دوران رباب نے زارا کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔
"بے وقت تو نہیں آگئی میں... کوئی گیسٹ آئے ہوئے ہیں؟" رباب نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔
"نہیں، نہیں گیسٹ تو کوئی بھی نہیں آیا۔" زارا نے حیرانی سے کہتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
وہ صوفے پر بڑے انداز سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ایمہا کو اندر آتے دیکھا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ نظرانداز کر دیتی۔
مگر اس نے ایمہا مراد کو دیکھا تھا۔ جو کبھی کالج میں اس کی حریف رہی تھی۔
"نہیں یار! ابھی میں نے ایمہا مراد کو اندر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔ کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔"
رباب نے صاف گوئی سے کہا تو سفینہ بیگم چونکیں مگر زارا تو دھک سے رہ گئی۔ اس نے بے اختیار ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن نے تیزی سے کام کیا تھا، سفینہ بیگم کی زبان حرکت میں آتی تو جانے کیا کچھ کہہ ڈالتیں۔ ان سے پہلے زارا کو بات سنبھالنا تھی۔
"ارے وہ... وہ تو میں نے تمہیں بتایا تھا نا عون بھائی کی کزن ہے دور پار کی۔ تو... بے چاری کے والدین نہیں تھے۔ ضرورت مند تھی تو ہماری انیکسی میں —— رہ رہی ہے۔" وہ بعجلت بولی اور ساتھ ہی مسکرانے کی بھی کوشش کی۔
"اوہ... آئی سی۔" رباب کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیلی۔ سفینہ بیگم نے اپنی تیوری کے بل مشکل سے کنٹرول میں کیے تھے۔
"مگر وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے... ابھی میں نے اسے آتے دیکھا تھا؟" رباب نے دل کے تجسس کو زبان دے دی۔
زارا نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر اس سے پہلے ہی سفینہ بیگم بول اٹھیں۔
"وہ میں تمہیں بتاتی ہوں بیٹا۔"
زارا نے ہول کر ماں کا سنجیدہ چہرہ دیکھا، رباب بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھی۔

✡ ✡ ✡

غصہ، ٹینشن اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی، ثانیہ کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں۔ اچھی بھلی سمجھ دار لڑکی، جذباتیت کا شکار ہو چلی تھی۔
رات ارم دیر سے کمرے میں آئی۔ ثانیہ کمبل میں منہ سر لپیٹے پڑی رہی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ارم کی شکل بھی دیکھے۔ عون سے اس کے تعلقات یہاں آنے سے پہلے بھی کچھ خاص قابل ذکر نہ تھے، مگر یہاں آنے کے بعد تو اور خرابی ہوئی تھی۔
"اچھا ہے۔ یہاں سے ثبوت لے کے لوٹوں گی تو سب کو یقین آئے گا کہ ثانیہ سچّی تھی۔" وہ کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی۔
اور اس ذہنی بوجھ نے اگلے دن اسے حرارت میں مبتلا کر دیا۔ وہ کافی دیر تک نہیں اٹھی تو نیلم خود اسے جگانے چلی آئی۔ اس کی آواز پر ثانیہ جاگ تو گئی، مگر یونہی کسلمندی سے پڑی رہی۔

"آجائیں نا... مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ نازو آپی کے ساتھ آخری ناشتہ۔" نیلم خود ہی کہہ کر ہنسی۔
"لگتا ہے مجھے بخار ہو گیا ہے۔" ثانیہ نے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اطلاع دی تو نیلم نے بے ساختہ اس کے ماتھے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔
"ہاں... واقعی۔ آپ اٹھ کے منہ ہاتھ دھولیں۔ میں آپ کا ناشتہ یہیں لے آتی ہوں اور ساتھ میں کوئی ٹیبلٹ بھی۔" نیلم نے پیار سے کہا تھا۔
"ناشتہ نہیں صرف چائے۔" ثانیہ نے ٹوکا۔
"اونہوں... خالی پیٹ چائے پئیں گی؟ میڈیسن بھی لینی ہے تو چائے کے ساتھ دو رسک لے لیں۔" نیلم نے قطعیت سے کہا تو ثانیہ نے آنکھیں موندلیں۔ نیلم نے جانچتی نظروں سے ثانیہ کو دیکھا۔
"جب آپ آئی تھیں تو بڑی فریش اور زندہ دل تھیں۔ اب تو بڑی ڈل سی ہو گئی ہیں۔"
ثانیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ نیلم کے چہرے پر مخلصی تھی۔ ارم جیسی مطلب پرستی اور خود پسندی کا نشان تک نہ تھا۔
"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟" نیلم نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں... پوچھو۔" ثانیہ ہلکا سا مسکرا کر بولی۔
"آپ کی عون بھائی سے رات کے فنکشن میں لڑائی ہوئی ہے؟" نیلم نے جو پوچھا' وہ ثانیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹی۔
"ارم نے تفصیل بتادی تھی مجھے۔"
نیلم کو پتا تھا کہ وہ کھل کے بات نہیں کرے گی' سو اس نے محتاط لفظوں میں کہا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ ارم نے رات سب کے درمیان بیٹھ کر کس طرح مذاق اڑاتے ہوئے ثانیہ کی عون سے بدتمیزی کا واقعہ سنایا تھا اور تائی جان نے ثانیہ کے لیے کتنے ہتک آمیز الفاظ استعمال کیے تھے جن سے ارم کو اور شہہ ملی تھی۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو عون بھائی سے مسئلہ کیا ہے۔ آئی مین وہ اتنے کیئرنگ ہیں۔" نیلم سنجیدہ تھی۔
ثانیہ نے تولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ جس انداز میں نیلم نے بات شروع کی تھی' اس کے بعد ثانیہ اسے "بچی" کہہ کر بات ٹال نہیں سکتی تھی۔
"وہ اس رشتے پر راضی نہیں تھا نیلم..." ثانیہ نے تنے ہوئے تاثرات کے ساتھ کہا۔
"مگر پھر وہ راضی ہو گئے تھے آپی۔" نیلم بے ساختہ بولی۔
"ہاں ہو گیا تھا راضی۔ میری عزت نفس کو روندنے کے بعد۔" ثانیہ نے استہزا سے کہا۔
"وہ آپ کے شوہر ہیں' منگیتر نہیں ہیں آپی! کہ جن کی ذرا سی بات کو دل پہ لے کر آپ رشتہ توڑنے کا سوچنے لگیں۔"
"اس نے مجھ سے شادی توڑ کر ارم سے شادی کرنے کا کہا تھا یہ بات تمہیں پتا نہیں ہے شاید۔" ثانیہ نے تلخی سے اسے باور کرایا۔
"وہ واقعہ تو سب ہی نے سنا ہوا ہے... یہ ٹھیک ہے کہ جلد بازی میں عون بھائی سے غلطی ہو گئی' مگر پھر انہیں فوراً ہی اپنی اس جلد بازی میں کی گئی غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ اور میرے خیال میں انہوں نے آپ سے سوری کہہ دیا ہوگا۔" نیلم نے ہلکے پھلکے انداز میں گویا بات ہی ختم کر دی۔ ثانیہ تو تڑپ ہی اٹھی۔

"ہر غلطی کا مداوا' سوری کہنے سے نہیں ہو جاتا۔"
"مگر میری سوچ کچھ اور کہتی ہے آپی۔ غلطی کر کے ڈھٹائی سے اس پہ جمے رہنا سب سے بڑی غلطی ہے۔ مگر غلطی کا احساس ہوتے ہی جو جھک کر غلطی کا اعتراف کرلے تو میرے خیال میں اسے معاف کرنے میں تو ایک منٹ بھی نہیں لگانا چاہیے۔"
"اس نے میری انا' میری عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائی ہے نیلم۔"
"اور وہ جو اتنے عرصے سے اپنی انا اور عزتِ نفس کے سر پہ پاؤں رکھے آپ کا دل صاف کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اس کا کیا؟ آپ کو ان کے انداز سے لگتا ہے کہ ان کا ارم سے افیئر رہا ہو گا؟"
نیلم نے سنجیدگی سے سوال کیا تو وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔
"مرد اسی عورت کے پیچھے بار بار اور لگاتار جاتا ہے جو اس کے دل میں اتر جاتی ہے آپی... اور ایک بار "دل میں" اترنے کے بعد مرد کے "دل سے" اتر جانا... اس سے بڑا تو دنیا میں اور کوئی نقصان ہی نہیں۔"
نیلم یقیناً دل سے اس کے ساتھ مخلص تھی۔ ورنہ اس وقت جب کہ ثانی بصد شوق اپنی نیا آپ ڈبونے کی کوشش میں تھی' وہ بھی دوسروں کے ساتھ جا کھڑی ہوتی۔ مگر وہ واقعی ثانیہ کو تباہی سے بچانا چاہتی تھی۔ نیلم اٹھ کھڑی ہوئی۔
"عون بھائی آپ کے ہیں اور آپ ہی کے رہیں گے اگر آپ اپنی آنکھوں پر سے بدگمانی کی پٹی اتار دیں گی تو۔"
نیلم اسی سنجیدگی سے کہتے ہوئے رکی۔
"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلہ ہو یا جذباتی... اس "درمیان" کو شیطان بڑے حیلوں اور وسوسوں سے پر کرتا ہے۔"
ثانیہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ نیلم نے ہلکی سی سانس اندر کھینچی' پھر نرمی سے بولی۔
"آپ فریش ہو جائیں۔ میں آپ کے لیے ناشتہ اور میڈیسن لاتی ہوں۔"
اس کے جانے کے بعد بھی کتنی ہی دیر ثانیہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ ذہن میں چلتے جھکڑ اس کی سوچ کو کسی ایک بھی نقطے پر مرتکز ہونے نہیں دے رہے تھے۔
مگر یہ تو طے تھا کہ نیلم نے راکھ کریدی تو اندر سے راکھ کا سینہ ابھی بھی سلگتا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

نذیراں چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی چلی آئی تو بات بیچ ہی میں رہ گئی۔
"ابیہا کہاں ہے... اسے کہا تھا میں نے چائے لانے کو۔"
سفینہ بیگم نے تحکمانہ انداز میں کہا۔
"اوس دی تے طبیعت خراب اے بیگم صاب۔" نذیراں نے ادب سے عرض کیا۔
"تم دونوں کی طبیعت تو میں ٹھیک کروں گی بعد میں۔ بلاؤ اسے۔" سفینہ بیگم نے دانت کچکچا کر کہا۔
انہیں تو رات سے ابیہا پر غصہ تھا۔ نذیراں بھاگ کر گئی اور ابیہا کو بلا لائی۔
"کیا بات ہے۔ تمہارے بڑے نخرے ہو گئے ہیں۔ اول روز سے تمہاری ڈیوٹی سمجھادی تھی تمہیں۔ کام ویسے کے ویسے پڑے ہیں اور محترمہ سیریں کرتی پھر رہی ہیں گاڑیوں میں۔" سفینہ بیگم گرجیں۔

ایبہا سے نظر نہیں اٹھائی گئی۔ وہ بنا دیکھے بھی بتا سکتی تھی کہ رباب اس وقت مسکرا رہی ہوگی۔

"کیا مطلب آنٹی۔ کیا ڈیوٹی ہے اس کی؟" رباب کی حیرت زدہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ زارا نے تنبیہی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ اسے رباب کے سامنے ایبہا کی گوشمالی پسند نہیں آرہی تھی۔

"کام کرتی ہے ہمارے گھر کا۔ نذراں کے ساتھ مل کر۔" سفینہ بیگم نے اطمینان سے رباب کو اس کا "رینک" بتایا۔ تو وہ بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔ ایبہا کو دیکھا جس کی رنگت میں زردی سی گھل گئی تھی اس کے دونوں ہاتھوں نے صوفے کی پشت کو دبوچ رکھا تھا۔

وہ شرمسار تھی..... یا شرم سے مرجانے کو۔

"یو مین..... نوکرانی ہے آپ کی؟"

رباب نے سراسر حیرانی کی ایکٹنگ کی۔ سفینہ بیگم سے کنفرم کیا تو انہوں نے تفاخرانہ اثبات میں سر ہلایا۔

"چہ..... چہ اور اس "جاب" کے لیے تم کالج میں میرے مقابلے پر اتر آئی تھیں۔ یہ تھا ایک پوزیشن ہولڈر کا مستقبل۔" اس نے استہزائیہ نظروں سے ایبہا کو دیکھتے ہوئے "بھالے" چبھونے شروع کیے۔

وہ زمین میں گڑ رہی تھی..... مگر گڑنا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی آنسو پیتے ہوئے بڑی ہمت کے ساتھ پھیکے لہجے میں بولی۔

"بدنصیبی ڈگریاں دیکھ کر نہیں آیا کرتی رباب! اور نہ ہی ہر خوش نصیبی پوزیشن ہولڈرز کا مستقبل بنتی ہے۔ یہ تو نصیب بلکہ بڑے ہی نصیب کی بات ہوتی ہے۔"

"اچھا' اچھا۔ اب یہ فلسفہ لپیٹو اور رباب کے لیے چائے بناؤ۔" سفینہ بیگم اسے اچھی طرح ذلیل کرنا چاہتی تھیں۔

وہ چائے پیالیوں میں نکال رہی تھی جب معیز احمد اندر داخل ہوا اور اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔ ایبہا کا ہاتھ لرزا اور چائے پرچ میں گری۔

ایبہا نے چائے کی پیالی رباب کی طرف بڑھائی۔ معیز اس کی پشت کی طرف کھڑا تھا۔ ایبہا کو پہچان نہیں پایا۔ بڑے فریش انداز میں رباب سے بولا۔

"میں نے کہا تھا میں راستے سے پک کرلوں گا تمہیں' دس منٹ ویٹ تو کرتیں۔"

"آئی نو۔ یو آر سو کیئرنگ معیز۔ لیکن میں بہت نزدیک آئی ہوئی تھی اور پھر گاڑی بھی تھی میرے پاس۔" وہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"اوکے نیکسٹ ٹائم....." وہ مسکرا رہا تھا۔ ایبہا کو اس کی آواز سے اندازہ ہوا۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں لرزتے محسوس ہونے لگے۔

"بھئی مجھے آپ کی کام والی بہت پسند آئی ہے معیز۔" رباب کی اگلی بات نے جہاں ایبہا کا حلق خشک کیا وہیں معیز بھی چونکا۔

"اتنی پڑھی لکھی بلکہ پوزیشن ہولڈر کام والی کہاں ملتی ہے آج کل۔" وہ محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سفینہ بیگم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ ترچھی نگاہوں سے معیز کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھیں۔ ایبہا نے خاموش بیٹھی زارا کو چائے تھمائی اور پلٹی تب معیز نے اسے دیکھا اور لحہ بھر کو سن ہو گیا۔

"کیا پے کرتی ہیں مہینے کا آنٹی؟" رباب لطف لے رہی تھی۔ یہ وہ کمینگی بھرا لطف تھا جو پڑھائی کے مقابلے میں وہ کبھی حاصل نہیں کرسکی تھی۔

"ارے نہیں رباب! ایکچوئیلی ایبہا ملازمین کو سپروائز کرتی ہیں۔ تمہیں بتایا تھا نا۔ عون بھائی کی کزن ہیں یہ۔" زارا سے مزید برداشت نہیں ہوا تو بول اٹھی۔

سفینہ بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اور جتاتے ہوئے کہا۔

"کام والی تو کام والی ہی ہوتی ہے زارا۔ ہیڈ ہو چاہے اسسٹنٹ۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی!" رباب نے لقمہ دیا تھا۔ معیز تو گویا کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ وہ تجزیہ کی پہلی منزل پہ تھا اسے یہ کمنٹ اچھے لگ رہے ہیں یا برے؟

جواب حیرت انگیز۔

اسے یہ سب تماشا اچھا نہیں لگ رہا تھا یعنی برا لگ رہا تھا؟ تو حاصل جمع کیا رہا؟

وہ خود شناسی کے دقیق سوالوں میں الجھا ہوا تھا' حواس میں لوٹا تو ایبہا کو تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کے جاتے دیکھا۔

"اے لڑکی....." سفینہ بیگم کی کرخت آواز..... مگر وہ پلٹ کر نہ دی تھی۔

"اوہو۔ بڑا نخرا ہے اس کا۔ کالج میں بھی ایسی ہی تھی بظاہر معصوم اور خاموش مگر اندر سے پوری تھی۔" رباب نے نخوت سے کہا۔

معیز عجیب سی کیفیت کا شکار اٹھ کھڑا ہوا۔

"دیکھ رہے ہو تم اس لڑکی کی اکڑ معیز۔ نکال باہر کروں گی میں اسے' پھر مت کہنا مجھے مجھ سے یہ بدتہذیبی ذرا بھی برداشت نہیں ہوتی۔" سفینہ بیگم نے سرد لہجے میں اسے سنایا۔

"میں فریش ہو کے آتا ہوں۔"

معیز اس فضا سے نکلنا چاہتا تھا۔ معذرت خواہانہ کہتا فی الفور اوپری سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دل کی عجیب کیفیت پتا نہیں کیا تھی' گھبراہٹ یا پھر غصہ..... یا بیچ کی کوئی کیفیت۔ دل کو ویران اور اداس کردینے والی۔

اس نے واش بیسن کا نل کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تو جلتی آنکھوں کو قرار سا آگیا۔

تولیہ سے منہ پونچھتے چند گہری سانسیں لے کر اس نے اندر کی کثافت کو کم کرنے کی کوشش کی اور پھر خود کو تھوڑا بہتر محسوس کیا۔

"کام ڈاون معیز احمد۔ اس لڑکی کے ساتھ تمہارا صرف مجبوری کا رشتہ ہے۔ اسے سر پہ سوار مت کرو۔" اس نے اندر کے بیدار ہوتے اچھے معیز کو سلانے کی خاطر تھپکنا شروع کیا۔

"یہ وہ لڑکی ہے۔ جس کی وجہ سے میں اپنی ماں کی نگاہوں میں گر گیا۔ بھائی بہن کے سامنے شرمندہ ہوا۔ میں اپنی زندگی کا فیصلہ آزادانہ نہیں کرسکتا' جب تک کہ اس کا دم چھلا میرے ساتھ ہے۔" اس نے تلخی سے سوچنا چاہا۔

مگر اسے حیرت ہوئی..... یہ جان کر کہ اسے اس سارے قصے سے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ خود کو تھپک کر بھی سکون محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"فارگیٹ اٹ۔ میں نے تو اسے آزادی دے رکھی ہے' وہ اپنی زندگی کا اچھا سا فیصلہ کرلے اور جائے یہاں سے میں تو آئندہ زندگی میں صرف رباب کو ہم سفر دیکھنا چاہتا ہوں..... شاید۔"

وہ ذہن سے ایبہا مراد کو جھٹکنے کی خاطر مستقبل کا نقشہ کھینچنے بیٹھا تو وہ بھی نامکمل نکلا۔ دل میں رہنے والے تو کئی ہوتے ہیں مگر جس کے حوالے یہ دل کیا جاتا ہے وہ بہت خاص ہوا کرتا ہے۔

تو کیا رباب احسن اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی تھی؟ معیز خود بھی الجھن کا شکار تھا۔

رباب چائے کے بعد خوش گپیاں لگانے کے بعد رخصت ہوئی تو معیز اسے گیٹ تک چھوڑ کے آیا۔
"رات تم کہاں گئے تھے اس حرافہ کو لے کر؟"
لاؤنج میں آتے ہی سفینہ بیگم نے اونچی آواز میں پوچھا تو وہ ٹھٹک گیا۔
"ماما..." زارا نے احتجاجاً انہیں آہستہ سے پکارا۔
"ماما کا گلا گھونٹ دو تم لوگ تاکہ تم لوگوں تک میری آواز نہ پہنچ سکے۔" وہ غصے سے بولیں۔
"ماما... اسے بخار تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ حالت بہت خراب تھی اس کی۔" وہ چور سا ہو گیا۔
"مر تو نہیں رہی تھی نا وہ۔ دیکھ لو دندناتی پھر رہی ہے میرے سینے پر۔"
"ماما پلیز اب جب تک وہ یہاں ہے 'لاوارثوں کی طرح تو نہیں پھینک سکتے نا۔" زارا کا دل ماں جیسا سخت نہیں تھا۔ بلکہ اسے تو خاموش طبع سی وہ لڑکی بے ضرر ہی لگی تھی۔
"ہاں تو کہو اپنے بھائی سے 'باپ کی طرح یہ بھی اس کا پکا والی وارث بن جائے۔" وہ تڑخیں۔
"فار گاڈ سیک ماما۔ انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" معیز نے عاجز آکر کہا۔
"مجھے مت پڑھاؤ۔" وہ حقارت سے بولیں۔
"طبیعت نہیں 'اس لڑکی کی نیت خراب ہے۔ جب تک اس کے منہ پہ طلاق کے تین لفظ نہیں مارو گے' وہ کبھی یہاں سے ہلے گی بھی نہیں۔ ارے تمہارے باپ کو کیا کہوں میں۔ پچاس لاکھ ڈلوا گیا اس کے اکاؤنٹ میں۔ مانو شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ لاکھوں کی آسامی ہو تم۔ اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑے گی وہ بھی۔" معیز کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔
"بے فکر رہیں آپ اتنی "قابل" نہیں ہے وہ۔ کہ ایسی بڑی بڑی پلاننگز کر سکے۔"
"تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے بھی کرنے دو جو میں کر رہی ہوں۔ خبردار جو کوئی بیچ میں بولا ہو تو۔" انہوں نے غرا کر کہا تھا۔
معیز کا تو سر پھٹنے لگا۔
"آپ جو جی میں آئے کریں۔ میں کچھ نہیں کہوں گا آپ کو۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔
"ماما۔ اگر اس سارے معاملے کی اصلیت کا رباب کو علم ہو گیا تو قیامت آجائے گی۔"
"اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ یہ منحوس لڑکی اس گھر سے دفع ہو جائے۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ایک طرف تو یہ لڑکا رباب کے ساتھ پینگیں بڑھا رہا ہے اور دوسری طرف اس لڑکی کو بھی طلاق نہیں دے رہا۔ جانے اس کے دل میں کیا ہے۔" سفینہ بیگم نے سر تھام لیا۔
"میں ویسے ہی اس چکر میں پڑی۔ اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ بھائی نکاح کر چکے ہیں تو میں انہیں رباب کی طرف بڑھنے نہ دیتی۔"
زارا کو اپنی فکر تھی۔ رباب اس کی نک چڑھی بلکہ "سر چڑھی" نند تھی اور اس کی ضد اور ہٹیلے پن کے قصے وہ سفیر کی زبانی سنتی رہتی تھی۔
معیز کمرے میں آکر بھی بے چین ہی رہا۔
زندگی کے اس موڑ نے تو اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ ہر پل زندگی کا مزہ چکھنے والے کو زندگی مزہ چکھانے پہ تُل گئی تھی۔
کتنی ہی دیر وہ آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کرتا رہا۔ مگر ہر منصوبے کے آخر میں اسے احساس ہوتا کہ امتیاز احمد کی وصیت اس کے پیروں کو وزنی بیڑیوں کی مانند جکڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک قدم اٹھانے لائق بھی نہیں رہا تھا۔
وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

✡ ✡ ✡

آج بہت دنوں کے بعد اس نے ثانیہ کو کال کی تھی۔
"کیسی ہو...؟" ثانیہ نے پوچھا تو وہ یاسیت سے بولی۔
"میں تو ٹھیک ہوں مگر آپ تو وہاں پہ جا کے مجھے بھول ہی گئی ہیں۔ شادی کیسی جا رہی ہے؟"
"ہوں... یہاں آکے تو میں اپنے آپ کو بھی بھول گئی ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔
"جی...؟" ایہا نے حیرانی سے کہا تھا۔
"اور سناؤ... سب ٹھیک چل رہا ہے نا؟"
جواباً بھرا ہوا دل لیے ایہا نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا تو وہ دنگ رہ گئی۔
"اوہ گاڈ۔ یار! ایسے سنگ دل لوگ بھی بستے ہیں اس دنیا میں۔ تمہاری ساس نہ سہی مگر معیز بھائی کو تو ضرور احساس کرنا چاہیے تھا۔"
"ان کے احساس اور احسان کی بدولت ہی تو سر چھپانے کا ٹھکانا ملا ہوا ہے مجھے۔" وہ ان حالات میں بھی معیز کی ممنون تھی۔ مگر ثانیہ چلا ہی تو اٹھی۔
"احسان...؟ کون سا احسان بے وقوف لڑکی...؟ اپنے حصے کی جگہ پہ بیٹھی ہو تم۔ اور... اب تمہیں میں کیا کہاوں ایہا۔ اتنا روپیہ ہے تمہارے اکاؤنٹ میں اور تم ان لوگوں کی چاکری کر رہی ہو۔"
"تو میں اور کیا کروں... آنٹی مجھے نکال دیں تو میں کہاں جاؤں گی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"اللہ پہ توکل کرو۔ آنٹی پہ نہیں۔" ثانیہ نے اسے ٹوک دیا۔ "اللہ کی مدد سے اس کی مہربانی سے تم یہاں موجود ہو' ورنہ اس گھر کے لوگ تو تمہیں گیٹ سے پاؤں بھی اندر رکھنے نہ دیتے۔ باوجود اس کے کہ تم معیز احمد کی منکوحہ ہو۔" ثانیہ نے اسے آئینہ دکھایا تھا۔
"اب میں کیا کروں ثانیہ۔ میری عزت نفس مر رہی ہے۔ لحہ بہ لحہ میں مٹی ہو رہی ہوں۔ آج رباب کے سامنے آنٹی نے جو کہا..." رندھے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آواز کھو گئی۔
"سب سے پہلے تو تم صبح سے ان کے گھر جانا بند کرو۔ کوئی کام نہیں کرو گی تم وہاں کا۔"
ثانیہ نے سختی سے کہا تو وہ رونا بھول کر پریشان ہونے لگی۔
"آنٹی ناراض ہو جائیں گی ثانیہ۔"
"پہلے کون سا راضی ہیں۔ تھوڑی سی اور ناراض ہو جائیں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" ثانیہ نے لاپروائی سے کہا۔ پھر بولی۔
"تم ان سے صاف لفظوں میں کہہ دینا کہ تم کام نہیں کرنا چاہتیں اور نہ ہی تمہیں تنخواہ کی ضرورت ہے اور یہ بھی کہ اب تم کالج جا کر اپنا گریجویشن مکمل کرنے والی ہو۔"
"واقعی..." ایہا کا دل کھل اٹھا۔ مگر ساتھ ہی اپنی پوزیشن کا خیال آگیا۔
"میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں ثانیہ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"
"تم صرف کام سے انکار کرو۔ کل شام کی فلائٹ سے میں واپس آرہی ہوں باقی سارا میرا درد سر ہے۔ میں خود

تمہارا ایڈمیشن کرواؤں گی۔" ثانیہ نے کہا۔ تو ایبہا کے دل کو اس کی واپسی کا سن کر یک گونہ سکون ملا۔

"اگر معیز نے اعتراض کیا تو....؟" وہ جھجک کر بولی۔

"اعتراض اس شخص کے مانے جاتے ہیں جو خود رائٹ پہ ہو۔ جن کے اپنے قول و فعل میں تضاد ہو' وہ کیا کسی پہ اعتراض کریں گے۔"

ثانیہ نے کوئی خاص اثر نہیں لیا تھا۔ اسے سمجھاتی رہی اور آخر میں جو اس نے کہا وہ ساری بات چیت پر بھاری تھا۔

"پڑھو لکھو اور اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو کر سب کو بتا دو ایبہا کہ ہر شخص اپنا نصیب لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کسی کے والدین اچھے نہ ہوں تو ضروری نہیں کہ اولاد بھی بری ہی ہو گی۔ اور معیز احمد کو بھی تو پتا چلے کہ اسے جس "سہارے" پر بہت گھمنڈ ہے' تم اس کے بغیر بھی اس معاشرے میں سروائیو کر سکتی ہو۔"

"میں نہیں کر سکتی ثانیہ۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ اس کا دل تو ثانیہ کی باتیں سن سن کر ہی گہری کھائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ جب عمل کا وقت آتا تو وہ کیا خاک کر پاتی۔

"تم کرو گی بیا۔ ورنہ یہ لوگ تمہاری عزت نفس کو تار تار کر دیں گے۔ اگر سر اٹھا کے نہیں جیو گی تو یہ لوگ ہمیشہ تمہارے ماں باپ کو گالی دیں گے۔ اپنے آپ کو' اپنے ماں باپ کو گالی مت بننے دو ایبہا۔"

ثانیہ نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا تو ایبہا کی رگوں میں دوڑتا خون یک لخت تپنے لگا۔

"میں نہیں بننے دوں گی ثانیہ۔"

"تم بہت مضبوط ہو ایبہا۔ تمہارے پاس صحت ہے' خوب صورتی ہے اور اب پیسہ بھی ہے۔ تم کیوں ڈرو کسی سے۔" ثانیہ نے اسے شاباش دی تھی۔

"اور اگر..... معیز نے مجھے چھوڑ دیا تو.....؟" وہ دھیمی پڑ گئی۔

"اس شخص نے تمہیں اپنایا ہی کب ہے ایبہا۔ محض ایک کاغذی کارروائی کی تھی اور اب اس سے بھی جان چھڑانا چاہ رہا ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ اللہ نے تمہیں رہنے کا ٹھکانا اور پیسہ دے دیا ہے' تمہاری زندگی کی راہیں متعین ہو گئی ہیں۔ اپنی حکمت عملی بناؤ۔ زندگی میں جو بننے کا خواب دیکھا تھا' اسے مکمل کرو۔ زندگی معیز احمد ہی کا نام نہیں ہے ایبہا۔"

ثانیہ نے اس پہ اپنا اچھا خاصا دماغ خرچ کیا تھا اور ہر بات اس کی سمجھ میں بھی آئی تھی اور ہر بات دل پہ بھی لگی تھی۔ ماسوائے آخری بات کے۔

"وہ میری زندگی میں آیا تو میری زندگی کو ایک نیا رخ' ایک نیا موڑ ملا..... تم کیسے کہتی ہو کہ وہ زندگی نہیں ہے؟"

رات بستر پہ لیٹے ثانیہ کی باتوں کو سنجیدگی سے قابل عمل گردانتے ہوئے ایبہا نے اس آخری نصیحت کو ناقابل عمل قرار دے کر لسٹ سے نکال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نذیراں..... وہ لڑکی ابھی تک نہیں آئی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ نو بجے تک اسے یہاں ہونا چاہیے۔" سفینہ اگلی صبح زیادہ فارم میں تھیں۔

"پتا نئیں۔ ہو سکدا اے اوس دی طبیعت خراب ہووے۔" نذیراں نے ڈسٹنگ سے ہاتھ روک کر کہا۔

"جاؤ اور گھسیٹ کے لے کے آؤ اسے یہاں۔" سفینہ بیگم نے دانت پیسے۔

وہ جب جب معیز کی گاڑی میں ایبہا کے بیٹھنے کا سین یاد کرتیں انہیں غصے کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔ ان کے بیٹے کے پیچھے ایک "بلا" لگ گئی تھی۔ اور وہ ہر صورت تعویز ردبلا چاہتی تھیں۔ ہر صورت۔

☆ ☆ ☆

"میں نہیں آؤں گی۔" اپنے بستر کی چادر تہہ کرتے ہوئے ایبہا نے کہا تو نذیراں جیسی سیدھی سادی عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"تساں نوں بیگم صاب دا پتا اے ناں۔" وہ خوف سے بولی۔ وہ چادر تہہ کر کے رکھنے کے بعد تکیے ٹھیک کر کے سیدھی ہوئی اور نذیراں کو دیکھا۔

"تم ان سے کہہ دو کہ نہ مجھے اس نوکری کی ضرورت ہے اور نہ تنخواہ کی۔" نذیراں نے منہ کھولے چند ثانیے جیسے اس کی بات سمجھنے میں لگائے اور پھر اثبات میں سر ہلا کے پلٹ گئی۔

ایبہا اس کے پیچھے بیرونی دروازے تک آئی دسمبر کی ٹھنڈی ہوا نے اس کے رخساروں کو چھوا تو لحظہ بھر کو وہ کپکپا سی گئی اس نے تیز قدموں سے کوٹھی کی طرف جاتی نذیراں کو دیکھا اور لرزتے ہاتھوں کو سینے پہ بازو لپیٹتے ہوئے بغلوں میں دبا لیا۔

مگر بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ ہاتھوں کی یہ لرزش سردی کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے جلدی سے اندر آ گئی۔ اتنی ہمت دکھا تو دی تھی ثانیہ کے سمجھانے پر' لیکن اب آگے کیا ہو گا اور اس کا کیسے سامنا کرنا تھا یہ اللہ ہی جانتا تھا۔

وہ ناشتہ بنانے کا سوچ رہی تھی جب نذیراں آ گئی' لیکن اب اس کی بھوک اُڑ گئی تھی۔ ذرا سی ہمت کے بعد پھر سے خوف اور دہشت۔

ان ہی لوگوں کے حصے میں سے وہ مضبوط مالی حیثیت اور ایک چھت کی مالکن بنی تھی اور اب انہی کو تیا دکھا رہی تھی؟ اس کے ذہن میں منفی سوچیں چکرانے لگیں۔ ابھی وہ اٹھ کر کوٹھی جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ بیرونی دروازہ کھلا۔

وہ خوف زدہ سی اچھل کر کھڑی ہوئی۔ غصے سے بے حال ہوتی سفینہ بیگم اور ان کے پیچھے افتاں و خیزاں نذیراں۔ ایبہا کا دل لرزنے لگا۔

"تم..... دو ٹکے کی لڑکی۔ ماں بھگوڑی اور باپ شرابی۔ یہی اصلیت ہے نا تمہاری اور یہی اوقات..... تو پھر اتنی اکڑ کس بات کی دکھا رہی ہو؟"

سفینہ بیگم گرجیں تو ان کے انداز سے زیادہ ان کے انداز گفتگو نے ایبہا کا خون خشک کر دیا۔

"میں نے..... میں نے تمہیں بلایا اور تم نے انکار کر دیا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" سفینہ بیگم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ایبہا کے چیتھڑے اڑا دینے کے موڈ میں ہیں۔

ایبہا کو لگا زبان کے بجائے منہ میں چمڑے کا ٹکڑا رکھ دیا گیا ہو' بمشکل لڑکھڑاتے ہوئے بولی۔

"میں پڑھنا چاہتی ہوں آگے۔"

"بکواس بند کرو۔ تمہارا باپ کون سی جائیداد چھوڑ کے مرا ہے تمہارے لیے۔ آوارہ ماں کی آوارہ بیٹی۔ ماں نے بھی ایسے ہی کسی الو کو پھنسایا تھا اور تم نے بھی وہی کام کیا۔"

سفینہ بیگم کے لب و لہجے میں حقارت تھی۔ نفرت تھی۔ ایسی نفرت جو اس کے وجود کو نیلا کیے دیتی تھی۔

"آنٹی پلیز..." برف ہوتا وجود ماں کے نام سے نکلنے والی حرارت نے پگھلا دیا۔ بے اختیار ہی وہ چیخی تھی۔
"میری ماں کو کچھ مت کہیں۔"

اور اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سفینہ بیگم کا غصہ نکالنے کا بہانہ بنے۔ انہوں نے آگے بڑھ کے ایک زور دار تھپڑ ایپھا کے منہ پہ مارا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گری۔ اس کا سر سینٹر ٹیبل سے ٹکرایا تھا۔

درد کی ایک تیز لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

نذیراں جو ابھی تک خوف سے دم سادھے اس پیاری سی لڑکی کی درگت بنتے دیکھ رہی تھی بے اختیار اسے سنبھالنے کو آگے بڑھی اور اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ تو اس کی پیشانی خون سے تربتر دیکھ کر حق دق رہ گئی۔

"چھوڑ دو اسے نذیراں۔" سفینہ بیگم گرجیں۔ تو اس نے گھبرا کر کہا۔
"خون نکل رہا اے ایس دا بیگم صاب۔"
"پتا نہیں حلال ہے یا حرام۔ اپنے ہاتھ ناپاک مت کرو۔ اور چلو اٹھو تم چل کے کام کرو اپنا۔"

وہ حقارت سے بولیں اور انداز میں اس قدر تحکم تھا کہ نذیراں کو سسکتی ایپھا کو چھوڑ کر اٹھنا ہی پڑا۔

ایپھا نے اپنا دوپٹا پیشانی پہ دبا کے رکھا' زور دار تھپڑ سے اس کا ہونٹ اندر سے پھٹ گیا تھا۔ اس نے لہو کا ذائقہ منہ میں گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔

نذیراں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے چلی گئی۔
"اب تو تمہیں اپنی اوقات اچھی طرح پتا چل گئی ہوگی۔" سفینہ بیگم کی سفاکی پر اس کی تباہ کن حالت نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ تمسخر سے بولیں۔

اور پھر وہ ہوا جس کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ زور سے چیخی۔
"ہاں۔ جانتی ہوں میں اپنی اوقات۔" اس نے دوپٹا پیشانی پر سے ہٹایا تو وہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ شیشے کی سینٹر ٹیبل کے کنارے نے اس کی پیشانی کو بری طرح زخمی کیا تھا۔ مگر اسے اب اس زخم کی پروانہ تھی۔ یہ زخم تو جسمانی تھے' قابل برداشت۔

اصل زخم تو وہ تھے جو سفینہ بیگم کی زبان اس کی روح پر لگا رہی تھی۔
جسم کے زخم تو کچھ دیر سے ہی سہی مگر بھر ہی جاتے ہیں' لیکن روح کے زخموں کا مداوا کیا؟
وہ ان کے سامنے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے ایپھا کے انداز میں اتر آنے والے باغی پن کو بہ سرعت محسوس کیا تھا۔

"اچھا..." وہ استہزا سے مسکرائیں۔
"میں بھی تو سنوں۔ کیا ہے تمہاری اوقات۔ دو کوڑی کی لڑکی۔"
"میری اوقات پہلے جو بھی رہی ہو مسز امتیاز احمد۔ مگر اب اس دو کوڑی کی لڑکی کی اوقات یہ ہے کہ یہ آپ کی بہو اور معیز احمد کی منکوحہ ہے۔"

وہ زور سے چیخی۔ سفینہ بیگم نے اس سے ان الفاظ کی کبھی توقع نہیں کی تھی۔ ان کا خون رگوں میں ابلنے لگا۔
"الو کی پٹھی... حرام..."

وہ مغلظات بکتی اس پر ٹوٹ پڑنے کو تھیں' جب نذیراں کی ناگہانی اطلاع پر بھاگ کر آتا معیز ماں اور ایپھا کے درمیان آگیا۔ ان کا ہاتھ معیز کے سینے پر پڑا تھا۔
"ماما...!" معیز نے بے یقینی بھرے تاسف سے ماں کو دیکھا۔

"چھوڑ دو مجھے معیز۔ آج میں اس رزیل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کی ہمت میرے منہ کو آرہی ہے۔ میرے ٹکڑوں پہ پلنے والی میری برابری کے دعوے پہ اتر آئی ہے۔"
معیز نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔
"اس کی کیا مجال ماما جو یہ آپ کے مقابلے پہ آئے۔ آپ چلیں یہاں سے۔" وہ انہیں ٹھنڈا کرتے ہوئے بولا۔ تو وہ مچلیں۔
"تم نے سنا نہیں معیز! یہ کیا بکواس کر رہی تھی۔ تم پوچھتے کیوں نہیں اس سے۔"
معیز نے اس کی طرف دیکھا ارادہ یہی تھا کہ سفینہ کو خوش کرنے کی خاطر اسے ذرا سا ڈانٹ دے گا مگر اس کی خون سے تربتر پیشانی اور نچلے لب سے چھلکتی سرخی دیکھ کر اس کا دل گہرائی میں ڈوب کر ابھرا۔
"پوچھو نا... پوچھتے کیوں نہیں اس سے۔" سفینہ بیگم تیز لہجے میں بولیں۔ وہ معیز کا ٹھٹکنا محسوس کر چکی تھیں۔
"ہاں پوچھیے... آپ بھی پوچھیے میرا حسب و نسب۔ کیا آپ بھی اپنی ماں کی طرح میرے خون کے حلال یا حرام ہونے کی تصدیق چاہتے ہیں؟"
وہ مر جاؤ یا مار ڈالو والی کیفیت میں تھی۔ اس صورت حال نے اس کے تمام ڈر اور خوف کو دور کہیں سلا دیا تھا۔
"میں کہتی ہوں معیز! ابھی طلاق اس کے منہ پہ مارو۔ اسی برتے پہ یہ اتنا اکڑ رہی ہے نا۔ نکلوا سے اس گھر سے۔"

"یہ مجھے طلاق دے بھی دیں تو بھی مجھے اس گھر سے نکال نہیں سکتے۔" ایپھا نے اسی بے خوفی سے کہا۔
"دیکھا تم نے ہمدردی کا انجام۔ آج ہمیں دھمکا رہی ہے یہ۔ اس روز بکنے دیتے اس کو تو پتا چلتا اسے اپنی اوقات کا۔" سفینہ بیگم کا لہجہ زہر آلود تھا۔
معیز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایپھا اونچی آواز میں بولی۔
"وہاں بکنے کے بعد بھی یہی ہوتا۔ جو یہاں "بکنے" کے بعد ہو رہا ہے۔"
"ایپھا...!" معیز دفعتاً غصے سے اونچی آواز میں بولا تو لحہ بھر کو وہ چپ سی ہو گئی۔ مگر پھر بڑے حوصلے سے پوچھنے لگی۔
"تو کیا غلط کہا ہے میں نے؟ آپ کی مہربانی آپ بھی تو قیمت ادا کر کے ہی لائے تھے۔ مجھے۔" اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ آنسو پینا کسے کہتے ہیں' یہ ایپھا مراد نے اس وقت سیکھا۔
"شٹ اپ۔" معیز ناگواری سے بولا پھر سفینہ بیگم سے کہنے لگا۔
"آپ چلیں ماما۔ گھر چل کے آرام کریں۔"
ایپھا نے اندر بیڈ روم میں جا کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ معیز نے ایک نظر بند دروازے کو دیکھا اور سفینہ بیگم کو لے کر باہر نکل گیا۔
"اس لڑکی کا کچھ کرو معیز! یہ مجھے اپنے گھر میں ایک پل بھی برداشت نہیں ہے۔"
وہ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے تند لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ مگر معیز کا سارا دھیان ضبط سے گلابی پڑتی ان شکوہ کناں آنکھوں اور لہو سے تربتر چہرے کی طرف تھا۔
سفینہ بیگم کو زارا کے پاس چھوڑ کر وہ کمرے سے نکلنے لگا تو انہوں نے بے قراری سے اسے پکارا۔
"کہاں جا رہے ہو؟"
"آرہا ہوں ماما! جا کے اسے دیکھوں' بہت خون بہہ رہا تھا اس کا۔" وہ سنجیدہ تھا۔

سفینہ بیگم کا منہ مارے حیرت کے کھلا۔ پھران کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔
"کون... کس کا خون نکل رہا ہے؟" زارا گھبرائی۔ معیز خاموش رہا مگر سفینہ بیگم جلبلا اٹھیں۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ مرنے دو اسے۔ خس کم جہاں پاک۔"
"وہ ہمارے گھر میں رہ رہی ہے اسے کچھ ہوا تو جوابدہ ہم ہی ہوں گے۔" معیز نے انہیں احساس دلایا۔
"ہم کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔"
"اللہ کے سامنے تو ہیں ناں۔"
وہ باہر نکل گیا تھا۔ سفینہ بیگم سرہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئیں۔
"کیا ہوا ماما..."
زارا تشویش سے انہیں پوچھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ فرسٹ ایڈ باکس لے کر وہاں پہنچا تو دل و دماغ مسلسل ایک جنگ کی زد میں تھے۔ دل وہاں جانا نہیں چاہتا تھا مگر دماغ مصر تھا کہ اسے ایک بے گناہ لڑکی کو یوں بے یارو مددگار نہیں چھوڑنا چاہیے۔
معیز کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سفینہ بیگم ایبہا کے ساتھ اس قدر برا سلوک کریں گی۔ وہ روٹین کے مطابق آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب نذیراں گھبرائی ہوئی اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی۔
"اوجی... جلدی کرو۔ بیگم صاب نے اوس بی بی نوں زخمی کر دتا اے۔" وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ معیز پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔
"کون۔ کس نے کس کو زخمی کیا ہے؟"
"او بیگم صاب نے اوس کرائے دار بی بی نوں۔ او نہاں دا خون نکل رہیا اے۔" نذیراں اسے اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں کامیاب رہی تھی وہ چونکا۔
"او شٹ... یہ ماما بھی ناں..."

وہ بھاگ کر انیکسی میں پہنچا تھا۔ اور پھر ایبہا کا طمطراق بھرا انداز دیکھا اور سنا۔
"اس لڑکی کی یہ اوقات ہے کہ یہ آپ کی بہو اور معیز احمد کی منکوحہ ہے۔"
اس کے دل کی حالت کچھ عجیب سی ہوئی مگر صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ مزید کچھ سوچ نہیں سکا۔ در حقیقت اس وقت ایبہا کی حالت دیکھ کر معیز کو افسوس ہوا تھا۔ اور اب وہ میڈیکل باکس لے کر وہاں پہنچا تو بیرونی دروازہ کھلا اور بیڈ روم کا دروازہ ہنوز بند تھا۔ باکس سینٹر ٹیبل پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا ناب گھما کر دیکھا تو وہ لاک نہیں تھا۔ کلک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ معیز دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو وہ اپنا دوپٹہ پیشانی پہ دبا کے رکھے بیڈ پہ سر ٹکائے نیچے کارپٹ پہ بیٹھی تھی۔ معیز تیزی سے آگے بڑھا اور پنجوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔
"ایبہا...!" اس نے پکارا۔
قیامت بھی آجاتی تو وہ اتنی حیران نہ ہوتی کہ وہ تو برحق ہے۔ مگر معیز کا یوں واپس آنا اور نرمی سے پکارنا۔
اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کے اسے دیکھا تھا۔
"اٹھو... مجھے تمہارا زخم دیکھنا ہے۔"
معیز نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ لاؤنج میں چلی آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھی۔ معیز میڈیکل باکس میں سے پائیوڈین اور کاٹن نکال رہا تھا۔ اور وہ مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔

وہ اب ہاتھوں پر میڈیکل گلوز چڑھا رہا تھا پھر اس نے جھک کر احتیاط کے ساتھ اس کے زخم پر چپکے بالوں کو پیچھے ہٹایا ایبہا نے آنکھیں موند لیں۔
اس کے ملبوس سے اٹھتی خوشبو نے ایبہا کی پور پور کو مہکا دیا۔ وہ کاٹن پہ دوا لگا کر اس کے زخم کو صاف کر رہا تھا۔ شکر خدا ٹانکوں کی نوبت نہ آئی تھی۔
اس کے ہاتھوں کا لمس ایبہا کو اپنے ماتھے پہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی دھیمی سی آواز اور تپش۔ وہاں خاموشی تھی... بولتی خاموشی۔
یہ لمس... یہ لمس جو سکون آور تھا۔ اس کے غموں کی اخیر تھا۔
معیز نے اس کی پلکوں کی لرزش دیکھی اور خود سے اعتراف کیا وہ بہت معصوم اور خوب صورت لڑکی تھی۔
اور اس سوچ کے ذہن میں لہراتے ہی معیز کو ڈنک سا لگا۔ وہ فی الفور پیچھے ہٹا اور پلٹ کر گلوز اتارنے لگا۔ ایبہا نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ میڈیکل باکس میں چیزیں سیٹ کر رہا تھا۔
اسے لگا بات کرنے کا یہی صحیح موقع ہے۔ اب جبکہ یہ پینڈورا باکس کھل ہی چکا تھا تو وہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔
"میں پڑھنا چاہتی ہوں۔"
وہ بے ساختہ بولی تو معیز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایبہا نے وضاحت کی۔
"میں اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرنا چاہتی ہوں۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی تو اس کے پٹی زدہ ماتھے کو دیکھ کر معیز شرم سار سا ہو گیا۔
"ہوں... اچھی بات ہے۔" وہ مختصراً بولا۔ مگر جانے سے پہلے اسے یاددہانی کرانا نہیں بھولا۔
"لیکن حالات تمہارے سامنے ہی ہیں۔ اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ جتنی جلدی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرو گی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔"
وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بات نے دل کو کتنا دکھی کیا ہے سو پیشانی کے زخم کو چھو کر سسک اٹھی۔
"یہ پین کلر رکھی ہیں میں نے۔ دودھ کے ساتھ ایک لے لینا' درد میں افاقہ ہو گا۔" معیز نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"اور دل کے درد کا کیا معیز احمد...؟"
اس کے دل نے پیچھے سے دہائی دی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو کہتی ہوں کہ ابھی مزید کچھ دن رکو تم یہاں۔"
تائی جان نے اپنے سارے لاڈ عون پر ہی لٹا دیے تھے۔ ثانیہ ابھی اپنا بیگ پیک کر کے اٹھی تھی۔ لاؤنج میں پہنچنے سے پہلے اسے تائی جان کی آواز آئی۔ تو اس نے سر جھٹکا پھر وہ کوریڈور ہی میں رک گئی۔ وہ عون کا جواب سننا چاہتی تھی۔ کل ولیمہ کھا کر وہ لوگ فارغ ہو چکے تھے اور اصولاً آج رات انہیں یہاں سے نکل جانا تھا۔
"پھر سہی تائی جان۔ فی الحال تو اتنی ہی چھٹی پر آئے تھے۔" وہ بولا تو ثانیہ کی جان میں جان آئی۔
وہ اس گنجلک ماحول میں مزید ایک بھی دن ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تو یہاں سے جاتے ہی گاؤں امی اور دادی کے پاس جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

اسے لگ رہا تھا وہ اپنوں سے جانے کتنا دور چلی آئی ہے۔

"عون پلیز... ہفتے میں دن ہی کتنے ہوتے ہیں۔ ثانی کو بھیج دو واپس۔ تم تو کبھی کبھار آتے ہو۔ ابھی تو اتنی جگہوں کی سیر کرنی تھی تمہارے ساتھ۔"

یہ ارم تھی۔ ثانیہ کا دل ہی نہ چاہا لاؤنج میں جانے کو۔

نیلم کی دو دن پہلے کی گفتگو نے اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے غیر جانب داری سے اپنے اور عون کے معاملے کا جائزہ لیا تو خود کو سراسر جذباتیت کی انتہا اور غلطی پر پایا۔

مگر اب یہ ارم پھر سے... اس نے لب کچلا۔

"ثانی کو بھیج دوں... ایکسکیوزمی۔" عون کی آواز ابھری تو اس میں ناگواری بھری ہوئی تھی۔ ثانیہ چونکی۔

"ہاں بیٹا۔ وہ ویسے بھی یہاں کچھ خاص گھلی ملی نہیں کسی کے ساتھ۔ جہاز پر ہی تو جانا ہے اس نے۔ کون سا بس پکڑنی ہے اکیلے پھر خوب سیریں کرنا۔"

تائی جان نے شہد آگیں لہجے میں عون کو نئی راہ دکھائی، ثانیہ کا دل جیسے مٹھی میں جکڑا گیا۔

کسی بھی لڑکے کے لیے یہ بے حد پرکشش آفر ہوتی خاص طور پہ ایسے لڑکے کے لیے جس کی اپنی منکوحہ اسے گھاس بھی نہ ڈالتی تھی۔

وہ بے ترتیبی سے دھڑکتا دل لیے عون کے جواب کی منتظر تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ تائی جان۔ وہ بیوی ہے میری۔ میں اسے ایسے تنہا کیسے بھیج سکتا ہوں؟ اور جہاں تک بات ہے سیر و تفریح کی تو انشاء اللہ شادی کے بعد ہم دونوں جب یہاں آئیں گے تو ثانیہ میں یہ جھجک نہیں ہو گی۔ تب خوب سیریں کریں گے ارم کے ساتھ۔" وہ فریش لہجے میں بولتا ثانیہ کی دھڑکنوں کو قرار دے گیا۔

"عون پلیز۔ کیا مستقبل ہے تمہارا؟ کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پہ تلے ہوئے ہو۔ ختم کرو بچپن کے اس کھیل کو۔ کیوں ماں باپ کی زبان نبھانے کی خاطر اپنی زندگی خراب کر رہے ہو۔"

ارم کا بس نہیں چلتا تھا وہ عون کا ساتھ پانے کے لیے اس کے آگے گڑگڑانا شروع کر دیتی۔

"ہاں بیٹا۔ بیویاں وہی اچھی لگتی ہیں جو شوہر کو عزت دیں۔ وہ تو تمہیں کچھ سمجھتی ہی نہیں۔" تائی جان مکمل طور پر بیٹی کی سپورٹ میں تھیں۔

"جب واقعی میں بیوی بنے گی تو ویسی ہی عزت بھی دے گی تائی جان! لڑکیوں میں تھوڑا بہت نخرا تو ہوتا ہی ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے اس کا ایٹی ٹیوڈ۔"

عون کا انداز پرسکون تھا۔ ثانیہ جو تائی جان کی بات سن کر سُن سی ہو گئی تھی عون کی بات سن کر تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

یہ وہ شخص تھا مہندی کی رات بھرے پنڈال میں جس کی عزت کا اس نے خیال نہیں کیا۔ اور وہ ثانیہ کی غیر موجودگی میں بھی اسی کا دفاع کر رہا تھا۔

ارم نے مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر عون اٹھ کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"اب تو میں اور ثانی ارم کی شادی پہ آئیں گے اور وہ جو بھنگڑا نازی موٹی کی شادی پہ ادھار رہ گیا ہے، وہ ہم دونوں مل کے ڈالیں گے ارم کی شادی پر۔"

"عون...! تم اپنے آپ کو مجبور مت سمجھو۔ ابو بات کر لیں گے چچا جان سے۔ زبردستی کا یہ رشتہ خاموشی سے ختم ہو جائے گا۔" ارم بے قراری سے بولی۔

"ہاں اور تمہارا نام کبھی نہیں آئے گا۔ اس بات کی فکر مت کرو تم۔" تائی جان نے اسے بڑھاوا دیا۔

ثانی نے بے ساختہ چکرا کر دیوار کو تھاما۔ یہ بھی تو رشتوں ہی کے چہرے تھے۔

لوگ نہیں بدلتے۔ یہ حالات ہیں جو ان کے چہروں سے نقاب اتار کر ان کی اصلیت سامنے لے آتے ہیں۔

"ہاں... میں مجبور ہوں۔" عون سنجیدگی سے بولا پھر ارم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مگر اپنے دل کے ہاتھوں۔ میری کنپٹی پہ کوئی بندوق نہیں رکھی ہوئی ارم۔ ثانیہ سے میں اپنی زندگی میں تو کبھی یہ رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ میں اس رشتے کو اپنے دل و دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ پسند کرتا ہوں اور نبھانا چاہتا ہوں۔ تم جانے کن غلط فہمیوں کا شکار ہو۔"

آخر میں اس کا لہجہ بے رخی لیے ہوئے تھا۔

"میں چلتا ہوں۔ ابھی میں مجھے اپنا سامان پیک کرنا ہے۔"

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور تیزی سے اوپر چلا گیا۔ ارم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تائی جان بوکھلا کر اسے تسلیاں دینے لگیں۔

بوجھل سا دل لیے ثانیہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ شام کو وہ سب سے مل کر ایئرپورٹ کے لیے نکلے تو ارم انہیں خدا حافظ کہنے موجود نہیں تھی۔

ثانیہ جب نیلم سے ملی تو اسے خود سے بھینچ لیا۔ اسے خوب رونا آیا۔

عقل عمر کی میراث نہیں ہوا کرتی۔

وہ خود کو بہت عقل مند سمجھتی تھی، مگر ایک سترہ سالہ لڑکی نے اسے بتایا کہ عقل عمر سے نہیں... حالات کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے سے آتی ہے۔ اپنے معاملات کو غیر جانب داری سے پرکھنے سے آتی ہے۔

"تھینکس..."

"فار واٹ...؟" وہ مسکرائی۔

"فار ایوری تھنگ..." ثانیہ بھیگی پلکوں سنگ مسکرا دی۔

"میں اپنی شادی پہ آپ دونوں کا انتظار کروں گی۔" وہ شرارت سے بولی تو ثانیہ ہنس دی۔

انہیں ایئرپورٹ تک چھوڑنے شایان جا رہا تھا۔ فاران بھی ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ عون سب سے مل کر فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔ ثانیہ پچھلی نشست پر تھی۔ سارے راستے وہ شایان سے محو گفتگو رہا، مگر بھول کر بھی ثانیہ کو مخاطب نہیں کیا۔

میں اسی قابل ہوں۔ وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

اسلام آباد سے کراچی تک کے سفر کے دوران بھی وہ سنجیدہ اور پر تکلف سا رہا۔

اور ثانیہ کو رہ رہ کر یاد آتا رہا کہ اس نے نازیہ آپی کی مایوں والی رات عون کی کس طرح انسلٹ کی تھی۔

ایئرپورٹ پر خالو جان گاڑی لے کر موجود تھے۔ گرم جوشی سے ملے۔

"گھر چلو نا۔ اپنی پھپھو سے نہیں ملو گے؟" عون نے پہلے اسے ڈراپ کرنے کا کہا تو خالو جان مسکرائے۔

"کل آؤں گا۔ ابھی گاڑی پاس نہیں ہے واپسی پہ پھر مسئلہ بنے گا۔"

عون نے وضاحت دی۔ اور وہ راستے ہی میں اتر گیا۔

"او کے... اللہ حافظ..."

ڈگی میں سے اپنا بیگ نکال کر وہ خالو جان سے الوداعی ملاقات کر رہا تھا۔

اور ثانیہ اس کی ایک نگاہ کی منتظر ہی رہی۔ اس کا دل دیے کی لو پہ رکھا قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ مگر شاید چاہنے والی نگاہ ہی بدل گئی تھی۔

وہ گیٹ کی طرف پلٹ گیا۔ ثانیہ نے تھکی ہوئی آنکھیں موند کر سیٹ سے سر ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز ناشتہ کرکے فارغ ہوتے ہی وعدے کے مطابق ثانیہ اس کے پاس موجود تھی۔ ایبہا تو مارے خوشی کے اس سے لپٹ کر رو رہی دی۔

"ایبہا... واٹ ہیپنڈ... ؟ یہ ماتھے پہ کیسا زخم ہے۔ گری ہو کیا؟"

ثانیہ تو دنگ ہی رہ گئی' اسے خود سے الگ کرکے سامنے کیا۔ ماتھے کی چوٹ تو چلو بینڈیج میں چھپ گئی' مگر سوجا ہوا ہونٹ اور بخار میں تپتا اس کا وجود؟

"ہوں' ہاں۔ کل یہاں پاؤں سلپ ہو گیا تو ٹیبل کے شیشے سے زخمی ہو گئی۔" ایبہا کی زبان لڑکھڑائی۔

"اتنی سخت چوٹ... بخار بھی ہو رہا ہے تمہیں۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں۔ اس سنگدل شخص نے تو پلٹ کے دیکھا بھی نہیں ہوگا تمہیں۔"

ثانیہ کے پُرتشویش لہجے میں غصہ در آیا۔

"نہیں' نہیں... ایسی بات نہیں ہے۔ نذیراں نے جاکر انہیں بتایا ہوگا' وہ آئے تھے کل۔ یہ بینڈیج انہوں نے ہی کی ہے اور میڈیسن بھی دی تھی۔"

وہ بے اختیار بولی تو ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"سچ کہہ رہی ہوں۔ پچھلے دنوں طبیعت خراب تھی تو ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئے تھے۔"

ایبہا نے اس کے معیز کے خلاف ہونے یا کچھ بولنے سے پہلے ہی "بند" باندھنا شروع کردیے۔

"یقین تو نہیں آرہا مجھے۔ مگر اب تم اتنا زور دے کر کہہ رہی ہو تو میں مان لیتی ہوں۔" ثانیہ کے ماننے کا انداز بھی نہ ماننے جیسا تھا۔ ایبہا نے اسی پر شکر ادا کیا کہ وہ بحث پر نہ اتری تھی۔

"اچھا چلو آرام سے بیٹھو... بلکہ تم صوفے پہ لیٹ جاؤ اور میں یہاں بیٹھ جاتی ہوں۔" ثانیہ نے زبردستی اسے صوفے پہ لٹا دیا۔

"مجھے چائے تو بنانے دیں۔" ایبہا نے بے چارگی سے کہا۔

"تم مجھے یہاں مہمان مت سمجھا کرو۔ بس یہ سوچا کرو' تمہاری بڑی آپا آئی ہے تمہارے گھر اور تمہیں اس کے رعب کے آگے ایک لفظ بھی نہیں بولنا۔" ثانیہ نے تحکم سے کہا تو ایبہا کو ہنسی آگئی۔

"اتنی بھی بڑی نہیں ہیں مجھ سے۔ میں تو ادب و احترام کی وجہ سے آپ جناب کرتی ہوں۔"

"اب تم مجھ سے بہانے سے میری عمر جاننے کی کوشش مت کرو' میں چائے بنا کے لاتی ہوں پھر مزید گفتگو کریں گے۔" وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

ثانیہ کی بات سن کر مسکراتے ہوئے ایبہا نے آنکھیں موند لیں۔ درحقیقت ثانیہ کے آنے سے اس کا ذہن بہت آسودہ ہو گیا تھا۔

یہ نہیں کہ اب وہ ایک سپر وومن بن جانے والی تھی' ہاں مگر اسے خلوص دل سے مشورے دینے والا مل گیا تھا۔

"میں نے آنٹی سے کہہ دیا ہے کہ اب میں ان کے گھر کے کام نہیں کر سکتی اور یہ بھی کہ میں اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرنا چاہتی ہوں۔"

چائے پینے کے دوران ایبہا نے بتایا تو ثانیہ کا چہرہ حیرت و خوشی کے امتزاج سے جگمگا اٹھا۔

"واقعی... وہ تو بہت ناراض ہوئی ہوں گی؟" ثانیہ نے تشویش سے پوچھا تو آنٹی کی "ناراضی" یاد کرکے ایبہا

کی پیشانی میں ٹیسیں اٹھنے لگی۔

"نہیں۔ ایسا کچھ خاص نہیں۔ بس خود ہی بول بول کے تھک گئیں۔ پھر میں نے معیز سے بھی یہی سب کہہ دیا۔" وہ پلکیں جھپک کر آنسو روک رہی تھی۔

ثانیہ نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا تو باوجود ضبط کے اس کے آنسو پلکوں تک آن پہنچے۔

"میں بے وقوف نہیں بن رہی بیا..." وہ سنجیدہ تھی۔

ایبہا بے بسی سے چُور ہونے لگی۔

"وہ میرے ماں باپ کو گالی دیتی ہیں۔ مجھے حلال نہیں سمجھتیں... میری ماں... دنیا کے لیے وہ کچھ بھی ہوں۔ مگر میرے لیے تو بس ماں تھی۔ سچی اور سچی ماں۔" وہ رو دی۔

ثانیہ نے لب بھینچے۔ اس کی اپنی زندگی میں پچھلے دنوں جو اتار چڑھاؤ آئے تھے' خود اس کا کمبل میں منہ چھپائے یونہی دنیا سے چھپ کے لیٹے رہنے کا جی چاہ رہا تھا۔ مگر صرف اور صرف اس بے بس اور مجبور لڑکی کے خیال سے وہ صبح صبح اس کے پاس بھاگی چلی آئی تھی۔

"اب مجھے تمہاری چوٹ اور اس بینڈیج والی "مہربانی" کی وجہ بھی سمجھ میں آرہی ہے بیا۔"

ثانیہ نے تلخی سے کہا تو ایبہا نے نفی میں سر ہلایا' مگر گلے میں آنسوؤں کا پھندا اس قدر شدید تھا کہ اس سے صفائی میں کوئی لفظ نہیں بولا گیا۔

"خود کو مشکل میں مت ڈالو ایبہا۔ یک طرفہ محبت کرنے والے امتحانوں میں پڑے رہتے ہیں۔"

ثانیہ کرلائی۔ اسے عون یاد آیا... اور اپنا رویہ۔

ایبہا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"تم بس پوری توجہ سے اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ معیز نے جو فیصلہ کرنا ہے' اسے اپنی دلی رضامندی سے کرنے دو۔ اس کے پاؤں کی زنجیر بن کے فیصلہ کرواؤ گی تو کبھی بھی خوش نہیں رہ سکو گی۔ اور یہ تو طے ہے کہ فیصلہ وہ اپنی من مرضی ہی کا کرے گا' تمہاری نہیں تو پھر خود کو ہلکان کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟"

ثانیہ نے لمبے لیکچر کے بعد پوچھا تو اس نے آنسو پیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"تم اس لڑکی کو طلاق کب دے رہے ہو معیز... ؟" وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا' جب سفینہ بیگم نے پوچھا تو وہ جو کرسی کھسکا کر اٹھنے کی پوزیشن میں تھا۔ ہلکے سے مسکراتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گیا۔

"کبھی نہیں..."

سفینہ بیگم کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو معیز... ؟"

"ہاں ماما... میں اس رشتے کو نبھانا چاہتا ہوں۔"

معیز نے اطمینان سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو سفینہ بیگم کو اس کا ایک ایک لفظ دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برستا محسوس ہوا۔ وہ بے یقینی کی اتنی شدید لپیٹ میں تھیں کہ ایک لفظ بھی نہیں بول پائیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

مکمل ناول

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے، جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے
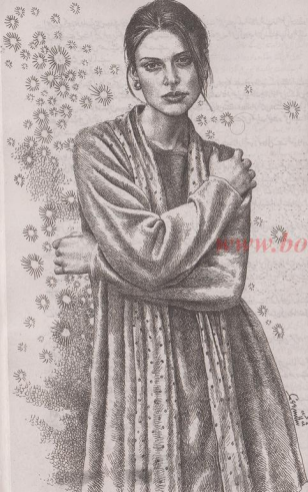
اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈپا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ یتاراؤ اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈپا کو بتایا اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہروز کو بتاتی ہے۔ شہروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر، بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر امی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں، وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہروز کو فون کرتی ہیں۔ شہروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ عمر اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے، لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈپا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسٹر ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوا لیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیتا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پا رہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی گرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کر لیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد، احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار، عمدہ خوشبو، نفیس گفتگو، اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے، اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنا لیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مار پیٹ تک آگئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات یتاراؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصوروار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرپرسن حمید کاردانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مر چکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد، احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثیا کو بے حد چاہتا ہے ‘لیکن وہ انتہائی خود غرض ‘مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔
بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثیا کو ملواتا ہے۔ ثیا ‘عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی ‘ثیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثیا جیسی بناوٹی ‘خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔
بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں ‘زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں ‘جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے ‘کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز ‘زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

گیارہویں قسط

”عوف بن سلمان“
شہروز نے گوگل کرنے کے لیے لیپ ٹاپ پر ٹائپ کیا تھا اور پھر اپنے سامنے پڑے کاغذات کو سامنے کیا تھا۔ اسے دو دن پہلے ایک تفصیلی لیٹر اور ای میل مل گئی تھی۔ عوف بن سلمان ابھی کراچی میں ہی تھے اور واپس جانے سے پہلے انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی اور ایک تحریری اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوایا تھا۔
اس کو نا صرف ایک بہت اچھے معاوضے کی پیشکش کی گئی تھی بلکہ دوسرے بھی بہت سے فائدے تھے۔ میڈیکل انشورنس کے علاوہ بچے ہونے کی صورت میں ان کی تعلیم کے اخراجات اس کی آفر لیٹر کا حصہ تھے۔ اسے عوف بن سلمان کی این جی او کی طرف سے ملٹی پل ویزا آفر کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سعودی عرب کے علاوہ گلف کی باقی ریاستوں میں آزادانہ آجا سکتا تھا۔ سال میں دو بونس کے ساتھ ‘دو فیملی ٹرپ جس میں وہ اپنی فیملی کے کسی بھی چار افراد کو لے جا سکتا تھا جس کا پورا معاوضہ کمپنی کے ذمہ ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ دنیا بھر میں کسی بھی دوسرے ملک میں جانے کے لیے اپنی کمپنی سے ٹی اے ڈی طلب کرنے کا مجاز تھا۔
سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہ کام پارٹ ٹائم جاب تھا یعنی وہ اپنے چینل کا ملازم رہتے ہوئے بھی عوف بن سلمان کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ شہروز کی آنکھیں یہ سب شقیں پڑھتے ہوئے حیرت سے پھٹتی جاتی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جب تنخواہ روپے سے ریالوں کا سفر کرتی ہے تو وارے نیارے ہو جاتے ہیں لیکن اتنے سارے دوسرے حیران کن مراعات اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے آفر کی جا سکتی ہیں۔
اس کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس کے لیے ان سب چیزوں سے بھی زیادہ پرکشش چیز وہ سیکھنے کا جذبہ اور شہرت کا نشہ تھا جسے سوچ کر اسے جوائن کرنے سے پہلے ہی مزا آنے لگا تھا۔ وہ دل و جان سے عوف بن سلمان کے ساتھ کام کرنے لیے راضی تھا۔ اسے کہا گیا تھا کہ وہ اگر تمام شرائط کے ساتھ متفق ہے تو اپنے شناختی کارڈ کے ساتھ ایک راضی نامہ تیار کروا کر باقاعدہ سعودی کمپنی کے نام بھجوانا تھا تاکہ باقی تمام مراحل طے کیے جا سکتے۔ اس کے سامنے اس کانٹریکٹ کی کاپی موجود تھی جو اسے بھجوائی گئی تھی۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ جاب اسے اتنے منظم طریقے سے آفر کی جائے گی کہ اتنی لکھت پڑھت کی ضرورت پڑے گی۔
عوف بن سلمان ابھی پاکستان میں تھے اور ان سے فون پر بات نہیں ہو پائی تھی لیکن انہوں نے ای میل کے ذریعے اسے باقاعدہ میٹنگ کے لیے بلوایا تھا۔ اسی لیے شہروز لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا تھا تاکہ ان کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کر سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جب وہ اپنے بھائیوں اور اپنے ڈیڈی سے اس چیز کا تذکرہ کرے تو وہ عوف بن سلمان کے کوائف کے متعلق سوال کر کے کسی وہم کا شکار ہوں۔
وہ عوف بن سلمان کے متعلق انٹرنیٹ سے مواد جمع کر رہا تھا اور وہاں جو بھی مل سکا تھا ‘اس سے شہروز کو یہی اندازہ ہو سکا کہ وہ سعودی عرب کے کامیاب اور مشہور کاروباری شخص تھے۔ ان کے لاتعداد کاروباری مراسم تھے۔ وہ شاہی خاندان کے ذاتی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی اپنی آئل ریفائنریز تھیں۔ وہ اوپیک میں سعودی عرب کی جانب سے نمائندگی بھی کرتے تھے اور بیس کے قریب چھوٹی بڑی سعودی کمپنیوں کے سی ای او اور چیئرمین کے طور پر کام کر رہے تھے لیکن اس سب سے بڑھ کر وہ شوقیہ فوٹو گرافر تھے اور وہ نیشنل جیو گرافک عریبیہ کے ساتھ منسلک تھے۔ انہوں نے گزشتہ کچھ سالوں میں بہت اچھی ڈاکیومینٹریز بنائی تھیں جو ایوارڈ یافتہ تھیں۔ ان کی تمام کامیابیوں کی تفصیل بھی نیٹ پر موجود تھی۔
شہروز نے کچھ ڈاکومینٹریز کے لنکس بھی اکٹھے کیے تھے تاکہ فراغت میں ان کے کام اور اس کی نوعیت کا جائزہ لے سکے۔ یہ سب چیزیں سرچ کرتے ہوئے ایک عجیب سا جوش اس کے پورے وجود پر چھایا رہا تھا۔ وہ کامیاب تھا اور مزید کامیاب ہونے جا رہا تھا۔ وہ خوش قسمت تھا اور مزید خوش قسمتی اس کی منتظر تھی۔
اس نے اینکر کے طور پر ایک چینل میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس نے نیوز کاسٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ وہ مانیٹرنگ افسر بھی رہا تھا۔ اس نے ایک بڑے نامی گرامی سیاسی پروگرام میں ایک نامی گرامی اینکر پرسن کی معاونت کی تھی۔ وہ کچھ عرصے میں اپنا ایک الگ پروگرام ہوسٹ کرنے والا تھا۔ اور اب بیٹھے بٹھائے اسے ایک بین الاقوامی ادارے کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔ اسے تمام قانونی کارروائی پوری کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

”میں ویک اینڈ پر لاہور آؤں گا۔“ شہروز نے زارا کو بتایا تھا۔
وہ بہت فرصت سے آج اسے فون کرنے بیٹھا تھا۔ اس لیے سب ضروری کام نبٹا کر فراغت سے وائبر پر بات کر رہا تھا۔ اس کو کال کرنے سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی تھی اور اب اس سے بات کر رہا تھا۔ بہت دن کے بعد اس کا دل چاہا تھا کہ وہ امی سے اور زارا سے بات کرے۔ اس نے عوف بن سلمان کے پروجیکٹ سے متعلقہ تمام کاغذات تیار کروا لیے تھے لیکن ابھی اس نے انہیں واپس نہیں بھجوایا تھا۔ کاغذات بھجوا دینے کے بعد اس کی عوف بن سلمان کے ساتھ ایک باقاعدہ میٹنگ طے ہوئی تھی۔
”اچھی بات ہے.... رکو گے؟“ زارا نے عام سے انداز میں پوچھا۔
”تم روکو گی تو رک جاؤں گا۔“ اس نے خاص الخاص انداز میں کہا تھا۔ وہ بہت مطمئن تھا اور دل چاہتا تھا سب اس کی خوشی میں خوش ہوں۔ زارا کا انداز بجھا بجھا سا تھا جو اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
”میں چاہتی ہوں ‘تم اپنی جاب کی طرف دھیان دو.... یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“ زارا کی آواز میں ابھی بھی کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔

"طنز کر رہی ہو نا...؟" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زارا نے بات کاٹ دی۔
"مشرق سے جو رنگ سنہری لگتا ہے وہی رنگ مغرب میں سرمئی نظر آتا ہے شہروز... یہ حقیقت ہے۔ لوگ اسے گرامر کی غلطی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے صرف حقیقت بیان کی ہے تم غلط مت سمجھو۔"
"میری غیر موجودگی تمہیں کیا کیا سکھا رہی ہے زارا... محو حیرت ہوں' یہ دنیا کیا سے کیا ہو رہی ہے۔ لوگ جدائی میں عاشق بن جاتے ہیں' تم عالم بن رہی ہو... عالم بھی وہ کہ جس کی بات پہلی بار میں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔" وہ خوشگوار سے انداز میں بولا جواب میں زارا کی دھیمی سی ہنسی سنائی دی۔
"تم سب لوگ بھی تو یہ ہی چاہتے تھے نا کہ زارا عقل کی چار باتیں سیکھ لے... لو سیکھ لیں زارا نے عقل کی چار باتیں... اب مزید کیا حکم ہے بادشاہ سلامت!" وہ ساری گفتگو میں پہلی بار خوش مزاجی سے بولی تھی۔
"بادشاہ سلامت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں کنیز کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ویک اینڈ پر اچھا سا تیار ہو کر' ہر فکر سے ہر غم سے آزاد ہو کر ہمارے محل میں تشریف لائے اور دوپہر کا طعام ہمارے ساتھ تناول فرمائے۔" وہ اسی کے انداز میں بولا۔ زارا پھر ہنسی۔
"بادشاہ سلامت! کنیز کی اردو ذرا کمزور ہے... آسان زبان میں حکم دیا جائے۔" شہروز کو اچھا لگا کہ وہ اب پر سکون ہو کر بات کر رہی تھی۔
"بادشاہ سلامت آپ کو حکم نہیں۔" "حکم کا اکا" دیں گے... اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بات بھی آپ کے پلے نہیں پڑی ہو گی۔"
"اس میں کنیز کی کیا خطا ہے بادشاہ سلامت... آپ کو کنیز کی کم فہمی کا بخوبی علم ہے۔ آپ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکم دیجیے۔" شہروز نے بے ساختہ قہقہہ لگایا پھر اس نے اپنی پشت پر پڑا سرہانہ اٹھا کر دائیں جانب رکھ کر اس پر کہنی ٹکائی تھی۔ وہ اب پیٹ کے بل لیٹ گیا تھا۔
"حکم نہیں درخواست ہے ملکہ عالیہ! کہ ویک اینڈ پر ہمارے گھر تشریف لائیے گا۔"
"کیوں بھئی... کس خوشی میں دعوت دی جا رہی ہے؟" وہ طمانیت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"آنکھیں تھک گئی ہیں... ان کو آرام کی ضرورت ہے... یہ سکون چاہتی ہیں... یہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں زارا..." اس نے اتنا کہا پھر لمحہ بھر کا توقف کر کے لہجے کی ٹون یکسر تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے... میں یہ سب نہیں کہنے والا تم سے..."
"اونہہ...!" زارا نے اس کی بات کاٹ کر مصنوعی ناراضی سے ہنکارا بھرا پھر ناک چڑھا کر بولی۔
"مجھ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے... کام کی بات کرو... کس خوشی میں لنچ کی دعوت دے رہے ہو؟"
"دو مہینے بعد گھر آؤں گا... دل چاہتا ہے' وہ چہرہ سب سے پہلے نظر آئے جو دل کو بے حد مرغوب ہے... اب بولو کوئی اعتراض؟" وہ کہہ رہا تھا۔
"اعتراض تو نہیں ہے لیکن سوچ رہی ہوں کہ کوئی اچھی بات ہوئی ہے تمہارے ساتھ... جو تم مجھے بتا نہیں رہے... کالی کالی دال کی خوشبو آ رہی ہے۔" وہ عام سے انداز میں کہہ رہی تھی۔
"زارا! میں بہت خوش ہوں... مجھے ایک انٹرنیشنل ادارے کی جانب سے بہت اچھی آفر آئی ہے... حیران کن آفر زارا... میں وہ سب کچھ حاصل کرنے والا ہوں جس کا میں خواہش مند رہا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے سارے خواب' سارے عزائم اتنی جلدی پورے ہونے لگیں گے۔ میری محنت رنگ لا رہی ہے۔ میں منزل کی جانب جا نہیں رہا ہوں' پرواز کر رہا ہوں۔ ہر قدم مجھے میری منزل کی جانب دھکیل رہا ہے... ثابت ہوا زارا! اللہ پاک محنت کو ضائع نہیں نہیں ہونے دیتے۔" اس کی خوشی اس کی آواز

سے چھلک رہی تھی۔ زارا کی آواز لمحہ بھر کے لیے سنائی ہی نہیں دی۔
"کیا ہوا' خاموش کیوں ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"میں تمہاری خوشی میں بہت خوش ہوں شہروز..." اس نے لمحہ بھر کا توقف کر کے اتنا کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔
"ایسے خوش ہوتے ہیں کیا... خوش ہو تو مجھے محسوس بھی ہونا چاہیے یار... کیا میں تم لوگوں کو جانتا نہیں ہوں... ممی نے بھی میری بات سن کر اسی طرح اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے... بجھی ہوئی خوشی... مجھے بے وقوف سمجھتے ہو تم لوگ؟" شہروز برہم نہیں ہوا تھا' لیکن اسے اچھا بھی نہیں لگا تھا۔
"شہروز! تم اپنی منزل کی جانب جا رہے ہو' تم آگے بڑھ رہے ہو... بہت آگے... ہم پیچھے رہ گئے ہیں... ہمیں پیچھے مت چھوڑو شہروز..." وہ یقیناً" روہانسی ہوئی تھی۔ شہروز کو مزید برا لگا۔
"تم لوگ مجھ پر بھروسا نہیں کرتے ہو۔ تم لوگوں کو لگتا ہے کہ شہرت مجھے نگل جائے گی۔ کیا میں اتنا کم ظرف ہوں کہ اپنے پیاروں کو بھول جاؤں گا۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔
"یہ بات نہیں ہے شہروز...! مجھے خود نہیں پتا کہ میں اتنی بے سکون کیوں ہوں... کوشش کے باوجود دل مطمئن نہیں ہوتا... شاید میں تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔"
"وہ تو میں بھی تمہیں کرتا ہوں زارا... تم سب لوگوں کو کرتا ہوں۔" وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلا رہا تھا۔ اسے شرمندگی تھی کہ وہ زارا کی جذباتی کیفیت جانتے ہوئے بھی اسے زیادہ فون نہیں کر پاتا تھا۔
"تم ناراض مت ہو شہروز... میں تمہیں اپنے دل کا حال بتا رہی ہوں۔ میں بعض اوقات بہت ڈر جاتی ہوں۔ میری خود بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں... لیکن شہروز! میں کم عقل نہیں ہوں... بچی... لیکن میں کیا کروں... محبت کے فارمولے میں

عقل صفر کا کام کرتی ہے.... یعنی کوئی کام نہیں کرتی۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی.... یہ ناکارہ ہوجاتی ہے.... میں بالکل ناکارہ ہوچکی ہوں۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ٹھیک ہوتا۔ میری وجہ سے ایک عورت کی جان چلی گئی ۔ میں اتنے دن سے اسپتال نہیں جاسکی۔ میرا دل بھی نہیں چاہتا جانے کو اب.... مجھے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا میں نے سوچا ہے میں یہ سب چھوڑ دوں گی۔"

اس کے لہجے میں اتنی بے چارگی تھی کہ شہوز چپ کا چپ رہ گیا۔ وہ ذہنی طور پر بہت تھکی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ شہوز کو اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ یہ بات اس نے کبھی چھپائی نہیں تھی اور یہ شہوز کی زندگی کا سب سے طاقت ور احساس بھی تھا لیکن وہ اتنی بے یقین رہتی تھی تو شہوز کو برا لگتا تھا۔ گزشتہ کچھ مہینوں میں ان کے درمیان نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ فاصلے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن شہوز خود کو قصوروار سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"زارا پلیز اس فیز سے نکلنے کی کوشش کرو.... بہادری سے اپنی غلطی تسلیم کرو اور دوبارہ سے ڈیوٹی پر جانا شروع کرو۔" شہوز نے اتنا ہی کہا تھا کہ زارا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"حاب کی بات مت کرو.... اسے چھوڑو.... میری کیا غلطی ہے.... میں تو محبت کے ہاتھوں خوار ہورہی ہوں۔" وہ بے حد اکتا کر بولی تھی۔ شہوز کو بہت برا لگا۔

"تم اس بات کے لیے بھی مجھے ذمہ دار سمجھتی ہو زارا.... کم آن یار! اب اتنی زیادتی بھی مت کرو' یہ میری وجہ سے نہیں ہوا اس کی وجہ تمہاری اپنی غیر ذمہ داری ہے۔ تم اپنی لاابالی فطرت کو بدلو۔ ایک ڈاکٹر کے لیے غیر ذمہ داری اچھی چیز نہیں ہوتی.... پھپھو نے تم میں ذمہ داری پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ اس میں بھی میرا قصور ہے کیا....؟ عجیب بات کرتی ہو تم۔ اب کیا سولہ سال کی چھوٹی سی لڑکی ہو تم کہ یہ باتیں بھی اردگرد کے لوگ سمجھائیں گے۔ اب بڑی ہوجاؤ پلیز.... تم امائمہ کی جانب دیکھو۔ وہ بھی تو اپنے پیرنٹس کی اکلوتی بیٹی ہے' لیکن کتنی ذمہ داری ہے اس کی طبیعت میں.... عمر جیسے بندے کو بدل کر رکھ دیا ہے اس نے۔"

وہ بہت برداشت کرتے ہوئے اسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم امائمہ کے ساتھ میرا موازنہ مت کرو عمر۔ اس کو میرے جیسے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔" زارا نے چڑ کر اتنا ہی کہا تھا کہ شہوز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اب تم اپنے عظیم الشان مسائل کا رونا رونے لگ جانا.... تم نے بلاوجہ کے مسئلے پال رکھے ہیں۔ تمہارے بال اچھے نہیں ہیں۔ تمہیں بھوک نہیں لگتی۔ تم کمزور ہوگئی ہو۔ تمہاری سینئرز تم سے خار کھاتی ہیں۔ بڑی ہوجاؤ زارا' خدارا بڑی ہوجاؤ۔ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔" شہوز اسے چڑا رہا تھا' لیکن زارا کو بے حد برا لگا۔ شہوز کو اس کا اندازہ تب ہوا جب اسے دوسری جانب سے کافی دیر تک کوئی جواب سننے کو نہیں ملا تھا۔ زارا نے کال کاٹ دی تھی۔ شہوز نے چڑ کر فون بستر پر دور پھینک دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اپنا آفر لیٹر پسند آیا ہے۔" عوف بن سلمان نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ پرل کانٹی نینٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ملاقات کے وقت سے پانچ منٹ پہلے پہنچنے والا شہوز انہیں ڈائننگ ہال میں بیٹھا دیکھ کر شرمندہ ہوگیا تھا' لیکن ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ جس سے اس کی شرمندگی زائل ہوگئی تھی۔ وہ اتنا کامیاب اور امیر ترین بزنس مین شخص تھا' لیکن بہت ہی عاجز اور ملنسار بھی۔

"میں چند باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ انہیں ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ اگر آپ میرے ساتھ کام کرنے کے لیے رضامند ہیں تو میں مزید کچھ چیزیں ابتدا میں ہی واضح کردینا چاہتا ہوں۔ رازداری ہماری پہلی شرط ہے۔ ہم بہت حساس موضوعات پر کام کرتے ہیں اور جب تک ہمارا کام مکمل نہ ہوجائے' ہم اس کے متعلق کسی سے بات کرنا سخت ناپسند کرتے ہیں۔ آپ ایک مشہور چینل کے ساتھ کام کررہے ہیں۔ آپ کو کاپی رائٹس کے بارے میں بتانا یا آپ کے سامنے اس فیلڈ میں ہونے والی دھاندلی کا ذکر کرنا محض وقت کا ضیاع ہوگا۔ ہم بہت منظم طریقے سے کام کرتے ہیں اور بہت سے دوسرے براڈ کاسٹنگ آرگنائزیشنز کے ساتھ روابط بھی ہیں' لیکن ہم اپنے پروجیکٹس کے بارے میں کبھی کسی سے بات نہیں کرتے۔ میرے ساتھ میرے ان پروجیکٹس پر مختلف ایتھنکس کے لوگ کام کرتے ہیں' لیکن رازداری کا خیال رکھنا ہم سب پر لازم ہے۔ میں اس کی خلاف ورزی ذاتی طور پر بھی پسند نہیں کرتا اور یہ ہمارے کام کی ضرورت بھی ہے۔ میرے ساتھ کام کرنے والا ہر شخص اس بات کا پابند ہے اور میرے ساتھ کام کرنے والے بہت سے لوگ مختلف آرگنائزیشن سے مختلف براڈ کارپوریشن سے تعلق رکھتے ہیں' یعنی صرف آپ ہی نہیں ہی' بہت سے لوگ ہیں' جو چیلنجز قبول کرتے ہیں اور ہر نئی چیز سیکھنا چاہتے ہیں۔ جن کی زندگی کا ہر لمحہ انسانیت کی خدمت ہے۔ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ رازداری رکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارا کام جدت پسند ہوتا ہے۔ ہمارا اپنا ایک طریقہ ہے۔ میں اسے پیش کرنے سے پہلے کسی قسم کی پروجیکشن پسند نہیں کرتا۔ مجھے یہ پسند ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجیے' مجھے اس میں مزہ نہیں آتا۔"

انہوں نے اپنے دونوں بازو میز کی چکنی سطح پر رکھے تھے۔ شہوز اس دوسری ملاقات میں ان سے پہلے سے بھی زیادہ مرعوب ہوا تھا۔ وہ لگ بھگ پچاس سے زیادہ کے لگتے تھے' لیکن ان کی پشت بالکل سیدھی تھی۔ ان کا انداز نشست بھی ایسا تھا کہ مجال ہے ذرا بھی خم آیا ہو۔ برانڈڈ بھورے رنگ کے سوٹ میں خوشبوئیں اڑاتا وجود' سلیقے سے جمے بال اور چہرے پر ہلکی داڑھی سب جیسے سلیقے اور شائستگی کی اپنی مثال تھے۔ شہوز کو بہت سے سیاست دانوں سے' کاروباری افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا' انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ایسا مرعوب وہ کسی سے نہیں ہوا تھا۔ عوف بن سلمان مردانہ وجاہت اور شائستگی کی اعلامثال تھے۔

"میں بھی شور مچانے سے زیادہ اپنا کام کرنے پر یقین رکھتا ہوں سر....! یہ میری نوکری سے زیادہ میری طبیعت کا معاملہ ہے۔ میں اپنا کام ہمیشہ سے اپنے بھروسے پر مکمل کرنے کا عادی رہا ہوں۔ یعنی میں ایسے پروجیکٹس کرتا ہی نہیں ہوں' جس میں بہت زیادہ لوگ شامل ہوں۔ ایسی صورت حال میں رازداری کی شرط اہم نہیں رہ جاتی۔" شہوز نے اپنی دلی کیفیت چھپا کر اعتماد سے کہا تھا۔ اس میں ایک خوبی تھی۔ وہ اپنی عزت نفس کو ہمیشہ اہمیت دیتا تھا۔ یہ اس کی ٹریننگ کا حصہ تھا۔ عوف بن سلمان نے سر ہلایا جیسے سراہ رہے ہوں۔

"شباب! (نوجوان کو مخاطب کرنے کا مخصوص انداز) میں ایک چیز کا قائل ہوں.... نئے تعلقات بناتے ہوئے حقیقت اور وصیت کھل کر بتانی چاہیے.... اس سے ناکامی کا رسک کم ہوجاتا ہے۔" وہ مزید کہہ رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں' آپ ایک اچھے صحافی ہیں اور آپ میں نئی چیزیں سیکھنے کا' آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ میں پہلی نظر میں آپ کی شخصیت میں چھپے اسپارک کو پہچان گیا تھا۔"

شہوز کا خون سیروں بڑھ گیا تھا۔ اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ وہ اس کے بارے میں ایک فلائٹ میں اتنا کچھ کیسے جان گئے تھے۔ لیکن تعریف کے نشے نے اس کی حسیات کو جیسے لپیٹ کر ایک سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے خود ہی فرض کرلیا تھا۔ وہ اتنا قابل ہے کہ ایک نجی چینل پر کام کرنے سے مشہور و معروف ہوچکا ہے اور دنیا بھر کے لوگ اسے جانتے ہیں اور یہ شان دار نوکری اسے اس کی قابلیت کی وجہ سے آفر کی گئی ہے۔

"میں ایک صحافی ہوں سر....! مجھ سے زیادہ سچائی کی

اہمیت کون جان سکتا ہے۔" اس نے ابھی بھی اسی انداز میں بات کی تھی۔

"اچھی بات ہے... میرے دل کو اچھی چیزیں بھاتی ہیں... میرا اصول ہے کہ آنکھیں 'ناک' کان' منہ بے شک بند رکھیں' لیکن اپنے دل کو قفل مت لگائیں۔ دل انسان کے جسم کا قطب نما ہوتا ہے۔ یہ منزل کی جانب جانے والے راستے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کی رہنمائی کو ہمیشہ ترجیح دیں۔ آپ اگر میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ یہاں بھول بھلیاں بہت ہیں۔ ہر قدم آپ کو چوکنا ہو کر اٹھانا پڑے گا۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ شہوز کو ان کی اس بے وجہ کی سنسنی پھیلاتے انداز سے الجھن ہوئی۔ وہ وضاحت طلب انداز میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کو جس پروجیکٹ کی آفر کی گئی ہے' اس کا بنیادی موضوع دہشت گردی ہے۔ آج کی دنیا کا سلگتا ترین موضوع ہے دہشت گردی۔ مذہب اسلام کے ماتھے پر اس سے بڑا کلنک آج تک نہیں لگا ہوگا۔ آپ اس کلنک کو مٹانے نکلیں گے تو آپ جہاد کے راستے پر ہوں گے۔ یہ راستہ آسان نہیں ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کو جس طرح ان چیزوں میں ملوث کیا جارہا ہے اور اس کی کیا وجوہات ہیں ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کو ہر سچائی کا سامنا کرنا پڑے گا چاہے وہ آپ کو پسند آئے یا نہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرا حالیہ پروجیکٹ دنیا کے سامنے اسلام کا مثبت چہرہ پیش کرنے سے متعلق ہے۔ میں اس کام کو جہاد سمجھ کر کررہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی ابہام کا شکار ہوں۔ آپ کو ذہنی آمادگی کے ساتھ یہ جانتے ہوئے اپنا کنٹریکٹ سائن کرنا چاہیے کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے۔ آپ کو بہت سی رکاوٹوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ آپ کو بہت سے مقام پر اپنے ہی لوگ غلط سرگرمیوں میں ملوث ملیں گے جنہیں آپ کو بے نقاب کرنا پڑے گا۔ میں پھر کہوں گا آپ کو ایسی ہر چیز ذہن میں رکھ کر اس جاب کو قبول کرنا پڑے گا۔

آپ کو یہ سب منظور ہے تو بسم اللہ... ورنہ واپسی کے دروازے ابھی کھلے ہیں۔"

انہوں نے لفظ "ابھی" پر زور دیتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ وہ گفتگو کے دوران اس کا بغور جائزہ لیتے رہے تھے۔ شہوز نے سر ہلایا۔ یہ ساری باتیں اس کے لیے اتنی نئی بھی نہیں تھیں۔ رازداری تو اس نے ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھی تھی اور اچھے برے کا فرق بھی وہ اب جان چکا تھا۔ اتنے چینلز کی دوڑ میں اپنے کام کو منفرد اور مختلف رکھنے کے لیے یہ سارے حربے سب ہی آزماتے تھے سو اس میں نیا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ کسی پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لیے اتنی محنت تو کرنی پڑتی ہے۔

"میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جس سے مجھے کچھ سیکھنے کو ملے۔ مجھے روپے' پیسے کی حاجت نہیں ہے' لیکن مجھے اپنا تجربہ بڑھانا ہے' اپنا علم بڑھانا ہے۔ یہ ہی میرا شوق ہے' یہ ہی میرا جنون ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایک مشکل پروجیکٹ کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ آپ کے انداز سے لگ رہا ہے کہ یہ بہت زبردست پروجیکٹ ہوگا۔ میں اس کے لیے آپ سے زیادہ پرجوش' پرامید ہوں۔" وہ میز پر پڑے گلدان میں موجود پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا عزم اس کے چہرے سے چھلکتا تھا۔ اس کی استقامت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

یہ تھیں وہ خصوصیات جو عوف بن سلمان جیسے جوہری نے بھانپ لی تھیں۔ یہ ہی تھے وہ جذبے جو انہوں نے دنیا بھر میں گھوم کر سمیٹے تھے اور ایسے ہی تھے وہ لوگ جو ان کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے راضی نامے پر دستخط کیے تھے اور پھر کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔ شہوز نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

"میں اس عزت افزائی پر ممنون ہوں سر اور پوری توانائی آپ کے اس پروجیکٹ کو دینے کی کوشش کروں گا۔" اس نے کہا تھا اور پھر دستخط کردیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا کررہی ہو؟" زارا راکنگ چیئر پر بیٹھی بلاوجہ ادھر ادھر جھول رہی تھی۔ جب عقب سے ممی کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا' کسے کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ کم ہی اس طرح اس کے کمرے میں آتی تھیں۔ انہوں نے ملگجے سے کپڑے پہن رکھے تھے اور ان کے شولڈر کٹ بال بکھرے بکھرے سے تھے۔

اس نے شاید تین دن بعد ممی کو دیکھا تھا' تین دن پہلے بھی وہ کچھ ست سی تھیں۔ جب زارا نے انہیں رات کے کھانے پر دیکھا تھا۔ وہ ان سے کترانے لگی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ اس کا ممی سے سامنا کم سے کم ہو۔ وہ ابھی تک اسپتال نہیں جارہی تھی۔ ممی کی تاکید کے باوجود اس نے ایک دن بھی اپنی ڈیوٹی نہیں دی تھی۔ ایک مہینہ ہوچکا تھا اور وہ ابھی تک روٹین کے مطابق اسپتال جانا شروع نہیں ہوئی تھی۔

اب احساس جرم سے زیادہ اس کی ازلی کاہلی اس کی بڑی وجہ تھی۔ اس کی طبیعت کسی چیز کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ شہوز نے اسے بتایا تھا' وہ لندن جانے کی تیاری کررہا ہے۔ وہ لاہور آیا تھا تو ایک ہفتہ رکا تھا۔ زارا ایک بار ممی کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی اور زندگی میں پہلی بار اسے شہوز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بہت بدلتا جارہا تھا اور اس بات کا شکوہ سب کو تھا جبکہ وہ اسے سب کا وہم اور اپنی مصروفیت قرار دیتا رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ سب سے لاپروا ہوتا جارہا تھا۔ اسے کسی کا احساس نہیں رہا تھا۔

وہ اپنی کامیابیوں کا ذکر کرتا رہتا تھا اور وہ اس معاملے میں کسی قدر مغرور ہوچکا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائیوں اور اپنے ڈیڈی کے سامنے بھی اپنا موقف اس طرح بیان کرنے لگا تھا جیسے صحافی ہونے کے بعد صرف وہ ہی واحد شخص ہے جو حق اور سچ بیان کر سکتا ہے۔

وہ لندن جارہا تھا۔ اس لیے امائمہ اور عمرو غیرہ کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ زارا نے انکار کردیا تھا۔ زارا کو اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اپنی محنت اور زارا کی ناکامیوں کو اس کی غیر ذمہ داری اور لاپروائی قرار دیتا تھا۔ شہوز کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ شہرت کا نشہ اس کے منہ کو لگ چکا تھا اور شہرت انسان کو زندہ کھا جاتی ہے۔

زارا کی کمزور شخصیت کو اس کے رویے سے مزید دکھ ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ صرف اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی اور اپنی ممی کو بھی نظر انداز کرنے لگی تھی۔ اس لیے انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر اس نے مثبت رسپانس نہیں دیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس سے پوچھیں گی کہ وہ کب سے ڈیوٹی پر جارہی ہے۔ ان کے درمیان اس موضوع پر ابھی تک بات نہیں ہوئی تھی' لیکن وہ ممی کی آنکھوں میں چھپے سوال کو پڑھ سکتی تھی۔

"میں بس یوں ہی بیٹھی تھی۔" اس نے سادہ سے انداز میں جواب دیا۔ پھر ان کو وارڈروب کی جانب جاتا دیکھ کر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہوا' جیسے ممی تھکی تھکی سی ہیں۔ وہ صبح جب اسپتال کے لیے نکل رہی تھیں۔ تب بھی زارا نے انہیں بالکنی سے جاتے دیکھا تھا اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ بیمار ہیں۔

"کپڑے دیکھنے کے لیے نہیں ہوتے' پہننے کے لیے ہوتے ہیں۔" انہوں نے اس کے ہینگ کیے ہوئے سوٹوں کو دیکھ کر بات برائے بات کی تھی۔ وہ ہمہ وقت اس کے ملگجے اور شکنوں والے کپڑوں میں ملبوس ہونے کی وجہ سے اسے ٹوک رہی تھیں۔

زارا ابھی بے وجہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا چہرہ دیکھنے لگی کہ وہ مدعا بیان کریں۔ وہ طے کرچکی تھی کہ وہ ممی کے استفسار پر کہہ دے گی کہ آنے والے ویک اینڈ کے بعد سے وہ ڈیوٹی پر جانا شروع کردے گی' اور جب جانے کا دن آئے گا تو دل چاہے گا تو چلی جائے گی۔ ورنہ پھر کوئی بہانا بنالے گی۔ اسی لیے وہ ممی کی باتوں کے جواب دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔ دوسری جانب اس کی ممی صرف اس کے کپڑوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"تمہارے پاس گرمیوں کے سب کپڑے پرانے

ہیں نا۔ تم نے اس بار کوئی ایک بھی چیز نہیں خریدی۔ اتنے اچھے اچھے کلرز آئے ہیں بریزے پہ.... بھابھی بتا رہی تھیں، بہروز کے کسی دوست کی بہن نے صدر میں بوتیک بنائی ہے۔ بہت اچھے ڈریسز ہیں اور قیمت بھی مناسب.... کسی دن چلو میرے ساتھ.... تمہیں شوز اور بیگ بھی لے کر دوں.... یہ ہی ایک براؤن بیگ لیے پھرتی ہو۔ بہت پرانا ہو گیا ہے۔ تمہارا دل نہیں کرتا اپنے لیے شاپنگ کرنے کو.... لڑکیوں کو تو اتنا شوق ہوتا ہے خریداری کا۔"

انہوں نے وارڈروب کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا۔ پھر اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے الماری بند کی تھی۔ اور اس کے بستر پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ فرصت سے اس کے پاس بیٹھنے کے لیے آئی ہیں۔

زارا نے اپنی اکتاہٹ چھپاتے ہوئے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔ اس کی یادداشت میں کوئی ایسا لمحہ نہ تھا۔ جب ممی نے اس سے ایسے کوئی بات کی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ خریدتی یا لاتی نہیں تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے ہر سیزن میں اس کے لیے اپنی مرضی سے کپڑے، جوتے خرید لایا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ اس کے بچپن سے ہی چل رہا تھا۔ عمر کی شادی وہ پہلا موقع تھا۔ جب زارا نے اپنے لیے کوئی لباس خود جا کر خریدا تھا اور تب بھی وہ اپنی ممانی یعنی شہروز کی امی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔

"آپ لے آئیں میرے لیے.... مجھے کہاں سینس ہے ایسی چیزوں کا۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کا دل اور دماغ ایسی چیزوں میں نہیں لگتا تھا اب۔

"زارا.... یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اٹھ کر ان ہی کے پاس آرہی تھی۔ لیکن ان کا اس طرح کہنا اسے بہت عجیب لگا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس آگئی تھی۔

"کتنی کمزور ہو گئی ہو.... رنگ بھی کیسا زرد ہو گیا ہے.... کیوں اپنا خیال نہیں رکھتیں تم۔" وہ اتنے محبت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ زارا کو ان کا لہجہ نا صرف حیران کن بلکہ انوکھا بھی لگ رہا تھا۔

"بھول جاؤ سب باتوں کو.... سب لوگوں کو.... اپنے بارے میں سوچو، خوش رہا کرو۔" وہ اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے منت بھرے انداز میں بولی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو ممی.... میں خوش ہوں.... مجھے کیا ہوا ہے۔" وہ سابقہ انداز میں بولی۔

ان ماں، بیٹی کے درمیان ایسے محبت بھرے لمحے آئے ہی نہیں تھے، کبھی، سو اس کا حیران ہونا کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ اس نے اپنی ماں کو ہمیشہ ایک پریکٹیکل عورت کے روپ میں مصروف زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس سے لاپروا تھیں یا اس کو نظر انداز کرتی آئی تھیں۔ یہ ان کی فطرت تھی جو روبوٹک تھی۔ ان کے پاس جذبے تھے۔ لیکن وہ ان کے اظہار کے معاملے میں کنجوس تھیں اور یہ بات زارا سمجھتی تھی۔ لیکن اسے بھی عام اولاد کی طرح ماں کی اس فطرت سے چڑ تھی۔ اب جب وہ اس کے سامنے بیٹھی عام ماؤں کی طرح اس کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں، تو بھی زارا کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"میں کیا جانتی نہیں ہوں کہ تم کتنی خوش ہو۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر یک دم اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

زارا ایک لمحے کے لیے تو سن سی ہو گئی۔ اسے نہیں یاد تھا کہ اس کی ماں نے آخری دفعہ اسے کب گلے لگایا تھا۔ وہ چند ثانیے کے لیے ان کے لمس کو محسوس کرتی رہی۔ پھر اس نے خود کو ان کی بانہوں میں ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ کتنا سکون تھا، ماں کی آغوش میں اور اسے یہ آغوش اپنے ہوش و حواس میں اس انداز میں پہلی بار میسر ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں میں نمی کو محسوس کیا۔ ممی رو رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھی تر ہونے لگیں، لیکن کتنے مزے کے تھے یہ آنسو جو سکون عطا کر رہے تھے اور کوئی ان کو پونچھنے والا نہیں تھا اور ان

دونوں کو خواہش بھی نہیں تھی کہ کوئی ان آنسوؤں کو پونچھتا۔

"آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں کیا ہوا ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ مت پریشان ہوں ممی۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں پیپر دے ڈیوٹی پر چلی جاؤں گی۔" اس نے ان کو تسلی دی تھی۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی زارا۔۔۔! مجھے پہلے ہی ایسا لگتا ہے کہ میں نے تم پر اپنے فیصلے مسلط کرکے تمہیں مفلوج کردیا ہے۔ تمہیں اپنے اشاروں پر چلا چلا کر تمہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ تم اپنی مرضی سے اپنے لیے کوئی جوڑا ہی خرید لو۔ لیکن زارا! میری نیت پر شک مت کرنا میرے بچے۔ میں تمہاری ماں ہوں اور مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں چاہ سکتا۔ میں نے تمہیں اپنے پروں میں چھپا چھپا کر تمہاری پرورش کی، تاکہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو کوئی گزند نہ پہنچے۔ تم سے پہلے میرے تین بچے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اللہ کے پاس واپس چلے گئے۔ تمہیں بہت منتوں، مرادوں کے بعد پایا تھا۔ تم بہت قیمتی ہو میرے لیے۔ اسی لیے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہا کہ کوئی میری اتنی قیمتی بیٹی کو نقصان نہ پہنچا دے۔"

وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بول رہی تھیں۔ زارا کو عجیب سی شرمندگی ہوئی۔ وہ اسے صفائی کیوں دے رہی تھیں۔ اسے اس ساری صورت حال میں کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا تھا۔

"میں جانتی ہوں ممی۔۔۔ آپ ایسے بات مت کریں۔" وہ منہ ان کی جانب کیے بنا کہہ رہی تھی۔ زارا کچھ خوف زدہ ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھیں۔ ان کے دل کو یک دم کیا خدشات لاحق ہوگئے تھے۔ کیا ان کی ماموں یا شہوز سے کوئی بات ہوئی تھی۔ کیا پھر وہ اس کی شادی کے مسئلے کے لیے پریشان تھیں۔

"مجھے بات کرنے دو زارا۔ میں اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ میں آج کل بہت وہمی ہوگئی ہوں۔ زندگی، موت کا بھروسا کیا ہے۔ آج ہوں۔ کل نہیں رہوں گی۔ میرے بعد کون تمہیں سنبھالے گا زارا۔۔۔ کاش تمہارا کوئی بھائی ہوتا یا بہن ہی ہوتی، کوئی تو ہوتا، ماں، باپ کے بعد بہن، بھائی ہی ہوتے ہیں جو سہارا دیتے ہیں۔ باقی سب تو بے کار کے۔ بہلاوے ہیں۔ کوئی رشتہ دار، دوست احباب یا کزن، کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ سب کو اپنے مقصد، اپنے عزائم عزیز ہوتے ہیں۔ سب کے لیے اپنی ذات پہلے ہوتی ہے۔ باقی اس کے بعد آتے ہیں۔ یہ ہی دنیا ہے۔" ان کے لہجے میں اب کی بار عجب سی اکتاہٹ تھی۔ زارا دل میں چور سی ہوگئی۔

"آپ کی شہوز سے بات ہوئی ہے کیا؟" اس نے ان کی جانب دیکھے بنا سوال کیا تھا۔

"شہوز کی بات مت کرو۔ مجھے اس کے متعلق بات نہیں کرنی۔ مجھے آج کسی غیر متعلقہ شخص کے بارے میں بات نہیں کرنی۔ ہم آج اپنی باتیں کریں گے۔ وہ باتیں جو ہم نے آج تک نہیں کی ہیں۔ تمہاری اور میری باتیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں زارا! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ محبت۔۔۔ تم کبھی یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی تھی۔"

وہ بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ زارا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی گفتگو بے ربط تھی۔

"ممی! کیا ہوگیا ہے آپ کو۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ محبت کوئی ناپنے کی چیز تھوڑی ہوتی ہے کہ زیادہ یا کم کا فیصلہ کیا جائے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ پلیز، ایسی باتیں مت کریں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"ہاں۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔ کسی مال میں چلتے ہیں۔ ہم بھی تو دیکھیں زارا کہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں کتنی اہم ہوتی ہیں۔"

وہ کہہ رہی تھیں۔ زارا نے ان کے چہرے پر پھیلی بے چینی کو دیکھا تھا۔ ایسا پھیکا چہرہ ہو رہا تھا کہ شاید ہی پہلے کبھی ہوا ہو۔

"آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ آئیں، میں آپ کا بلڈ پریشر چیک کروں پہلے۔ کیا ہو رہا ہے آپ کو۔ مجھے بتائیں۔" اس نے بستر سے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے۔ ان کا ہاتھ تھاما۔۔۔

"ٹھیک ہوں میں۔۔۔ بس۔۔۔ یوں ہی۔۔۔ پتا نہیں۔" انہوں نے بے ربط سے انداز میں کہا۔ پھر وہ اسی کے بیڈ پر لیٹ گئی تھیں۔

زارا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی، لیکن ابھی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

"ممی۔۔۔ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ کیا ہوا ہے؟" وہ چلائی تھی۔ ممی نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا، خود کو سہلایا تھا اور اس کو دیکھ کر مسکرائی تھیں اور آنکھیں موند لی تھیں۔

"ممی ی ی۔۔۔" زارا ان پر جھپٹی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے ان کی نبض جانچی۔ سینے پر ہاتھ رکھا، پھر وہ فون کی جانب لپکی تھی۔ یہ ایمرجنسی کیس تھا۔ ایمبولینس کی فوری ضرورت تھی۔

☼ ☼ ☼

ماؤں کی ضرورت زندگی میں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کی محبت آکسیجن کی طرح ہوتی ہے، جس کی ضرورت آخری سانس تک رہتی ہے، اور جب یہ نہیں رہتیں تو ان کی ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ زارا نے یہ بات اپنی ممی کے جانے کے بعد سیکھی تھی۔ وہ بہت مضبوط عورت تھیں، اتنی مضبوط کہ انہوں نے اپنے اردگرد رہنے والوں کو بھی کبھی اپنی ذات میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ ممی کو اس کی پروا نہیں ہے۔ وہ اس کی پریشانیوں میں پریشان نہیں ہوتیں۔ وہ جب اتنی بے سکون رہتی ہے تو ماں ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ پرسکون رہتی ہیں۔ وہ پُریقین تھی کہ ممی اس سے محبت ہی نہیں کرتیں۔ وہ اس سے لاپروا رہتی تھیں، تو اس نے بھی ان سے لاپروا رہنا شروع کردیا۔ وہ اپنے اپنے دائروں میں اپنی اپنی زندگیاں جینے لگے تھے۔ انہوں نے ان دائروں کی خلاف ورزی کرکے ایک دوسرے کے ساتھ وہ مضبوط رابطہ بنانے کی کوشش ہی ترک کردی تھی جو تعلقات میں بے حد ضروری ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ممی کے انتقال نے اسے باور کروایا تھا کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی تھی۔

"کیا کوئی ایسے بھی چلا جاتا ہے چھوڑ کر۔" اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ابتدا میں سب لوگ آس پاس تھے۔ ماموں احسان بھی لندن سے آگئے تھے۔ تسلی دلاسا دینے کے لیے رونے کے لیے، کوئی نہ کوئی کندھا میسر رہا، لیکن پھر کچھ دن بعد ہی سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہونے لگے۔

شہوز بھی چند دن میں تین مہینوں کے لیے لندن جانے والا تھا۔ اس کی واپسی پر بالآخر یہ طے پاگیا تھا کہ ان دونوں کی شادی کردی جائے گی۔ زارا سب کے چہرے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی۔

اس نے ممی کی زندگی میں ہمیشہ ان کی مداخلت کو ناپسند کیا تھا اور اب ان کی وفات کے بعد وہ سارا دن یہ سوچتی رہتی تھی کہ اب کیا کرے گی، کیسے زندہ رہے گی۔ اسے ان کے بغیر ایک قدم اٹھانے کی بھی عادت نہیں رہی تھی، لیکن ان کی وفات سے اس نے یہ ضرور سیکھ لیا تھا کہ بعض اوقات بڑے بڑے حادثے زندگی میں انسان کو کمزور کرنے کے بجائے بہادر بنا دیتے ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے زندگی میں جو کرنا تھا، عقل مندی سے، بہادری سے کرنا تھا۔ اس کی غلطیوں پر پردے ڈالنے والی ماں اب نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔ دس منٹ میں اگر تم باہر نہیں آئیں تو نتائج کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔"

یہ دس دن بعد کی بات تھی۔ وہ ماسی سے گھر صاف کروا رہی تھی، جب فون کی بیپ بجی تھی۔ دوسری جانب ٹیپو تھا۔ زارا کو اس شخص کا انداز اب ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ ممی کی تدفین والے روز بھی وہ کچھ دیر

کے لیے آیا تھا' لیکن زارا سے بات نہیں ہو پائی تھی۔
"فرض کیجئے' میں نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے آپ۔"
اس نے بات کرنے کے ساتھ ساتھ ماسی کو اشارے سے میز کے نیچے سے کچرا نکالنے کے لیے کہا تھا۔ کافی دن سے صفائی ستھرائی ٹھیک سے نہ ہونے کے باعث کافی کچرا جمع تھا۔
"بحث کرنے کا وقت تو ہے میرے پاس' مگر آج ہمت نہیں ہے۔ تھکا ہوا ہوں۔ اس لیے مہربانی فرما کر دس منٹ میں تشریف لے آیئے۔" وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔
"کہاں جانا ہے؟" زارا نے منٹوں میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے اس کے ساتھ جانا ہے۔
"سوال مت پوچھو' تشریف لاؤ' سوال پوچھ پوچھ کر تم ذہین نہیں ہو جاؤ گی۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔
زارا نے فون بند کیا تھا' پھر ماسی کو ضروری ہدایات دے کر فریش ہونے میں اس نے واقعی دس منٹ ہی لگائے تھے۔ گیٹ کیپر کو گیٹ کھولنے کا کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور ابھی پوری طرح باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ وہ سامنے سرخ آلٹو میں بیٹھا نظر آگیا تھا۔ وہ اشارے کر رہا تھا کہ اپنی گاڑی اندر کرلو۔
زارا نے کچھ دیر سوچا تھا' پھر وہ گاڑی سے نکل آئی تھی۔ گیٹ کیپر کو چابی تھما کر وہ اس کی آلٹو میں آبیٹھی تھی۔
"اب تو بتادیں' کہاں جانا ہے؟" اس نے بیٹھتے ہی سوال کیا تھا۔ ٹیپو نے گاڑی ریورس کی تھی۔
"میرے گھر۔۔۔ اپنی امی سے ملواؤں گا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ زارا نے سر ہلایا۔ اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔
وہ رائے ونڈ کئی بار گئی تھی' لیکن کبھی ٹیپو کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ زارا جانتی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی امی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی امی کی باتیں بتاتا رہتا تھا۔ اس کی امی کی اور اس کی بہت نوک جھونک ہوتی تھی۔ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا اور ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ وہ چالیس منٹ میں رائے ونڈ پہنچ گئے تھے۔ ٹیپو نے اپنے گھر کے باہر ہی گاڑی روکی تھی۔ وہ بڑے سے گیٹ والا عام طرز کا گھر تھا' جس کے باہر پیپل کے گھنے درخت تھے' جبکہ بیرونی دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی بوگن ویلیا تھی۔ سخت گرمیوں کے دن تھے' لیکن وہاں اتنا سبزہ تھا کہ طبیعت ترو تازہ ہوگئی تھی۔
"تم اندر چلی جاؤ۔ میں ایک ضروری کام نپٹا کر آتا ہوں۔" اس نے زارا کے اترتے ہی کہا تھا اور خود آگے بڑھ گیا تھا۔ زارا ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ بنا تعارف اندر کیسے جاسکتی تھی' پھر اس کا خیال تھا کہ اس کی امی گاؤں کی سادہ' ان پڑھ عورت ہوں گی۔ وہ ان کو کیا بتاتی کہ وہ کون ہے۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھی کہ اندر جائے یا نہ جائے' جب گیٹ خود بخود کھل گیا تھا۔
"آؤ۔۔۔ اندر آجاؤ۔ کب سے کھڑی ہو یہاں۔" ایک خاتون نے ذرا سا باہر نکل کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ زارا چپ چاپ اندر داخل ہوگئی تھی۔
وہ گھر باہر سے جتنا سبز تھا' اندر سے اس سے زیادہ ہرا بھرا تھا۔ سرخ اینٹوں کے فرش سے سجا بڑا سا صحن جس کے ساتھ ساتھ کیاریاں تھیں۔ مختلف پودے' پھول اور پھولوں کی خوشبوں نے ایک ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ گاؤں کے گھروں کا ایسا تصور تو کبھی نہیں کیا تھا اس نے۔ ٹیپو کی امی نے برآمدے کی جانب اس کی رہنمائی کی تھی۔ برآمدہ بھی اے سی نہ ہونے کے باوجود ٹھنڈا تھا۔ ایک جانب دیوان پڑا تھا' جبکہ اس کے سامنے سفید آئرن راڈ کی کرسیاں تھیں جن کی دونوں طرف تپائیاں تھیں۔ دیواروں پر بھی ایسی آرائشی چیزیں تھیں' جن کو دیکھ زارا کا وہ تصور ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جو اس نے گاؤں کے گھروں کے متعلق ذہن میں بٹھا رکھا تھا۔
"یہاں تخت پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تھک گئی ہوگی۔"
ٹیپو کی امی نے پنکھا آن کیا تھا' پھر اسے کرسی پر بیٹھتا دیکھ کر بولی تھیں۔
زارا نے ان کی بات سے انکار نہیں کیا تھا' وہ گھر کا جائزہ لینے کے بعد اب ان کی جانب دیکھ رہی تھی اور ان کو دیکھ کر بھی اسے حیرانی ہی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں ٹیپو کی امی کا جو حلیہ تھا' وہ بھی فلموں کے تناظر میں سوچا تھا اس نے۔۔۔ ایک فربہی مائل عورت جو کھلے پائنچوں والی شلوار پہنے سر پر چادر کی بکل مارے' بالوں میں ڈھیروں تیل ڈالے آنکھوں کو سرمے کی دھار سے سجائے دودھ دہی کی خوشبو سے مہکتا وجود نظر آئے گی۔ وہ ٹیپو کی امی تھیں۔ یہ کیسے ممکن تھا' وہ زارا کو حیران نہ کرتیں۔ وہ لباس تو عام سا ہی پہنے ہوئے تھیں۔ لیکن اس پر کوئی شکن نہیں تھی۔ انہوں نے مانگ نکال کر چٹیا بنا کر رکھی تھی۔ صاف ستھرے ہاتھ پاؤں والی وہ خاتون پہلی نظر میں ہی پڑھی لکھی لگتی تھیں۔ وہ اس کی ممی جیسی ماڈرن خاتون تو نہیں تھیں' لیکن شہروں میں رہنے والی عام خواتین جیسی خاتون تھیں۔
"تم آمنہ ہو؟" انہوں نے سوال کیا تھا۔
"نہیں۔۔۔ میں زارا ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"اوکے۔۔۔ معاف کرنا۔ میں نہیں جانتی تھی۔ دراصل میرے بیٹے کو ایسے ادھورے کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اس نے آمنہ کا ذکر کیا تھا' اس لیے میں نے سوچا' شاید تم آمنہ ہو۔" وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔
"نہیں۔ میں زارا ہوں۔ آمنہ کون ہے؟" اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا تھا۔ اس نے ٹیپو کے منہ سے کبھی آمنہ کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ٹیپو کی امی نے اس کی جانب دیکھا' پھر جیسے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔
"زارا۔۔۔" انہوں نے دہرایا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ نام سن رکھا ہے یا نہیں۔ زارا خاموش رہی تھی۔
"تمہاری والدہ کا انتقال ہوا ہے نا' ہاں یاد آگیا۔ ذکر کیا تھا ٹیپو نے۔ بس بیٹا! تمہارا نقصان تو بہت ہوا۔ ماں کا چلے جانا بڑا المیہ ہے' لیکن رب کی جو مرضی' اللہ تمہیں صبر و استقامت دے' ہمت دے' آمین۔"
وہ کہہ رہی تھیں۔ زارا ابھی بھی خاموشی سے بیٹھی رہی۔ ایسی باتوں کے جواب خاموشی ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ بھی چند لمحے کے لیے خاموش رہی تھیں۔
"زارا! میں ابھی اسکول سے آئی ہوں۔ کھانا بھی نہیں کھایا ہوا میں نے۔۔۔ تمہیں بھی بھوک لگی ہوگی۔ ایسا کرو' تم میرے ساتھ کچن میں ہی آجاؤ۔"
وہ بڑی پھرتیلی سی عورت لگ رہی تھیں۔ زارا کو بھی یہ ہی بہتر لگا۔ وہ ان کو اٹھتا دیکھ کر ان کے ساتھ کچن میں آگئی تھی۔ کچن بھی اچھا اور کافی وسیع تھا۔ ایک دیوار کی جانب شیلف اور کیبنز تھے۔ باقی سارا کچن خالی تھا۔ انہوں نے ایک کیبن کھول کر اس میں سے فولڈنگ کرسی اور چھوٹی سی میز نکالی تھی' پھر کھول کر اس کے لیے رکھ دی تھی۔
"میں آٹا گوندھ چکی ہوں۔ مولیاں کرش کی ہوئی ہیں۔ تم مولی کا پراٹھا کھالو گی نا؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔ زارا اس ساری گفتگو میں پہلی بار مسکرائی تھی۔ ان کا انداز بہت دوستانہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل بھی تکلف نہیں برت رہی تھیں' جو اسے اچھا لگ رہا تھا۔
"جی ہاں۔۔۔ کھالوں گی۔" اس نے بھی رسمی طور پر "نہیں انٹس اوکے' آپ رہنے دیں" کی گردان کرکے ان کے خلوص کی ناقدری نہیں کی تھی۔ انہوں نے چولہا جلایا' پھر اس پر توا رکھ کر اس کی جانب دیکھے بنا بولیں۔
"تم ذرا فریج سے چٹنی نکالو اور وہاں پانی کی بوتل بھی ہوگی۔" زارا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"وہاں شیلف پر اچار بھی رکھا ہے۔" انہوں نے دوسرا حکم دیا تھا۔
زارا اچار کا جار بھی اٹھا لائی تھی۔ انہوں نے تب تک پراٹھا بیل لیا تھا۔ چند لمحوں بعد سنہرا سنہرا گرما گرم پراٹھا اس کے سامنے موجود تھا۔ انہوں نے اپنے اور اس کے لیے پراٹھے بنائے اور موڑھا لے کر اس کے

ساتھ ہی آبیٹھیں۔ انہیں پندرہ منٹ ہی لگے تھے یہ سارا کام نپٹانے میں ' جبکہ ذرا سی بھی بے ترتیبی نہیں پھیلی تھی۔ پراٹھے بھی ذائقہ دار اور خستہ تھے۔

"اب بتاؤ زارا! کیا کرتی ہو تم ' پڑھ رہی ہو؟" انہوں نے کھانے کے دوران ہی پوچھا تھا۔

"نہیں.... ڈاکٹر ہوں۔" اس کا جواب مختصر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا سوال پوچھتیں ' زارا نے پوچھا تھا۔

"آپ ٹیچر ہیں؟"

"جب ٹیپو جیسی نالائق اولاد ہو تو ماں کو ٹیچر بننا ہی پڑتا ہے۔" وہ اچار کی گٹھلی کو منہ میں رکھ کر چوستے ہوئے بول رہی تھیں۔

"آپ نے ذکر کیا تھا نا کہ آپ اسکول سے آئی ہیں تو اس لیے میں نے سمجھا کہ آپ ٹیچر ہیں۔" زارا نے وضاحت دی تھی۔

"میں نے اپنا ایک سکول بنا رکھا ہے ' سلائی اسکول ' وہاں پر ہفتے میں پانچ دن غریب کام کاج کرنے والے بچوں کے لیے بنیادی ابتدائی تعلیم کا اہتمام بھی کرتی ہوں۔ ٹیچر بھی سمجھ لو ' پرنسپل بھی ' فراغت راس نہیں آتی ہم جیسے لوگوں کو.... اب صبح اسکول چلی جاتی ہوں۔ شام کو بچیاں گھر پر بھی ٹیوشن پڑھنے آجاتی ہیں۔"

"اور رات کو امی خود پڑھتی ہیں۔ وہ پٹیاں جو امی کو امی کی سہیلیاں اور اردگرد کے لوگ میرے بارے میں آکر پڑھاتے ہیں۔ بہت پڑھنے لکھنے والی خاتون ہیں میری امی۔" یہ ٹیپو نے کہا تھا۔ زارا نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ امی کوئی جواب دیتیں ' وہ اس سے پوچھنے لگا تھا۔

"امی کی باتوں کا برا نہ ماننا۔ یہ بہت بورنگ خاتون ہیں۔" اس سے پہلے کہ آنٹی کوئی جواب دیتیں ' وہ کھٹ سے باہر چلا گیا تھا۔ زارا ہنسنے لگی تھی ' جبکہ وہ ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں بیٹھی لقمہ بناتی رہیں۔

"ٹیوشن میں کیا مضامین پڑھاتی ہیں آپ؟" زارا کو ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

"سب کچھ.... تمام مضامین جو ابتدائی کلاسز میں ضروری ہوتے ہیں۔ انگلش ' میتھ ' اردو.... زیادہ تر لڑکیاں انگلش سے خار کھاتی ہیں اور انگلش میں مدد چاہتی ہیں۔ اسکول میں بھی اسی طرح کا حساب ہے۔ دراصل یہ عام طرز کا اسکول نہیں ہے۔ ہم کوئی ہارڈ اینڈ فاسٹ رولز پر نہیں چلتے۔ ہمارے پاس بہت غریب طبقے کے بچے ہیں جو ایک نوٹ بک بھی افورڈ نہیں کرسکتے۔ یہ عام کچرا چننے والے ' ہوٹلوں میں کام کرنے والے اور دکانوں پر جھاڑو پونچھا کرنے والے بچے ہیں جو ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم انہیں اس قابل کرتے ہیں کہ یہ علم کی اہمیت کو سمجھ سکیں اور اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کرسکیں کہ انہیں اپنی عزت نفس کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی روزی روٹی کیسے کمانی ہے۔ میں تعلیم کے ساتھ ہنر سیکھنے کو برا نہیں سمجھتی۔ اسی لیے میں انہیں کام کرنے سے منع نہیں کرتی۔" وہ تحمل بھرے انداز میں سمجھا رہی تھیں۔

"امی! آپ بہت باتیں کرتی ہیں۔ اب اٹھ جائیں اور میرے لیے کڑکڑ کرتا خستہ سا پراٹھا بنا کر لائیں۔"

ٹیپو ایک بار پھر آدھمکا تھا اور اس نے ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ زارا نے دیکھا ' انہوں نے ابھی بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور چولہے کے پاس جا کھڑی ہوئی تھیں۔ ٹیپو ان کی جگہ پر آبیٹھا تھا۔ زارا کا کھانا ابھی بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

"آپ نے ڈاکٹر صاحبہ کو بیٹھک میں اے سی چلا کر بٹھانا تھا نا۔ یہاں بٹھا دیا ' تاکہ اے سی نہ چلانا پڑے اور آپ کا خرچا بچ جائے۔ بہت بری بات ہے امی! مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اتنی کنجوسی اچھی نہیں ہوتی۔" وہ مسلسل بول رہا تھا ' جبکہ دوسری جانب بالکل خاموشی تھی۔

"اے خوب صورت خاتون! کوئی جواب نہیں دینا چاہتیں تو ایک محبت کی نظر ہی ڈال لیں۔ کسی غریب کا بھلا ہوجائے گا۔" وہ ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا تھا۔ زارا کو لگا انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی ہے۔ وہ زارا کو اشاروں میں بتا رہا تھا کہ امی ناراض ہیں۔

"حسن والوں سے اللہ بچائے۔ ماہ جمالوں سے اللہ بچائے!" ٹیپو ان کی بے اعتنائی دیکھ کر گانا گانے لگا تھا۔ انہوں نے میز پر اس کی پلیٹ رکھی تھی اور توے سے پراٹھا چمٹے کی مدد سے اٹھا کر ڈائریکٹ اس کی پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ پھر ٹیپو کے سر پر چپت لگائی تھی۔

"کھانا کھاؤ.... گانا بعد میں بھی گایا جاسکتا ہے۔"

"آپ نے کھانا کھالیا۔ آئیں میرے حصے کے رزق کی برکت بڑھائیں۔" اس نے ان کو دعوت دی تھی۔

زارا نے دیکھا۔ آنٹی چائے کا پانی چولہے پر رکھ رہی تھیں۔ ٹیپو نے گرم پراٹھے کا ایک لقمہ بنایا تھا۔ پھر اسے چٹنی میں ڈبو کر اپنی امی کے پاس چلا گیا تھا اور وہ لقمہ ان کے منہ کی جانب بڑھایا تھا۔ زارا کو بہت اچھا لگا۔ محبت کے یہ پُرخلوص مظاہرے اس کی زندگی میں کم کم ہی آئے تھے۔

"ڈرامے بازیاں بہت آتی ہیں میرے لعل کو۔" آنٹی مسکرائی تھیں۔

"میری تعریفیں چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ ڈاکٹر صاحبہ کی آؤ بھگت اچھے طریقے سے کی ہے نا آپ نے.... شہر والوں کو پتا چلنا چاہیے کہ پینڈو کتنے مہمان نواز ہوتے ہیں۔" وہ اب رغبت سے کھانا کھانے لگا تھا۔

"تمہارے کام اتنی عجلت والے ہوتے ہیں کہ سب بگڑ جاتا ہے۔ تم مجھے پہلے سے بتاتے تو میں کچھ اچھا بنالیتی۔" آنٹی شرمندہ ہوئی تھیں۔

"کھانا اچھا نہیں تھا کیا؟ آئی ایم سوری ڈاکٹر! امی کو اچھا کھانا نہیں بنانا آتا۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ ذرا کم ہے۔" ٹیپو اپنی امی کو چڑا رہا تھا۔

"بکو مت.... میرے کہنے کا مطلب تھا کہ کوئی اچھی ڈش بنالیتی۔ بتاؤ مولی کے پراٹھے پر ٹرخا دیا بے چاری کو.... اور اس سے بھی بری بات یہ ہوئی کہ میں سمجھی یہ آمنہ ہے۔" وہ ساس پین میں دودھ ڈال رہی تھیں۔

زارا کو لگا آمنہ کے ذکر پر ٹیپو کچھ چپ سا ہوا ہے۔

"آپ نے بتا دیا کہ آمنہ کون ہے۔" وہ گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔ زارا کو محسوس ہوا اس کے تاثرات مصنوعی ہیں۔

"ارے مجھے بھی کہاں پتا ہے کہ آمنہ کون ہے۔ زارا! تمہیں پتا ہے کہ آمنہ کون ہے؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔ زارا نے نفی میں سر ہلایا ' جبکہ ٹیپو ان کو چپ رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ زارا سوالیہ انداز میں آنٹی کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"امی! اب کیا ساری باتیں باہر والوں کو بتادیں گی۔ راز کی باتیں چھپا کر رکھنے کی ہوتی ہیں۔" وہ ہنس بھی رہا تھا اور انہیں روک بھی رہا تھا۔ زارا کو بہت حیرانی ہوئی۔ وہ اس شخص سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

"چپ کرو.... جو گھر کے اندر آجاتا ہے ' وہ باہر والا نہیں ہوتا۔ زارا! میں تمہیں بتاتی ہوں ' سارا معاملہ کیا ہے۔ دراصل میں جب بھی اس سے شادی کا ذکر کرتی ہوں تو یہ کہتا ہے۔ آمنہ سے کروں گا۔ آمنہ سے کروں گا اور جب میں کہتی ہوں۔ مجھے آمنہ سے ملواؤ تو یہ بہانے بنانے لگتا ہے اور کہتا ہے آمنہ مان جائے گی تو ملواؤں گا۔ وہ جب کہے گی تب اس کے گھر لے جاؤں گا۔ آمنہ راضی ہوتی ہے نہ یہ مجھے اس سے ملواتا ہے۔ اسی لیے تمہیں دیکھ کر میں سمجھی ' شاید تم آمنہ ہو.... لیکن اب مجھے لگ رہا ہے ' یہ جھوٹ بولتا ہے مجھ سے.... آمنہ کوئی ہے ہی نہیں.... مجھے ٹالنے کے لیے کسی فرضی لڑکی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔" وہ کافی چڑ کر بول رہی تھیں۔ زارا نے سوالیہ انداز میں ٹیپو کا چہرہ دیکھا۔ آنٹی کپوں میں چائے انڈیلنے لگی تھیں۔

"کون ہے آمنہ؟" زارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ ٹیپو کی زندگی کا ایک ذاتی معاملہ اسے پتا چل رہا تھا۔

"اب مگروں پے جاؤ (پیچھے پڑجاؤ) ایک پراٹھا تم کھا نہیں سکتیں۔ میرا دماغ پورا کھا جاتی ہو۔" وہ اس کے نامکمل پراٹھے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ زارا کا پیٹ بھر
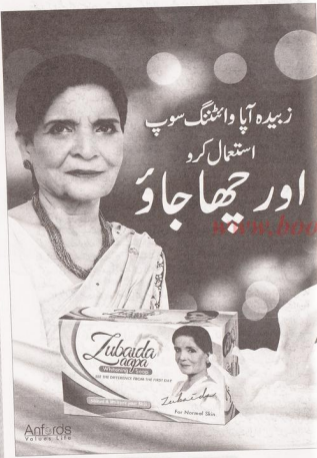
چکا تھا۔ لیکن پراٹھا ابھی بھی تھوڑا سا باقی تھا۔

"بتائیں نا کون ہے آمنہ؟" زارا نے اس کی بات کو دھیان سے سنا ہی نہیں تھا۔

"امی! اس کو میرے پیچھے لگا دیا۔ اس کو نہ بتایا تو اس نے رونے لگ جانا ہے۔" وہ اٹھ کر سنک پر ہاتھ دھونے لگا تھا' پھر شیلف پر پڑے چائے کے کپ اٹھا کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ آنٹی سنک میں پڑے برتن دھونے لگی تھیں۔

"آمنہ ایک اچھی لڑکی ہے' تمہاری جیسی اور کیا بتاؤں؟" اس کا چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"کیا کرتی ہے؟" زارا کو بڑا خوش گوار سا تجسس ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں کرتی' میری طرح بونگیاں مارتی ہے اور بھیڑ' بکریاں چراتی ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"تم کس کی باتوں میں آ گئی ہو زارا.... یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے یقین ہے آمنہ کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ سب بہانے ہیں اس کے۔"

آنٹی نے اپنا چائے کا کپ اٹھایا تھا اور اسے اشارہ کیا تھا کہ اپنا کپ لے کر دوسرے کمرے میں آ جائے۔ ٹیپو کچھ نہیں بولا تھا۔ زارا سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ سچ بول رہا ہے یا اس کی امی.... آنٹی چونکہ باہر بلا رہی تھیں۔ اس لیے وہ مزید کچھ کہے بنا اپنا کپ اٹھا کر ان کے پیچھے چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ ساری زمین میری ہے۔" آنٹی رافعہ نے اپنے سامنے پھیلے تاحد نگاہ لہلہاتے کھیتوں کی جانب اشارہ کر کے اسے بتایا تھا۔

"یہ ساری...." زارا حیران ہوئی۔ اس کے خاندان میں دور' دور تک کوئی گاؤں سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس نے صرف سن رکھا تھا کہ لوگوں کی ذاتی زرعی زمینیں بھی ہوتی ہیں اور آج وہ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ رہی تھی۔ ٹیپو کھانا کھانے کے بعد چونکہ کہیں باہر نکل گیا تھا۔ اب زارا اس کی منتظر تھی کہ وہ واپس آئے تو اسے واپس چھوڑ کر آئے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی تھکی تھکی کرنیں اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اگلی منزل کی تیاری کر رہی تھیں اور جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی تھی' وہاں تک صرف سبزہ ہی نظر آ رہا تھا۔

آنٹی اسے گھر سے باہر اپنا اسکول دکھانے لے جا رہی تھیں۔ گھر کے پچھلی جانب سے گزرتے ہوئے انہوں نے اسے سرسری سے انداز میں بتایا تھا کہ یہ ساری زرعی زمین ان کی ہے۔ زارا نے سن رکھا تھا کہ یہ بہت فخر کا حوالہ ہوتا ہے' لیکن آنٹی رافعہ نے قطعاً" کسی تفاخر کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ آنٹی رافعہ سے مل کر اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔ ان کی سوچ بہت مثبت تھی۔ حالانکہ انہوں نے بتایا کہ وہ صرف تیس سال کی تھیں۔ جب بیوہ ہو گئیں۔ اس کے باوجود زارا نے ساری دوپہر ان کے منہ سے مختلف باتیں سنی تھیں' لیکن ایک بھی دفعہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کی زندگی میں کبھی کوئی مشکل بھی آئی تھی۔ وہ اپنی ذات سے متعلق بات ہی کم کرتی تھیں۔ ان کی ساری گفتگو اپنے اسکول' اپنے طلبا کے گرد گھومتی رہی اور زارا حیران تھی کہ وہ اس کام کا کریڈٹ بھی نہیں لیتی تھیں۔ ابھی بھی ان کا انداز دیکھ کر زارا بہت متاثر ہوئی۔

"آپ بہت اچھی ہیں آنٹی۔ اتنی عاجزی میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔" وہ یک دم چلتے چلتے ان کا ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔ آنٹی اس فعل سے حیران ہوئیں' پھر انہوں نے سر ہلایا۔

"یہ کوئی خوبی نہیں ہے۔ یہ میری خود غرضی ہے۔ عاجزی انسان کی شخصیت کا سنگھار ہے۔ اس کو اپنانے سے انسان خوب صورت لگنے لگتا ہے اور خوب صورت لگنے کا مجھے بڑا شوق ہے۔ کیا کروں عورت ہو نا۔" وہ اپنے بیٹے کی ہی ماں تھیں۔ وہ دونوں دانائی کا مزاحیہ ورژن تھے۔ زارا ان سے متاثر ہوئی جا رہی تھی۔

"آنٹی! مجھے بھی خوب صورت ہونا ہے۔ ایسا

سنگھار کرنا مجھے بھی سکھا دیں۔" وہ ان ہی کے انداز میں بولی تھی۔ آنٹی نے اس کی جانب دیکھا۔

"تم تو پہلے ہی اتنی خوب صورت ہو اور مزید خوب صورت ہونے کے لیے اللہ نے مواقع بھی بے شمار دیے ہیں۔ تم مسیحا ہو' مسیحائی کے ساتھ عاجزی تو کلر کومبو ہے بھئی۔" وہ اتنی سی دیر میں زارا سے کافی بے تکلّف ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں ایک گھر کے پاس رک گئی تھیں۔ آنٹی نے ہاتھ میں پکڑی چابی سے دروازے پر لگا تالا کھول کر پورا در وا کر دیا تھا۔

"آنٹی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں بھی ایسا کچھ کرنا چاہتی ہوں کہ آپ جیسی ہو جاؤں۔ اچھی ہو جاؤں۔ اپنی ممی کے لیے صدقہ جاریہ بن سکوں۔" وہ منت بھرے انداز میں بولی تھی۔ آنٹی نے ایک جانب لگے سوئچ بورڈ کا بٹن دبا کر لائٹ آن کی تھی۔

"کیا تم اچھی نہیں ہو۔" وہ نجانے پوچھ رہی تھیں یا بتا رہی تھیں۔

"آنٹی! اچھی ہوتی تو بے سکون کیوں ہوتی۔ میرے دل کو چین نہیں آتا۔ میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔ میرے اردگرد والوں کے لیے میں ایک بے کار چیز کے سوا کچھ نہیں ہوں۔" وہ مغموم لہجے میں بولی تھی۔ آنٹی رافعہ نے ناپسندیدگی سے اس کی جانب دیکھا۔

"زارا! تم بھی بہت اچھی ہو' فضول باتیں مت کرو' مجھے تمہاری باتیں سن کر اندازہ ہوا ہے کہ تمہیں فراغت کی بیماری ہے۔ جس کی بنا پر تم صرف اپنے آپ کے گرد چکر لگاتی رہتی ہو۔ اپنی ذات کے جنگل سے باہر نکل کر دیکھو۔ باہر آؤ اس خود ترسی سے۔ مجھے زندگی میں صرف خود ترسی سے نفرت ہے۔ یہ انسان کی ساری طاقت' ساری توانائی کھا جاتی ہے۔ بتاؤ سکون کیسے ملے گا۔ ارے لڑکی! ذاتی سکون تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ وہ اللہ نے انسان کے اندر کہیں چھپا کر رکھا ہوتا ہے۔ تمہارا سکون تمہاری اپنی ذات میں کہیں مقید ہے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم دوسروں کا سکون تلاش کرنے میں ان کی مدد کرو۔ اپنے اردگرد بکھرے لوگوں کو دیکھو۔ ان کے مسائل کو سنو' ان کے دکھوں کو محسوس کرو' اپنے بارے میں کم دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچو۔ اپنی توانائیوں کو مثبت انداز میں استعمال کرو۔" انہوں نے ڈپٹ کر کہا تھا' پھر ایک دم سے اس کی جانب مڑیں۔

"تم میں بہت انرجی ہے۔ تم اس کو سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی ہو۔ اب یہ چھلکنے لگی ہے۔ یہ جو تمہارا ڈپریشن ہے نا۔ یہ اسی بنا پر ہے کہ ہم میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا' لیکن تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ انرجی ضائع ہو رہی ہے۔ انسان کی انرجی ضائع ہو گی تو اس کا دل تو دکھے گا نہ۔ کب تک دکھے گا۔ جاگ جاؤ۔ کوئی اور تھوڑی آئے گا تمہاری مدد کرنے کو۔ تمہیں خود ہی ہمّت کرنی ہو گی۔" وہ نصیحت بھی کتنے اچھے انداز میں کرتی تھیں۔

"فرض کرو زارا! اگر بلبل کو راستہ دکھانے کے لیے جگنو نہیں ملتا تو کیا وہ گم ہو جاتا۔ رستہ تلاش نہ کر پاتا؟" انہوں نے ایک عجیب سا سوال کیا تھا۔

"نہیں..... وہ کبھی گم نہ ہوتا۔ اس کو چند لمحوں بعد خود بخود تاریکی میں نظر آنے لگتا۔ اس کی حسیات تاریکی کو شکست دینے کے قابل ہو جاتیں۔ راستہ خود بخود نظر آ جاتا۔ یہ ہی قانون قدرت ہے۔ جگنو کا انتظار مت کرو بچے' جگنو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوا کرتے۔"

وہ بے حد سنجیدہ' مگر محبت بھرے انداز میں سمجھا رہی تھیں۔ زارا چپ چاپ ان کے پیچھے چلتے ہوئے ان کی جانب دیکھنے لگی۔

"جگنو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتے۔ میں آپ سے نہ ملی ہوتی تو ایسے ہی سوچتی۔" وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے یہ ہی سوچ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

زارا نے واپسی پر ٹیپو سے کہا تھا۔ رات اتری نہیں تھی' مگر اترنے والی تھی۔ موسم گرم تھا' مگر شام کی اپنی نرم و نازک مسحور کر دینے والی ادائیں تھیں۔ ہوا بہت تیز نہیں چل رہی تھی' لیکن جو بھی جھونکا آتا تھا' مایوس نہیں کرتا تھا۔ زارا کھڑکی کے شیشے سے بھی باہر دیکھ رہی تھی اور ونڈ اسکرین سے بھی سامنے نظر ڈالتی جاتی تھی۔ اس کو آج پھر ایک نئی امید کے انجیکشن لگے تھے۔ وہ مطمئن تھی۔ اس نے عزم مصمم کر لیا تھا اور اس پر قائم بھی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔ میں رات کو شکرانے کے نوافل ضرور ادا کروں گا۔ تم بھی کر لینا۔" ٹیپو کا انداز ہمیشہ کی طرح چڑا دینے والا تھا۔

"آپ میرے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ دیں گے۔ میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانا چاہتی ہوں۔ اپنے علاقے میں کوئی چھوٹا اچھا گھر ڈھونڈ دیں گے نا آپ۔ لیب اور فارمیسی بھی وہیں بناؤں گی۔" وہ اس سے درخواست کر رہی تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ یہ آئیڈیا فیزیبل ہے۔ کلینک بنانا بے شک دنوں کا کام ہے' لیکن اسے چلانا سالوں کا کام ہوتا ہے۔ آپ تو سال' چھ مہینے میں رخصت ہو جائیں گی شہروز میاں کے سنگ..... اس کے بعد میں یا میری امی اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سنبھال سکیں گے میڈم۔" وہ اب کی بار سنجیدہ تھا۔

"آپ ہمیشہ نصیحتوں کی دکان نہ کھول کر بیٹھے رہا کریں۔ بوریت ہونے لگتی ہے۔ کوئی اچھی بات کریں۔ آپ کی گاڑی میں کوئی ببل گم وغیرہ یا چپس کا پیکٹ نہیں ہوتا۔ شہروز تو ہمیشہ چاکلیٹ رکھتا ہے۔"

زارا سنجیدہ نہیں تھی۔ اس نے پسنجر سیٹ والا چیمبر کھولتے ہوئے غیر سنجیدہ انداز میں کہا تھا۔

"میں آئندہ دھیان رکھوں گا جی۔ کون سی چاکلیٹ پسند ہے محترمہ کو؟" وہ شاید ابھی کچھ اور بھی کہتا لیکن چیمبر کے کھلتے ہی کچھ کاغذات اس کی گود میں آ گرے تھے۔

"عہد الست۔"

زارا نے نمایاں کر کے لکھا یہ لفظ پڑھا تھا' ٹیپو نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اسے ہی سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"مجھے نور محمد سے ملنا ہے۔" میں نے سوالیہ انداز میں اپنی جانب دیکھتے اس شخص کو جواب دیا تھا۔ یہ لوٹن کی جامع مسجد تھی جہاں آنے سے پہلے میں نے بہت سوچا تھا اور ہر بار میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ مجھے اس شخص سے ملنا ہی تھا۔ یہ 2006ء کے ابتدائی مہینوں کی بات تھی۔

بہار کے خوش نما رنگ ہر جانب بکھرے تھے۔ لندن موسم بہار کو بہت محبت سے منانے کا عادی رہا ہے اور لندنر ہونے کی وجہ سے میں نے ہمیشہ بہار کا استقبال خوش دلی سے کیا تھا لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے میں نے ہر چیز سے کنارہ کیا ہوا تھا۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے یو پی ایل کی بتائی ہوئی تمام تر تفصیل کی روشنی میں کام کر رہا تھا۔ میں اپنا آخری ناول لکھنا چاہتا تھا اور یہی ناول دراصل میرا پہلا ناول بھی تھا۔ میں نے لوٹن میں ایک گھر لیا تھا اور اپنی تمام ضروری اشیا وہاں منتقل کر لی تھیں۔ جامع مسجد میں باقاعدہ داخل ہونے سے بھی پہلے میں کئی روز تک باہر جائزہ لیتا رہا تھا۔ میرے دل میں کشمکش جاری تھی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے اس مسجد کے اندر جانا ہی تھا۔

"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ۔" اس شخص نے مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اس سوال کی توقع تھی اور میں اس کا جواب تیار کر کے لایا تھا لیکن مجھے جواب دینے میں وقت لگ رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی گہری سانس بھری۔ یہ عام عبادت گاہوں جیسی عبادت گاہ تھی۔ میں نے زندگی میں پہلے بھی چند ایک مساجد دیکھ رکھی تھیں۔ یہاں کا انٹیریر بھی ان ہی مساجد جیسا سادہ تھا۔ لیکن لوٹن کی مسجد میں مجھے بے سکونی کا جو احساس ہو رہا تھا وہ پہلے کہیں اور نہیں ہوا تھا' حالانکہ ٹیا کے ساتھ میں نے بہت سے ٹیمپلز دیکھے تھے۔ ہم نے اسپین اور سری لنکا میں بھی مسلمانوں کی مساجد اور بدھسٹ کی پرانی پرانی عبادت گاہیں دیکھی تھیں۔ ہمیں وہاں جا کر اچھا لگتا تھا لیکن آج جو بے چینی دل کو

لاحق تھی' وہ ایک نیا تجربہ تھا۔

"کیا کام ہے آپ کو نور محمد سے؟" اس شخص نے مجھے مسلسل خاموش پاکر دوسرا سوال کیا تھا۔ میں نے غائب دماغی سے اس کی جانب دیکھا۔

میں جو سوچ کر آیا تھا مجھے وہی کرنا تھا۔ میرے تذبذب کا میرے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اپنے فیصلے پر قائم تھا لیکن میرا دل بے چین تھا اور اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں یہاں آنے سے پہلے سارا ہوم ورک کر کے مسجد میں آیا تھا' جو مسلمانوں کی عبادت گاہ تھی اور دہشت گردوں کی آماجگاہ۔ یہاں دنیا کو برباد کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ دنیا جن بھوتوں سے زیادہ ان سے خوف کھاتی تھی۔ کیا میں نے یہاں آکر کوئی غلطی تو نہیں کرلی تھی۔ میری حقیقت جان کر یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے' یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن میں پھر بھی یہاں موجود تھا۔

"یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر۔ اللہ سبحان تعالیٰ! آپ (اللہ) سے میری کوئی پہچان نہیں ہے۔ میں آپ کو نہیں جانتا لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو آپ کو نہیں جانتے کیا آپ بھی ان کو نہیں جانتے۔"

میں نے دل میں پھر دہرایا تھا۔ یہ بات میں ایک عرصے سے خود کو باور کروا تا رہا تھا۔ میں اس بات کا منکر نہیں تھا کہ دنیا کو چلانے والی ایک عظیم مقدس طاقت ہے۔ میں قدرت کا معترف تھا۔ میں اس کے کسی اصول سے انحراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی مذہب کے خلاف شرانگیزی پھیلانے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن کسی مذہب کے نام پر دنیا میں دہشت پھیلانے کا حق بھی کسی کو نہیں تھا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں اس فلاسفی کو بے نقاب کرسکوں' جو دنیا کو کسی مذہب کے نام پر دہشت اور خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ میں نے ایک اور گہری سانس بھری۔

"میں نو مسلم ہوں" میں نے کہہ دیا تھا۔ یہ ایک بہت اونچی چوٹی سے گہری کھائی میں چھلانگ لگانے کے مترادف تھا اور میں نے چھلانگ لگادی تھی۔ اس شخص کے چہرے پر مروت والی مسکراہٹ محبت والی مسکراہٹ میں بدلی۔

"ماشاءاللہ۔ بہت مبارک ہو آپ کو۔"

"میرا نام احمد معروف ہے۔ میں اسلام کے بارے میں کتابوں میں پڑھ چکا ہوں لیکن میں اب باقاعدہ دین کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسی سلسلے میں نور محمد صاحب سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔" میں نے وہ کہہ دیا جو میں نے کہنا تھا۔ وہ شخص بے تحاشا خوش ہوا تھا۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں لیکن میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ نور محمد کے بجائے استقلال بیگ سے ملیے۔ وہ زیادہ قابل اور عالم ہیں۔ ان کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے لیکن وہ انگلش پر عبور رکھتے ہیں۔ وہ نور محمد کی نسبت آپ کی زیادہ مدد کرسکتے ہیں۔" میرے سامنے بیٹھے شخص نے مخلص انداز میں کہا تھا۔

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے انکار کیا پھر ان کے چہرے پر پھیلا تحیر دیکھ کر میں نے مزید کہا تھا۔ "مجھے نور محمد سے ہی ملنا ہے۔ وہ۔ وہ۔ بہت خوش الحان ہیں۔ وہ بہت اچھا قرآن پڑھتے ہیں۔ میں نے ان کی تعریف سن رکھی ہے۔"

میں نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا کہ کہیں وہ شخص مجھے نور محمد کے علاوہ کسی اور کے پاس نہ بھیج دے۔ اس شخص نے سرہلایا۔

"میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت کردوں۔ نور محمد زیادہ ملنسار انسان نہیں ہے۔ وہ ہر شخص سے ملنا پسند نہیں کرتا۔"

"آپ مجھے ایک بار ملوا دیجیے۔ میں ان سے خود بات کرلوں گا۔ میں ان کو رضامند کرلوں گا۔" میں نے منت کی تھی۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ ابھی وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ اگلی نماز کے لیے آئے گا تو میں بات کر کے دیکھوں گا۔" انہوں نے کہا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ 2006 کی ہی بات تھی' جب مجھے نور محمد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس کو دیکھ کر میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سلگتے عزائم پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے رک کر دیکھنے دوسری نظر ڈالنے یا مخاطب کرنے کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ انسان سینما میں بیٹھ کر پاپ کارن بیچنے والے کو اس سے زیادہ غور سے دیکھ لیتا ہے اور میرے معزز دوست اسے جادوگر کہہ رہے تھے۔

پہلی بار وہ مجھے ڈھیلی سی جینز اپنے وجود سے ذرا بڑا پل اوور پہنے مسجد میں گھومتا نظر آیا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ وہ خوش الحان تھا۔ وہ اذان کے نام پر جو کلمات ادا کرتا تھا' وہ مسحور کن لگتے تھے۔ میں نے اسے قرآن پاک پڑھتے بھی سنا اور مجھے اس کی آواز کے علاوہ اس کی شخصیت میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں لگا تھا۔ میں چاہ کر بھی اس میں وہ سب تلاش کرتا رہا جس کا مسٹر ٹیرن تذکرہ کرتے رہے تھے۔ دہشت گرد کو دہشت کی علامت ہونا چاہیے لیکن وہ شخص بہت معصوم اور بے چارہ سا لگتا تھا۔ کیا وہ بہت بڑا اداکار تھا۔ میں اس کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچتا رہتا کیونکہ اس نے مجھ سے ملنے سے ابتدا میں ہی انکار کردیا تھا۔ نظیر اختر جن سے پہلے دن میری بات ہوئی' انہوں نے مجھے محبت سے سمجھایا تھا کہ میں اس کے رویے سے دل برداشتہ نہ ہوں اور وہ نور محمد کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔

میں مسلسل مسجد جاتا رہا اور اس کی حرکات و سکنات پر غور کرتا رہا۔ میں نے مسجد کے بے حد قریب گھر لیا تھا اور اپنی بہت سی کتابیں اور اپنے پروجیکٹ سے متعلقہ تمام مواد وہاں منتقل کرلیا تھا۔ انہوں نے اس کو نجانے کیسے سمجھایا' میں نہیں جانتا لیکن کچھ دن بعد میں اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے۔ میں آپ کو نہیں جانتا۔" اس نے نیچی نگاہوں اور ہکلاتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

یہ تھا وہ پہلا جملہ جو اس شخص نے مجھ سے کہا تھا اور میں اس کا انداز دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ وہ آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کی آواز حلق سے رک رک کر نکلتی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں کو سیکنڈ کی سوئی کے حساب سے چٹخاتا تھا۔ اس کی باڈی لینگویج ایسی تھی کہ اس پر ترس آتا تھا۔ وہ کس چیز سے خوف زدہ تھا۔ وہ دہشت گرد تھا۔ جو دنیا کے لیے دہشت کی علامت تھا۔ وہ خود مجھ سے دہشت زدہ تھا۔ میں ایک دہشت گرد کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ کیسے کوئی عام واقعہ ہوسکتا ہے۔ میرا دل چاہنے لگا کہ میں اپنے گھٹنوں میں منہ دے کر زور زور سے چیخیں ماروں۔

"کیا دہشت گرد ایسے ہوتے ہیں۔" میرے ذہن میں ایک ہی سوال کی گردش تھی۔ وہ مجھ سے لگ بھگ بیس سال تو چھوٹا ہوگا۔ وہ ایک ڈرا ہوا جھجکا ہوا انسان تھا جو بات کرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ انتہائی کم گو تھا۔ اپنی مرضی سے بات کرنا پسند کرتا تھا اور وقفہ دے دے کر جملہ مکمل کرتا تھا۔ وہ ایک جملہ بولتا تھا اور پھر خاموش ہوجاتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بات کو سمجھنے کے لیے' لگ بھگ دس منٹ درکار ہوتے تھے۔

یہ تھی۔ میری نور محمد سے پہلی ملاقات جس نے مجھے انتہائی مایوس کیا تھا۔ اس کے باوجود کوئی تحریک تھی جو مجھے کہتی تھی کہ جو کام کرنے آئے ہو اسے نامکمل مت چھوڑنا' ورنہ خود نامکمل رہ جاؤ گے۔

"مجھے کسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" اسے ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر میں نے آخری حربہ آزمایا تھا۔ خضرالٰہی کس کا نام تھا میں نہیں جانتا تھا' لیکن مسٹر ٹیرن کے منہ سے میں نے سنا تھا کہ نور محمد کو الوژن ہوتے تھے اور وہ کہا کرتا تھا کہ اس کا ایک دوست ہے جس کا نام خضرالٰہی ہے۔ میں نے اسی لیے خضرالٰہی کا ذکر کرنے کا سوچا تھا۔

"خضر الٰہی نے۔" نور محمد کے چہرے پر جیسے بجلیاں چمکنے لگی تھیں۔ وہ حیران ہوا تھا۔

نور محمد نے یہ نام سن کر میری مدد کرنے کی ہامی بھرلی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ نام استعمال کر کے اسے رضامند کرلوں گا۔

☼ ☼ ☼

"کیا دین میں نماز اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہے؟"

یہ تھا وہ پہلا سوال جو میں نے ایک دن نور محمد سے پوچھا تھا۔ میری بات سن کر وہ میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ایک دم سے اپنا موقف بیان نہیں کرپاتا تھا اور اس کی وجہ اس کی لاعلمی نہیں، بلکہ اس کی شخصیت میں اعتماد کا فقدان تھا۔ نور محمد کی قربت حاصل کرنے کے لیے میں نے اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش اختیار کرلی۔ وہ ابتدا میں جتنا خشک اور تنگ مزاج لگتا تھا، وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ بے تکلف ہونے لگا اس کے پاس علم تو تھا.... وہ حافظ قرآن تھا اور اس کو فقہ پر بھی عبور تھا۔ وہ احادیث و سنت کے متعلق بھی مکمل آگاہی رکھتا تھا۔

ایک بات میں نے ابتدا میں ہی تسلیم کرلی تھی کہ وہ بے حد ذہین آدمی تھا۔ اس کے اندر نئی چیزوں کو سیکھنے کی صلاحیت۔ تھی لیکن نئی چیزوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یہ میری اب تک اس کے بارے میں ایک رائے تھی جو بدلنے جارہی تھی۔

"میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ قرآن میں تو زندگی گزارنے کے سنہرے اصول ہیں، رہنمائی ہے۔ اس کو پڑھنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن.... نماز کا اس قدر حکم کیوں ہے۔" میں نے اس کے تاثرات دیکھ کر فوراً" وضاحت کی تھی۔

میرے سوال پر وہ چند لمحے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے جو جواب دیا، اس نے میرے چودہ طبق روشن کردیے۔

"میں اگر یہ کہوں کہ نماز ہم اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں تو آپ کی تشفی نہیں ہوگی۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوتے رہیں گے۔ میں بھی پہلے حیران ہوتا تھا کہ نماز کی پابندی کا اتنا حکم کیوں ہے۔ یہ کیوں چند حالتوں کو چھوڑ کر کسی حالت میں معاف نہیں ہے اور ہمارے نماز پڑھنے سے ایسا کون سا جادوئی فائدہ ہوسکتا ہے۔ اللہ کریم نے نماز کو اس قدر ضروری کیوں قرار دیا ہے۔ جب میں نے جانچنا شروع کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نماز کی پابندی روح کو طاقت فراہم کرنے کا عمل ہے۔ ہمارے جسم کی طرح ہماری روح کا بھی ایک مدافعتی نظام ہے۔ نماز اس مدافعتی نظام کو فعال اور متحرک رکھتی ہے۔ میں اب آپ کو اس کا میکنزم سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دراصل انسان کا ضمیر اس روحانی مدافعتی نظام کا الارم ہے۔ نماز اس الارم کو کمزور نہیں ہونے دیتی، اس کو چھٹنے نہیں دیتی۔ یعنی نماز ہمارے اس الارم کو مکمل چارج کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس طرح جسمانی مدافعتی نظام کی حفاظت نہ کی جائے تو جراثیم حملہ کردیتے ہیں۔ انسان بیمار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح روحانی مدافعتی نظام سے لاپروائی برتنے پر روح کو بھی کیڑا لگ سکتا ہے۔ اس کیڑے کا نام شیطان ہے۔ شیطان کی طاقت کے متعلق کبھی کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہمہ وقت ایسے جرثومے یا برائی انسان کی جانب بھیجتا رہتا ہے، جو اسے روحانی طور پر بیمار اور لاچار کرسکتے ہیں۔ ہم ہمہ وقت ان جرثوموں کی زد پر ہوتے ہیں اور ہر برائی سے بچ کر اور ہر نیک عمل کرکے ہم اپنے اس نظام کو مضبوط رکھ سکتے ہیں۔ نماز کو ترک کرنے سے یا پابندی نہ کرنے سے ضمیر ان جرثوموں کا شکار سب سے پہلے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ضمیر کمزور ہوجاتا ہے اور اس کی مزاحمت کی طاقت کم ہونے لگتی ہے۔ وہ آپ کو برائی کے متعلق وارن کرنے کی اپنی قدرتی صلاحیت کھونے لگتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ برائی وہ ہے جو انسان کے دل میں کھٹکا پیدا کرے اور یہ کھٹکا دراصل ضمیر پیدا کرتا ہے۔ روح مضبوط ہوگی تو

اس کا الارم ٹھیک کام کرے گا۔ ورنہ اچھائی اور برائی میں تخصیص کرنے کی قدرتی صلاحیت جو اللہ نے اسے پیدائشی طور پر عطا کی ہوتی ہے، وہ دھیرے دھیرے کم اور پھر ختم ہونے لگتی ہے۔ اچھائی اور برائی کا فرق مٹنے لگتا ہے۔ انسان کفر کی جانب مائل ہوسکتا ہے۔ اس لیے روح کو ابلیسی جرثوموں یا برائی سے بچنے کے لیے انتہائی طاقت ور ملٹی وٹامن کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے مدافعتی نظام کو مضبوط رکھ سکیں۔"

نور محمد کی یہ ایک حیرت انگیز وضاحت تھی، جس نے مجھے یہ باور کروایا کہ وہ ذہانت میں بے مثال ہے۔

"اللہ نے یہ ملٹی وٹامن ہمارے لیے پہلے سے تجویز کرکے رکھا ہے۔ پانچ گولی دن میں پانچ مرتبہ پانی کے ساتھ.... پابندی کے ساتھ.... تاکہ یہ سارا میکنزم متحرک رہے۔ نماز کی پابندی روح کو کمزور نہیں ہونے دیتی۔ اس کے امیون سسٹم کو طاقت فراہم کرتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ مکمل نیت اور خود سپردگی سے نماز ادا کی جائے۔ ظاہر ہے جتنا اچھا ملٹی وٹامن ہوگا اتنا اچھا امیون سسٹم ہوگا۔"

وہ اپنی بات مکمل کرکے اپنی انگلیاں ہی چٹخا رہا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

یہ تھا وہ نور محمد جو دہشت گرد تھا اور جس نے مجھے دہشت گردی کے اس دائرے میں داخل کرکے بالآخر اس کو سمجھنے میں مدد دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہم مزید ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ نور محمد نے مجھے اپنے بارے میں سب بتانا شروع کردیا۔ وہ بہت تلخ ماضی کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا، میرے رویے سے متاثر ہوکر اس نے میرے ساتھ وہ بوجھ بانٹنا شروع کردیا۔ مجھے اس کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بھی چند ایک باتوں کے علاوہ سب سچ سچ بتادیا تھا۔

☼ ☼ ☼

2007ء کی ابتدا میں نور محمد میرے ساتھ میرے گھر میں منتقل ہوگیا۔ میں زندگی میں اتنا پرسکون پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، جتنا ان دنوں تھا۔ زندگی میں بالآخر سب کچھ ٹھیک ہونے والا تھا۔ میں ہر روز لکھنے کا شغل جاری رکھتا اور دل کو بہلاتا رہتا کہ میں یہ سب صرف اپنی ذات کے لیے نہیں کررہا۔ مجھے پہلی بار انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان دنوں دو عجیب باتیں ہوئیں۔

مسٹر ٹیرن نے خودکشی کرلی۔ وہ یو پی ایل کے اس گروپ کے ایسی موت مرنے والے آخری ممبر تھے، جو مجھ سے اس ناول پر کام کروانے کے لیے آتے رہے تھے۔ پہلے تین لوگ ایک کار ایکسیڈنٹ میں مرگئے تھے۔

مسٹر ٹیرن نے خودکشی کرلی اور مسٹر ولسن کو کینسر ہوگیا تھا۔ ڈاکٹرز کو امید تھی کہ وہ ٹھیک ہوجائیں گے، کیونکہ ان کا کینسر ابتدائی مرحلے پر تھا لیکن نجانے کیسے وہ کیمو تھراپی کے سائیڈ ایفیکٹس برداشت نہیں کرپائے تھے۔ ان سب لوگوں کی ایسی اندوہناک اموات نے مجھے اس ناول پر مسلسل کام کرنے کے لیے مزید متحرک کیا۔ یو پی ایل ان دنوں کافی غیر فعال ہوگئی تھی۔ اس کے ممبرز کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ لیکن مجھے اب کسی کی معاونت کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ میں اب کسی چیز سے خائف نہیں تھا۔ کوئی چیز مجھے میرے عزم سے یا ارادے سے متزلزل نہیں کرسکی تھی۔

دوسری عجیب بات کا نام سلمان حیدر تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔" نور محمد نے کہا تھا۔ ہم چہل قدمی کی غرض سے ہر روز باہر نکلتے تھے۔ اس روز بھی ہم سٹی سینٹر تک کا چکر لگا کر واپس آرہے تھے، جب نور محمد نے کہا۔

"میں انہیں کچھ پوسٹ کارڈز پوسٹ کردوں.... انہیں اچھا لگے گا۔ اتنے سال ہوگئے میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے.... میرے پاس ایڈریس لکھا ہوا

ہے۔"

وہ پوسٹ آفس کی جانب جاتے ہوئے خود ہی باتیں کررہا تھا۔ میں اس کی خوشی میں خوش تھا۔ پوسٹ آفس میں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔ وہ کاؤنٹر پر موجود خاتون سے خوش گپیوں میں مصروف تھا۔

وہ اس ادھیڑ عمر خاتون کی تعریف میں کچھ کہہ رہا تھا' جبکہ وہ ہنسنے میں مصروف تھیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ شخص پیچھے ہٹ گیا تھا۔ نور محمد پوسٹ کارڈ دیکھنے لگا' جبکہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ شخص ہماری جانب دیکھنے میں مگن تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت بہت نامناسب لگی۔ نور محمد کو کارڈز پسند نہیں آرہے تھے۔ اس لیے ہم کچھ بھی پوسٹ کیے بغیر باہر آگئے۔ چند لمحوں بعد میں نے اس شخص کو اپنے عقب میں آتے دیکھا۔ وہ بھوری رنگت کا دبلا پتلا ایشیائی تھا۔ وہ نور محمد کی جانب متوجہ تھا۔

"معاف کیجیے گا..... میں..... میں آپ کو پہچاننے کی کوشش کررہا ہوں..... مجھے یاد نہیں آرہا۔"

وہ نور محمد کو گہری نگاہوں سے تکنے میں مگن کہہ رہا تھا۔ میں نے نور محمد کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ — وہ اس شخص کو پہچان چکا ہے۔

"تم سلمان حیدر ہو نا۔" نور محمد نے کہا تھا۔ اس شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نور محمد ہوں۔" نور محمد نے کہا تھا۔ وہ شخص پہلے اس کی جانب دیکھتا رہا' پھر اسے یاد آیا تھا۔

"ہاں..... نور محمد..... پروفیسر آفاق کے بیٹے..... ہے نا؟" وہ ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں صحافی ہوں' میں الجزیرہ انگلش کے لیے کام کرتا ہوں۔ یہاں آج کل ایک شارٹ کورس کے لیے آیا ہوا ہوں۔"

سلاد کے پیالے کو اپنے سامنے کرتے ہوئے وہ اپنے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ سادہ سے انداز میں بات کرتا تھا۔ اس کی ظاہری شخصیت میں کوئی ایسی خاص کشش نہیں تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ عام نوجوانوں جیسا ایک جوان آدمی تھا۔ یہ میری اس کے بارے میں پہلی رائے تھی۔ وہ نور محمد کی دعوت پر ہمارے گھر آگیا تھا۔

مجھے نور محمد کے رویّے نے خوش گوار حیرت میں مبتلا کیا۔ وہ اس شخص سے مل کر بے پناہ خوش تھا۔ یہ بات میری میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے اور ایک اسکول میں پڑھتے رہے تھے۔ نور محمد نے اس کے لیے بہت شوق سے ایک پراہتمام کھانا تیار کیا تھا' جسے کھانے کے لیے ہم اب میز پر موجود تھے۔

"تمہارے بارے میں ہمیشہ میں یہ ہی سوچتا تھا کہ تم بہت کامیاب انسان بنوگے۔" نور محمد نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے اتنا سوچتے تھے تم میرے بارے میں..... اتنا تو میری امی بھی نہیں سوچتی تھیں میرے بارے میں۔" وہ کانٹے سے آئس برگ کے سبز پتے ٹونگتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں تمہارے جانے کے بعد بھی تمہیں یاد کیا کرتا تھا۔" نور محمد بولا۔

"تمہیں باؤلنگ کروانی آئی کہ نہیں یا ابھی بھی بال کو ہیر برش کی طرح پکڑتے ہو؟ وہ شاید اسے چڑانے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں نے دوبارہ کبھی کرکٹ نہیں کھیلی۔ بال کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کبھی۔" نور محمد نے اپنے مخصوص سادہ سے انداز میں کہا تھا۔ وہ سلمان حیدر سے جتنی باتیں کررہا تھا۔ اتنی باتیں میں نے اسے کسی سے کرتے نہیں سُنا تھا۔

"تم اس معاملے میں بہت نکمے تھے۔ تمہیں کرکٹ پر ایک اچھے سبق کی ضرورت تھی۔" سلمان نے باؤل سے پاستا اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے کہا تھا۔ نور محمد کے چہرے کی سادہ سی مسکراہٹ بھی پھیکی پڑگئی۔

"سبق تو مل گیا تھا..... اچھا..... مزید کی حاجت ہی نہیں رہی تھی۔"

سلمان نے یک دم اپنی پلیٹ سے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ ہم تینوں یک دم چپ ہو گئے تھے۔ سلمان حیدر کا مجھے نہیں پتا' لیکن میں اس بات سے آگاہ تھا کہ نور محمد کی پٹائی کرکٹ کھیلنے پر بھی ہوا کرتی تھی۔

"میں تم سے بہت جھگڑا کیا کرتا تھا نا..... میں بچپن میں زیادہ سمجھ دار نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب میں ویسا نہیں رہا۔ میں اب تمہیں کرکٹ کھیلنا سکھا سکتا ہوں۔ شرط وہی ہے..... بیٹ تمہیں خود لانا ہوگا۔"

سلمان نے بے تکلف انداز میں کہا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی۔ وہ اچھا ہنس مکھ انسان تھا۔

"میں بھی اب ویسا نہیں رہا۔" نور محمد نے اتنا ہی کہا تھا۔ میں نے چکن فلے والی ٹرے سلمان حیدر کی جانب بڑھائی۔ اس نے ایک فلے اٹھا لیا تھا۔ نور محمد خاموشی سے کافی بنانے کے لیے اٹھ گیا تھا۔

"آپ کا نیا ناول کب آرہا ہے مارکیٹ میں؟" اس کے جانے کے بعد سلمان حیدر نے یک دم پوچھا تھا۔ میں چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے آدھی عمر کا تھا لیکن اس لمحہ وہ مجھے اپنے آپ سے زیادہ چالاک محسوس ہوا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا تو اس نے ظاہر کیوں نہیں کیا تھا اور اگر نہیں پہچانا تھا تو اسے میرے نئے ناول کی سن گن کس سے ملی تھی۔ میں تو عوامی طور پر اعلان کرچکا تھا کہ میں لکھنا چھوڑ چکا ہوں اور میرے حالیہ پروجیکٹ کا میرے چند قریبی لوگوں کے علاوہ صرف یو پی ایل کے منتظمین کو پتا تھا۔

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" وہ ابھی بھی فورک اور پاستا میں مگن لگتا تھا۔ لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ وہ پیٹ میں داڑھی لے کر پھرنے والا انسان ہے۔

"عہد الست۔" میری زبان سے پھسلا تھا۔

"عہد الست۔" اس نے دہرایا' پھر میری جانب جھکا تھا۔

"کیا ہے اس کتاب میں....." وہ میرے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے الجھن ہوئی۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے سنجیدگی سے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ میں اس سے عمر میں دگنا تھا۔ اسے مجھ سے اس انداز میں سوال کرنے کا حق نہیں تھا۔

"میں صحافی ہوں سر..... سوال پوچھتا ہوں تو رزق آتا ہے۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو برا لگا تو؟" وہ دوبارہ پلیٹ کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس لمحے نجانے کیسے میرے دل نے اشارہ دیا کہ۔ مجھے ایک رازداں کی ضرورت ہے' وہ شخص بے وقوف نہیں لگتا تھا۔ وہ وقت پڑنے پر میری مدد کرسکتا تھا۔ مجھے کسی کی مدد تو چاہیے تھی۔

"عہد الست میری اور نور محمد کی کہانی ہے۔" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے اس کے سوال سے بھی زیادہ بری لگی۔

"آپ یوں کہیے نا یہ حق اور باطل کی کہانی ہے۔" وہ پھر مسکرایا تھا۔ میں نے تلخی بھرے انداز میں اپنا فورک پلیٹ میں رکھ دیا۔

"ایسا نہیں ہے۔ میں سوالوں سے چڑ کر آپ کی بات مان نہیں سکتا۔ میں باطل نہیں ہوں۔" میں اب کی بار بہت تحمل سے بولا تھا۔

"میں نے کب کہا آپ باطل ہیں۔ میں نور محمد کو باطل کہہ رہا ہوں۔" وہ چڑانے میں ماہر تھا۔

"وہ بھی باطل نہیں ہے۔" میں حیران سا ہوا تھا۔

"سر! کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ مانتے ہیں۔ وہ ایک جہادی تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ "لمہاجرون" کے لیے کام کررہا ہے۔" وہ دھیمی سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ یہ کوئی اور ہی معمہ تھا جو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کون تھا۔ وہ کس کے لیے کام کررہا تھا۔ کیا وہ واقعی اس کا دوست ہے یا اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔

"میں نور محمد کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔" میں نے کہا تھا۔

"کیسے.....؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس

بھری۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ اس روز کی بات تھی' جب میں بلیک برن گیا تھا۔ ثیا کی خودکشی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ بلیک برن کے یوگا سینٹر میں ایک لیکچر ہو رہا تھا۔ جو سکون کی تلاش کے موضوع پر تھا۔ لیکن۔ جس نے مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں ہال سے اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ پھر میں وہیں باہر بیٹھ گیا تھا۔ میں لیکچر ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے ان اسکالر سے دوبارہ ملنا تھا۔ مجھے ان سے کچھ سوالوں کے جوابات پوچھنے تھے۔

"کیا مذہب ہر مسئلہ حل کر دیتا ہے؟ میں اگر یہ مان لوں کہ ہر بچہ دنیا میں آنے سے قبل خدا سے ایک عہد کر کے آتا ہے تو کیا میں پُرسکون ہو جاؤں گا؟ کیا رب کو رب مان لینے سے انسان کو سکون مل جاتا ہے؟"

جب ہال میں سے سب اٹھ کر چل دیے تو میں نے سوال کیا تھا۔ ہال میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ میرا اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف تھا جو اس لیکچر کی ابتدا میں تلاوت کی گئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہم مسلمانوں کا تو یہ ہی عقیدہ ہے۔" انہوں نے سر ہلایا تھا۔ ان کے جواب نے مجھے مایوس کیا تھا۔

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عہد الست کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب پیدائشی مسلمان ہیں؟" میں اپنی ناگواری چھپا نہیں پایا تھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ آپ اپنا لہجہ درست کر لیجیے' مسلمان ہونا کوئی گالی نہیں ہے۔" انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ میں شرمندہ ہوا۔ میرا لہجہ واقعی کچھ غیر مناسب ہو گیا تھا۔ میں حاجت مند تھا اور حاجت مند کو سر جھکا کر بات کرنی چاہیے۔

"میں گالی نہیں دے رہا' لیکن میں مذہب کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برا مت مانیے گا۔ لیکن میں کسی مذہب کو نہیں مانتا۔ میں سکون کی تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے صدیوں پرانی باتیں نہیں سننی۔ یہ میرے لیے اینٹی بائیوٹک کی طرح ہیں' جو ایک مدت کے استعمال کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ یہ سیشن سکون کے موضوع پر تھا جو مجھے نہیں ملا۔ آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ انسان کو سکون کے لیے ایک کندھا چاہیے ہوتا ہے' ایک آغوش جس میں منہ چھپا کر وہ اپنا سارا غم بھول سکے اور جسے وہ محسوس کر سکے۔" میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ انہوں نے سر ہلایا۔

"اچھا۔۔۔ میں مذہب کی بات نہیں کروں گا۔ میں سائنس کی بات کرتا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ انسان کے خلیوں میں کلیے چھپے ہوتے ہیں۔ ایک خلیہ ہے اس کی ایک حفاظتی پرت ہوتی ہے' اس کا ایک مرکز ہوتا ہے۔ مرکز میں جینز ہوتی ہیں۔ سائنس بتاتی ہے کہ جینز میں' بہت ہی باریک چھوٹے حجم کے کروموسومز ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد چھیالیس ہوتی ہے اور یہ تیئیس جوڑوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ یہ اس قدر مختصر حجم کے ہوتے ہیں کہ خوردبین سے بھی صرف اس وقت دیکھے جا سکتے ہیں' جب خلیہ تقسیم کے عمل سے گزرتا ہے۔ ان کی تعداد بہت اہمیت رکھتی ہے۔ سائنس مانتی ہے کہ ایک زیادہ ہو گیا یا ایک کم ہو گیا۔ سمجھیں سارا تناسب بگڑ گیا۔ ایک ہندسہ اوپر نیچے ہوا نہیں اور انسان نارمل نہیں رہتا۔ ایب نارمل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس مانتی ہے کہ جینز میں پائے جانے والے کروموسوم نامی ان اسٹرکچرز کی تعداد انسان کو نارمل رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اب میں آپ کو اپنی ایک تحقیق کے متعلق بتاتا ہوں۔ آپ بے شک اسے مفروضہ سمجھ لیجیے۔ عہد الست کا ذکر قرآن کریم کے پارہ نمبر 9 سورہ نمبر 8 اور آیت نمبر 172 میں ہے۔ اس آیت کے تمام حرفوں کا حرف تہجی میں جو مقام ہے۔ آئیں اسے شمار کرتے ہیں۔ یہ حرف "ع" پھر "ہ" "د" "ا" "ل" "س" "ت" پر مشتمل ہیں۔ "ع" کا مقام 18 ہے۔ پھر "ہ" کا نمبر 27 بنتا ہے۔ اسی طرح "د" 8 "ا" 1 "ل" 23 "س" 12 اور آخری حرف "ت" کا نمبر 3 بنتا ہے۔ آپ ان تمام 18، 27، 8، 1، 23، 12، 3 کو جمع کر لیجیے۔ یہ بانوے بنتے ہیں۔" وہ بہت اطمینان سے اپنی بات کی وضاحت کر رہے تھے' جبکہ میں ہونقوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"انسان کے چھیالیس کروموسومز ایک صورت میں بانوے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ صورت تب ہوتی ہے' جب انسان اس دنیا میں آنے کے لیے اپنی ماں کے وجود میں مقید ہوتا ہے۔ حاملہ ماں کے کروموسومز چھیالیس اور اس کے وجود میں پلنے والے بچے کے کروموسومز بھی چھیالیس۔۔۔ یہ مل کر بانوے بن گئے۔ یعنی عہد الست کے کل حروف۔۔۔ ماں بچہ پیدا کر کے پھر واپس چھیالیس ہو جاتی ہے۔ بچہ اپنے چھیالیس کروموسومز لے کر ماں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس طرح عہد الست میں بندھا ایک اور وجود دنیا میں آ جاتا ہے' اور عہد الست کیا ہے یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔" ان کی مسکراہٹ پُراسرار ہو گئی تھی۔

"کروموسومز بھی محسوس تو نہیں ہوتے' حتیٰ کہ خوردبین سے بھی چند حالتوں کے سوا نظر نہیں آتے' لیکن یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی حالت ان کی تعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ کم یا زیادہ ہو جائیں تو انسان کی دماغی حالت ایب نارمل ہو سکتی ہے' جو بے سکونی پیدا کرتی ہے۔ سکون دراصل دماغ ہی کا معاملہ ہے۔ کیا یہ بات مانتے ہیں آپ۔۔۔ اب تو میں نے سائنس کی رو سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مان لیجیے کہ اگر چھیالیس نمبرز انسان کو نارمل رکھنے کے لیے ضروری ہیں' تو بانوے نمبر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔ آپ حقیقت کو ساری زندگی نہ مانیں' مگر آپ کے خلیے مانتے ہیں اور مانتے رہیں گے۔" ان کے چہرے پر پُراسرار مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

"یہ ساری باتیں جو میں نے آپ سے کہی ہیں نا۔ میری نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں خدا کو اپنا وجود منوانے کے لیے ہندسوں کی ضرورت ہے۔ وہ سائنس کا محتاج ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوتا۔۔۔ اللہ جس دل میں بسنا چاہتا ہے وہ خود وہاں بس جاتا ہے۔ آپ اس حقیقت کو مان لیجیے اور۔۔۔ یہ مان گئے ہیں تو یہ بھی مان لیجیے کہ ربوبیت کا اقرار انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا' کیونکہ انسان کی فطرت میں سربسجودگی ہے۔ سجدہ صرف ربوبیت کو جچتا ہے۔ اور ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت ہے۔ انسان دین حق پر پیدا کیا گیا ہے' یہی عہد الست ہے۔ یہ ہی سکون ہے۔ اس سے منکر ہو جانا ہی دراصل دنیا کی بے سکونی کی بنیادی وجہ ہے۔ آپ چھیالیس کی اہمیت کو مانیں اور بانوے کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں تو آپ ایب نارمل ہونے لگتے ہیں۔ یعنی بے سکون ہونے لگتے ہیں۔ دنیا اسے ڈپریشن بھی کہتی ہے۔ یہ بھی مانتی ہے کہ ڈپریشن بہت بڑھ گیا ہے اور رب کو رب بھی نہیں ماننا چاہتے۔" وہ پھر رکے تھے اور گہری سانس بھر کر اپنی ٹانگوں کا زاویہ درست کیا تھا۔ وہ اپنے گھٹنوں کو سہلا رہے تھے۔

"یہ ہی وجہ ہے کہ میں عہد الست کو یعنی ربوبیت کے اقرار کو انسان کے سکون کی بڑی وجہ قرار دیتا ہوں۔ اللہ اس دنیا میں سونے جیسے لوگ بھیجتا ہے' اور وہ توقع کرتا ہے کہ ہم سونے جیسے ہو کر ہی اس تک واپس پہنچیں۔ آئیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کو مٹی اور پانی سے بنایا اور پھر اس میں ہوا' یعنی روح داخل کر دی۔ یہ تین عناصر ہیں۔ آگ یعنی چوتھا عنصر اللہ نے اسے نہیں دیا یا شاید ہر ایک کو نہیں دیا۔ یہ عنصر ہمیں اپنے اندر خود پیدا کرنا پڑتا ہے۔ لوہا اگر واقعی لوہے کو کاٹتا ہے تو شیطان کی آگ کو کاٹنے کے لیے انسان کو آگ چاہیے' جو اسے خود پیدا کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو نیک عمل کرنا پڑتا ہے اور ہر نیک عمل چاہے وہ کچھ بھی ہو اگر وہ کل انسانیت کے لیے عمل خیر ہے تو وہ سنہری روشنی جیسی آگ پیدا کرتا ہے۔ جسے نور کہتے ہیں۔ جس کی سنہری روشنی آگ کی روشنی سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتی ہے' یہ ہی سنہری روشنی دھیرے دھیرے سرمئی سرد مایوسی کی برف کو جلا سکتی ہے۔ یہ نسخہ آزما کر دیکھیے' میری

تشخیص ہے کہ آپ کے اندر آگ کم ہو چکی ہے جو آپ کے وجود کو دھیرے دھیرے سرد مایوسی کے حوالے کرتی جارہی ہے۔ اپنے اندر آگ پیدا کیجیے۔ ہر وہ عمل جو انسانیت کو بگاڑنے کے لیے کر بیٹھے ہیں تو اس سے منکر ہو کر توبہ کیجیے اور عمل خیر کا آغاز کر دیجیے۔"

انہوں نے گفتگو ختم کر دی تھی۔ میرا پورا وجود پسینے میں نہا چکا تھا۔

"عمل خیر کیا ہے۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جو عمل میں کر رہا ہوں وہ انسانیت کو سنوار رہا ہے؟"

میری آواز میں سرسراہٹ تھی۔ میرے وجود پر کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے اب کی بار میری آنکھوں میں دیکھا۔

"ہر وہ عمل جو آپ اپنی ذات سے ہٹ کر کسی دوسرے انسان کی بھلائی کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں وہی عمل خیر ہے۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دینے سے لے کر کسی سے میٹھی سچی بات کر لینے تک ہر عمل، عمل خیر ہے اور اس میں خیر ہی خیر ہے۔ اسی لیے اخلاق اور اخلاص کی بے حد اہمیت ہے۔ ان سے پوری انسانیت فیض یاب ہو سکتی ہے۔ یاد رکھیں عمل خیر چونکہ ختم نہیں ہوتا۔ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے اس سے حاصل ہونے والی انرجی مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ یہ بعد از مرگ بھی انسان کے لیے کہیں تاریکی میں راہ دکھانے والا جگنو بن کر ساتھ رہتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کا اجر ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ آپ کے اس لقمے کا اجر بھی ضائع نہیں ہونے دے گا جو آپ نے مخلص ہو کر کسی بھوکے کو کھلا دیا ہو گا۔ ہر وہ لفظ جو کسی کھوٹ کے بغیر کسی سے محبت بھرے انداز میں کہا گیا یا ہر وہ دعا جو کسی کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کی گئی۔ عمل خیر ہے۔"

وہ ابھی بھی مسکرا رہے تھے۔ میں پہلے بھی زمین پر ہی بیٹھا تھا' اب تو مجھے لگا جیسے میں زمین پر جھکتا چلا جا رہا ہوں۔

وہ میرے قریب آگئے تھے' پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"میں یہ نہیں کہہ رہا آپ اسلام قبول کر لیں۔ مسلمان ہو جائیں۔ آپ صرف حق کو کھوجیں۔ سچ کو تسلیم کر لیں۔ اللہ خود آپ کو ہمت عطا کرے گا۔ وہ جس کو سنہرا کرنا چاہتا ہے' خود کر دیتا ہے' یہ جو بچہ ابھی میرے ساتھ تھا۔ اسے دیکھا آپ نے... اس کا نام نور محمد ہے۔ ایسا انمول انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ جب میرے پاس آیا تو تقریباً" مکمل پاگل ہو چکا تھا۔ اس کا ڈیپامائن لیول بڑھا ہوا تھا۔ یہ شیزوفرینیا کی اسٹیج اے پر تھا۔ آج ماشاء اللہ تمام نمازیوں کی پانچ وقت امامت بھی کرواتا ہے اور اذان بھی دیتا ہے۔ دنیا اسے بے شک بدبخت کہے' لیکن میں جانتا ہوں وہ اللہ کا بہت پیارا بندہ ہے۔ اللہ اسے عزیز رکھتا ہے تو اسے اتنی بڑی ذمہ داری عطا کی ہے۔ میں نے کہا نا وہ جسے سنہرا کرنا چاہتا ہے' خود کر دیتا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے۔

میں اس روز گھر واپس آیا تو میں وہ نہیں تھا جو وہاں گیا تھا۔ اس رات میں نے چند خوف ناک حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔ میں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ میں نے جب سے یہ ناول لکھنا شروع کیا تھا' میری زندگی میں ہر چیز بے ترتیب ہو گئی تھی۔ میں ایک کے بعد ایک حادثے کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بچہ' اپنی بیوی اور اپنا ہنر سب کھو دیا تھا اور تب بھی میں سمجھ نہیں پایا تھا' کہ میں جو لکھ رہا تھا۔ میں اتنا ڈپریسڈ رہا تھا کہ خودکشی کرنے کی نوبت آگئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ناول میں اسلام اور اس کے ماننے والوں کے خلاف شر انگیز مواد جمع کر رہا تھا۔ میں نے جب جب بھی اس ناول کا کوئی نیا باب لکھا تھا' مجھے کوئی نیا غم ملا تھا' اور تب بھی میں لاعلم کیوں رہا تھا کہ میں شر جمع کر کے اس میں سے خیر کیسے پا سکتا تھا۔ اس رات میں نے وہ سب جو اب تک لکھ رکھا تھا' سب کا سب نذر آتش کر دیا تھا اور تہیہ کیا تھا کہ اب جو لکھوں گا سچ لکھوں گا... تب میں نے ایک نیا ناول شروع کیا تھا... میں نے عہد الست لکھنا شروع کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ فیس بک پیج بنایا ہے میں نے۔"

عمر نے اپنا لیپ ٹاپ امائمہ کے سامنے کیا تھا۔ وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' جبکہ امائمہ چت لیٹی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ پریگننٹ تھی اور اس حالت کے سائیڈ ایفیکٹس نے اس کا برا حال کیا ہوا تھا۔ وہ سارا دن تھکی رہتی تھی، یا ابکائیاں کرتی رہتی تھی۔ اس کی توجہ نہ چاہتے ہوئے بھی آج کل کسی چیز پر نہیں رہی تھی۔ وہ نقاہت بھی محسوس کرتی رہتی تھی' سو اس کے بھائی کی تلاش کرنے کا کام اب عمر کے سر آگیا تھا۔

عمر کی یہ بات اسے پسند بھی بہت تھی۔ وہ جب کسی کام کو کرنے کی ٹھان لیتا تھا تو پھر پوری توانائی سے اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں اب تک لوٹن کا چکر تو لگایا ہی تھا' لیکن انٹر نیٹ سے بھی اس نے نا صرف لوٹن' بلکہ بلیک برن کی بھی تمام مساجد کی معلومات اکٹھی کی تھیں۔ اس نے وہاں کے کانٹیکٹ نمبرز بھی تلاش کیے تھے۔ بلیک برن وہ جگہ تھی جہاں نور محمد روچڈیل سے آیا تھا۔ جب اس کی ذہنی حالت بے حد مخدوش تھی۔ اس نے کچھ لوگوں کو فون بھی کیے تھے۔ تاحال کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے نیٹ پر زیادہ منظم معلومات نہیں دی گئی تھیں۔

لوٹن کی جامعہ مسجد کا نمبر اسے وہاں مل نہیں سکا تھا۔ اس لیے وہ ایک بار وہاں گیا بھی تھا' لیکن تب نماز کے اوقات نہیں تھے' سوا سے کوئی مل نہیں سکا تھا۔ مسجد کے باہر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ ہر روز وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ جاب کی ذمہ داریاں بھی تھیں اور وہ علاقہ بھی ان کی گڈ بک میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ انٹرنیٹ پر جو ہو سکتا تھا وہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نور محمد اور نور آفاق اور نور بن آفاق کے نام سے فیس بک پر سرچ کرنا شروع کیا تھا۔ اس نام کی لاتعداد آئی ڈیز فیس بک پر موجود تھیں۔ سوا سے تلاش کرنا ناممکن تھا۔ اس لیے اس نے ایک فیس بک پیج بنایا تھا جس میں نور محمد کے متعلق تمام تر معلومات جو اب تک اسے دستیاب تھیں اس نے لکھ ڈالی تھیں۔ اس نے لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اگر کوئی اس کے متعلق جانتا ہے تو آگے آکر معاونت کرے۔ کل ویک اینڈ تھا۔ سو اسے فراغت تھی۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں اس میں آنٹی اور انکل کی تصاویر بھی اپ لوڈ کر دوں۔ کیا پتا نور محمد نے کسی اور نام سے آئی ڈی بنا ہی رکھی ہو۔ اس کی نظر سے گزرے تو اسے اچھا لگے۔ آنٹی' انکل کی تصاویر سے جذباتی طور پر بھی ہٹ کیا جا سکے گا۔" وہ امائمہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر تو تھیں' لیکن توجہ ابھی بھی وہاں نہیں تھی۔

"تم آنٹی کو کہو کہ وہ ہمیں کچھ پرانی تصویریں بھجوا دیں۔ نور محمد کے بچپن کی مل جائیں تو کیا کہنے۔" امائمہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔ عمر نے بغور اسے دیکھا۔

"کیسا محسوس کر رہی ہو' طبیعت ٹھیک ہے؟ تمہارے لیے جوس لاؤں؟" وہ یک دم اس کی جانب جھکا تھا۔ امائمہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

"نہیں... میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔

"اپنا خیال رکھا کرو نا یار۔ یاد نہیں ممی کیا کہہ رہی تھیں کہ بھوک نہ بھی لگے یا دل نہ بھی چاہے تو کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا چاہیے۔ پہلے ہی اتنی کمزور ہو گئی ہو۔" وہ اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔

"دل تو چاہتا ہے' بھوک بھی لگ رہی ہے' مگر پھر ڈر لگتا ہے' کچھ بھی کھالوں ہضم نہیں ہوتا' الٹی آجاتی ہے۔" وہ لاچاری بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بھی سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

"میں اسٹرابیریز لایا تھا۔ بہت فریش ہیں' ٹھنڈی ہونے کے لیے رکھی تھیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔ تم نمک ڈال کر کھاؤ۔ اس سے الٹی نہیں آئے گی۔" وہ محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امائمہ مسکرائی۔

"ایسی باتیں کون سکھاتا ہے تمہیں عمر... ایسی

باتیں تو مجھے بھی یاد نہیں رہتیں۔"

"بدتمیز۔ مذاق اڑا رہی ہو مجازی خدا کا۔ ٹھہو' میں پہلے کچن سے اسٹرابیریز لے آؤں' پھر پوچھتا ہوں تمہیں۔" وہ خجل سا ہو کر اٹھا تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا۔ چند لمحوں بعد امائمہ نے اسے اسٹرابیری والی باسکٹ اٹھائے واپس آتے دیکھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا تھا' پھر ایک اسٹرابیری اس کی جانب بڑھا کر بولا۔

"ممی تمہیں جو باتیں بھی سمجھاتی رہتی ہیں۔ میں بس ان ہی کو ذہن میں رکھتا ہوں۔ میں تمہارا خیال رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری امی تو ہیں نہیں یہاں پر..... مجھے ہی خیال رکھنا پڑے گا نا۔" اس نے ایک اسٹرابیری اپنے منہ میں بھی رکھی تھی۔

"تھینک یو عمر! تم بہت اچھے ہو۔ جب تمہارا پرپوزل آیا تھا تو امی سب سے زیادہ خوش تھیں اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ امائمہ تم میرے اس فیصلے پر ایک دن فخر کرو گی۔" اس نے اسٹرابیری کا ایک بائٹ لیا تھا۔

"اچھا تو اب تم اس فیصلے پر فخر کرنے لگی ہو۔ اشاروں اشاروں میں تعریف کر رہی ہو میری۔" وہ مسکرایا تھا۔

"اشاروں میں ہی کیوں..... میں کھل کر تمہاری تعریف کرتی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو عمر! میرے لیے کتنا کچھ کرتے ہو۔ میرے بھائی کو ڈھونڈ رہے ہو۔ اتنی محنت کر رہے ہو' کون کرتا ہے کسی کے لیے اتنا کچھ۔" امائمہ کے دل میں جو بھی تھا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"کسی کے لیے.....؟" عمر نے اسے گھورا تھا۔ "تم اب میری فیملی کا حصہ ہو۔ ان فیکٹ تم میری فیملی ہو۔ میرا سب کچھ ہو تم۔ تمہارے لیے نہیں کروں گا تو کس کے لیے کروں گا۔ مجھے اب آنٹی (امائمہ کی امی) کے لیے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ ابھی میں نے بے بی کا پیار محسوس نہیں کیا۔ ابھی ہم ابتدائی مرحلے میں ہیں' لیکن میں ابھی سے محسوس کر سکتا ہوں امائمہ! کہ اولاد کا دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ آپ اپنے بچے کو کھو کر جیسے اپنا سارا حوصلہ' ساری ہمت کھو دیتے ہیں۔ کھو جانے والے کا دکھ مرنے والے کے دکھ سے' بہت زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ آنٹی بہت مشکل میں ہیں۔ آئی وِش میں ان کے لیے کچھ کر سکوں۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اللہ کریم آنٹی سے ان کے بیٹے کو ملوا دے۔"

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ امائمہ کو بے حد حوصلہ ہوا۔ یہ عورت کے لیے بہت طاقت ور احساس ہوتا ہے کہ آپ کا شریک حیات آپ کے ماں' باپ یا بہن بھائی کو اتنی ہی اہمیت دے جتنا کہ وہ اپنے ماں' باپ یا بہن' بھائی کو دیتا ہے۔

"تم کافی کچھ تو کر رہے ہو۔ میں تو اس بات کے لیے بھی بہت شکر گزار ہوں عمر!" اس نے تشکر آمیز انداز میں کہا تھا۔

"اچھا..... اب باتیں بند کرو اور اس اسٹرابیری کو ختم کرو۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں نے یہ چیز تو بنا لیا' لیکن میں سوچ رہا تھا کہ شہوز آجائے تو اس سے بات کروں گا پہلے..... اس کے بعد آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ وہ جرنلسٹ ہے' اس کی اپروچ ہم دونوں سے زیادہ ہے..... وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے گا۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنا زیادہ اچھا رہے گا' کیا خیال ہے۔"

"کب آرہا ہے شہوز..... انکل (عمر کے والد) کی تو دس تاریخ کی فلائٹ ہے۔ ان کے ساتھ ہی آرہا ہے یا بعد میں آئے گا۔" امائمہ نے ہاتھ میں پکڑا اسٹرابیری کا آدھا حصہ منہ میں رکھ لیا تھا۔

"ابو کی ڈائریکٹ فلائٹ ہے۔ وہ جمعہ کی صبح پہنچ جائیں گے۔ شہوز بیس تاریخ تک آئے گا۔" عمر نے بتایا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سُنا ہے زخم شاخوں کے سِلے ہیں
بہار آئی ہے غنچے کِھل گئے ہیں

مگر میرے دیارِ رنگ و بُو میں
وہی پت جھڑ کے ڈیرے کیوں لگے ہیں

برہنہ سر کھڑی ہیں فاختائیں
نشیمن رات ان کے جل گئے ہیں

یہاں انسانیت مردہ پڑی ہے
یہ گدھ اس کے بدن کو نوچتے ہیں

اجازت کس نے دی پھر قتل و خوں کی
یہ قاتل کیوں یہاں داخل ہوئے ہیں

نظر حیران ہے ان سانحوں پر
دلِ ناشاد کو جھٹکے لگے ہیں

ملے ان کو بھی مولا باریابی
دُعا کو ہاتھ تو اُٹھے ہوئے ہیں

شمیم فاطمہ

مہرِ خاموشی،

ہمیں چُپ رہ کے جینے کا سلیقہ آگیا ہے اب
کوئی لمحہ خوشی کا ہو کہ دُکھ اُترے رگِ جاں میں
کوئی تنہا ہمیں کر دے کہ باندھے عہد و پیماں میں
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا
یہ سب ماضی کے قصے ہیں
کہ ہم چڑیا کے مرجانے پہ پہروں جی جلاتے تھے
کبھی جذبوں کے آنگن میں نئے سپنے سجاتے تھے
ملن کی تتلیاں بھی اپنے پر پھیلایا کرتی تھیں
ہمیں کچھ اَن کہی باتیں سمجھ میں آیا کرتی تھیں
کبھی اک نرم سرگوشی ہمیں خوابیدہ کرتی تھی
کبھی چھوٹی سی کوئی بات بھی رنجیدہ کرتی تھی
یہ سب باتیں پُرانی ہیں
اب ایسا کچھ نہیں ہوتا
حوادث نے لبوں پر مُہرِ خاموشی لگا دی ہے
خوشی کی بات کا، غم کا اَثر ہم پر نہیں ہوتا
نظر سے گل کھلانا کارگر ہم پر نہیں ہوتا
شگوفے کِھل اُٹھیں یا پھر خزاں میں ہم اکیلے ہوں
شفق آنگن میں اُترے یا بدن خواہش کے میلے ہوں
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا

تسنیم کوثر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم اپنے لیے بددعا نہ کرو، نہ اپنی اولاد کے لیے بددُعا کرو، اور نہ اپنے مالوں کے لیے بددُعا کرو (کہیں ایسا نہ ہو) تم اللہ کی طرف سے اس گھڑی کو پالو جس میں اس سے جو مانگا جائے، وہ تمہارے لیے قبول کر لے۔“ (مسلم)

فائدہ:۔

اللہ تعالیٰ ویسے تو ہر وقت ہر کسی کی فریاد سُنتا اور قبول فرماتا ہے لیکن بعض اوقات اس نے ایسے بھی مقرر کیے ہیں کہ ان میں کی گئی دُعائیں زیادہ قبول فرماتا ہے۔ اس لیے انسان کو کسی وقت بھی اپنے یا اپنے بچوں یا کاروبار وغیرہ کے لیے بددعا نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بددُعا وقتِ قبولیت کو پالے اور بعد میں وہ کف افسوس ملے۔

قابلِ رشک حکمران،

اورنگزیب عالمگیر، مغل بادشاہوں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے قرآن پاک حفظ کیا۔

وہ نہایت سنجیدہ اور بردبار تھا۔ اس جیسا عبادت کرنے والا مغلوں کی تاریخ میں کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ وہ ہفتے میں چار روزے رکھتا تھا۔ اس کا مقبرہ بھی دوسرے بادشاہوں کے عظیم الشان مقبرد کے برخلاف سادہ جبکہ قبر کچی ہے۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

دو عربی اشعار کا ترجمہ،

- تم ہر بار کڑوا پانی پینے سے انکار کرو گے تو پیاسے رہ جاؤ گے۔ اور کتنے لوگ ہیں جنہیں صاف پانی ملتا ہے۔
- تم ہر کام میں اپنے رفیق پر نکتہ چینی کرو گے اور اسے ڈانٹ پلاؤ گے تو یاد رکھو، ایک وقت ایسا آئے گا جب تمہاری ڈانٹ برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

سچی دوستی،

باپ:۔ ”رات کو کہاں تھے؟“

بیٹا:۔ ”دیر ہو گئی تھی۔ دوست کے گھر ہی رُک گیا تھا۔“

باپ نے اسی وقت فون اُٹھایا اور اس کے دس دوستوں کو کال کی۔

چھ دوستوں نے کہا۔ ”ہاں انکل! وہ رات میرے پاس ہی سویا تھا۔“

تین نے کہا۔ ”انکل وہ سو رہا ہے۔ آپ کہیں تو اُٹھا دوں۔“

ایک نے تو حد کر دی۔ کہنے لگا۔ ”جی ابو۔ بولیں۔“

انجل۔ ڈہرکی

سوالاً جواباً،

”بیگم! تمہیں کچن میں گئے تین گھنٹے ہو گئے۔ کیا چائنیں ابھی تک تلی نہیں جا سکیں؟“

”تل تو میں نے لی تھیں لیکن وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں، گلی نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے انہیں بھون لیا۔ لیکن بھوننے سے وہ جل گئیں۔ اب اگر آپ ذرا دیر اور صبر کریں تو میں انہیں ابال کر لا رہی ہوں۔“

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

ہم ہیں پاکستانی،

پاکستانی باآسانی شناخت ہو سکتے ہیں کیونکہ...!

- وہ ہر کھانا لہسن اور پیاز میں پکاتے ہیں۔
- گفٹ پیپرز کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔
- گیٹ پر رخصت ہونے سے پہلے آدھا گھنٹہ ضرور بات کرتے ہیں۔
- بچا ہوا کھانا فریج میں ضرور رکھتے ہیں۔
- کھانا پکاتے ہوئے کبھی بھی پیمانہ ناپ کر آئل استعمال نہیں کرتے۔ بس اندازے سے ڈالے جاتے ہیں۔
- بغیر ڈاکٹر کی تجویز کے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔
- بیڈ شیٹ یا صوفے کو صاف رکھنے کے لیے کوئی چادر اس کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔
- ہمیشہ کہتے ہیں۔ گندا کپڑا دینا کوئی چیز صاف کرنی ہے۔

عائشہ۔ گوجرہ

راہ کے دیپ،

- دیو کی طرح طاقت ور ہونا اچھی بات ہے لیکن دیو کی طرح طاقت استعمال کرنا ظلم ہے۔ (شیکسپیئر)
- میں زندگی میں کبھی ناکام نہیں رہا، کیونکہ میں نے ہر کام سے کچھ نہ کچھ فائدہ اور سبق ضرور حاصل کیا۔ (ایڈیسن)
- دُنیا کو بیماریوں، سیلابوں اور زلزلوں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا غلط مشوروں نے۔ (والیٹر)
- جب تک قوموں کو خود اپنی اصلاح کا خیال نہیں آتا۔ قدرت بھی انہیں درست نہیں کرتی۔ (علامہ اقبال)

٭ وراثت میں مفلسی ملے تو شرافت کو اپناؤ۔
(بقراط)

٭ زندگی دوسروں سے اُدھار نہیں لی جاتی اسے خود ہی اپنے اندر روشن کرنے کی ضرورت ہے۔
(علامہ اقبال)

٭ جہاں خواب وخیال چھین لیے جائیں، وہاں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم انسانوں میں رہ رہے ہیں یا جانوروں کے ساتھ۔

٭ انجام اچھا ہے تو تمام اچھا ہے۔

سیّدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکّا

اہم بات،

دُنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک حوصلہ توڑنے والے، دوسرے حوصلہ بڑھانے والے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس کی بات پر عمل کرتے ہیں۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکّا

صدا،

درِ شاہی سے ٹکرا کر صدائیں لوٹ آتی ہیں
مجھے دربان نے اتنا بتایا ہے
ہمارا بادشاہ بس بولتا ہے
سُن نہیں سکتا

(صفورہ احمد)

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

عقل اور علم،

ہمیں ہر اس شے سے محبّت کرنی چاہیے جو محبت کرنے کے لائق ہو اور ہر اس چیز سے نفرت کرنی چاہیے جو قابلِ نفرت ہو، لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس دونوں کا فرق کرنے کے لیے عقل کی دولت اور علم کی روشنی ہو۔

صائمہ جیمی۔ کراچی

مشورہ،

ایک خاتون نے گلوگیر آواز میں ماہرِ نفسیات کو بتایا۔
"میرا شوہر مجھ سے زیادہ اپنی ماں کو چاہتا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ میں اور تمہاری ماں ڈوب رہے ہوں تو تم پہلے کس کو بچاؤ گے..؟"
"اس نے کیا کہا؟" ماہرِ نفسیات نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔
"وہ کہنے لگا۔" اپنی ماں کو کیونکہ اس کا حق زیادہ بنتا ہے۔" اب مجھے بتاؤ میں ان حالات میں کیا کروں؟"
ماہرِ نفسیات نے چند کتابیں دیکھیں، پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔
"آپ تیراکی سیکھنا شروع کر دیں!"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

تفریح،

ایک سبزی سیلز مین کاروباری دورے پر تھا۔ راستے میں اسے ایک گاؤں میں رکنا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر شام کو اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے ایک مقامی دیہاتی سے پوچھا۔
"یہاں کوئی سینما ہے؟"
"نہیں۔" دیہاتی نے جواب دیا۔
"کوئی تھیٹر وغیرہ ہے، جہاں آدمی جا کر کوئی ڈراما یا شو وغیرہ دیکھ سکے۔"
"نہیں جناب۔" دیہاتی نے نفی میں سر ہلایا۔
"حیرت ہے! پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟" شہری سیلز مین نے پوچھا۔
"بس جی۔ وہ بازار میں ایک چائے خانہ ہے۔ ہم وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی شہری بابو آ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے آ کر دیکھتے ہیں۔ بس یہی ہماری تفریح ہے!"

شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ

٭

سیّدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر بشیر بدر کی یہ خوبصورت غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

یہ چراغ بے نظر ہے، یہ ستارہ بے زباں ہے
ابھی تجھ سے ملتا جُلتا کوئی دوسرا کہاں ہے

وہی شخص جس پہ اپنے دل و جاں نثار کر دوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے

کبھی پا کے تجھ کو کھوتا، کبھی کھو کے تجھ کو پانا
یہ جنم جنم کا رشتہ ترے میرے درمیاں ہے

مرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دُکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے

میں اس گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
تیرا جسم بے تغیر، میرا پیار جاوداں ہے

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہمسفر کہاں ہے

عائشہ نورین کی ڈائری سے

وہ بچے جو غربت میں آنکھ کھولتے ہیں، جن کا بچپن اور جوانی کڑی مشقت میں گزرتی ہے۔ پھر ایک عمر گزار کر کامیابی ملتی ہے۔ اس کیفیت کو امجد اسلام امجد نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

سیلف میڈ لوگوں کا المیہ،

روشن مزاجوں کا کیا عجب مقدر ہے
زندگی کے رستے میں بچھنے والے کانٹوں کو
راہ سے ہٹاتے ہیں

ایک ایک تنکے سے آشیاں بنانے میں
خوشبوئیں پکڑنے میں گلستاں سجانے میں
عمر کاٹ دیتے ہیں
اور اپنے حصّے کے پھُول بانٹ دیتے ہیں
کیسی کیسی خواہشوں کو قتل کرتے جاتے ہیں
درگزر کے گلشن میں پھُول بن کے رہتے ہیں
صبر کے سمندر میں کشتیاں چلاتے ہیں
یہ نہیں کہ ان کو اس روز و شب کی محنت کا
کچھ صلہ نہیں ملتا
مرنے والی آسوں کا خوں بہا نہیں ملتا
زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں
سب ہی ہاتھ آتی ہیں
سب ہی مل بھی جاتی ہیں
وقت پر نہیں آتیں
وقت پر نہیں ملتیں
ان کو محنت کا اجر مل تو جاتا ہے
لیکن اس طرح جیسے
قرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جائے
اصل جو عبارت ہو پس نوشت ہو جائے
فصلِ گُل کے آخر میں پھُول ان کے کھلتے ہیں
ان کے صحن میں سورج
دیر سے نکلتے ہیں۔

٭

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

فرحت سیال..... جھنگ

میرا خواتین کے ساتھ رشتہ بہت پرانا ہے تقریباً اسکول کے زمانے سے جب ہم سب دوست اپنی کتابوں میں چھپا کر پڑھا کرتی تھیں اور اب تو ماشاء اللہ خود کے جتنے بچے بھی ہو گئے ہیں، میں گاؤں میں رہتی ہوں اور مجھے خواتین خریدنے میں کافی مشکل ہوتی ہے اس لیے پلیز آپ مجھے جنوری 2015ء سے خواتین ہر ماہ دسمبر تک ارسال کردیں۔

ج : پیاری فرحت! اگر ہم آپ کو پرچا وی پی کریں گے تو آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ آپ کو ڈاکیہ کو 130 روپے دینا پڑیں گے جبکہ پرچے کی قیمت 60 روپے ہے، اس لیے آپ ہمیں 700 روپے منی آرڈر کردیں، ہم آپ کو ہر ماہ رجسٹری کردیں گے، آپ کو گھر بیٹھے ہر ماہ باقاعدگی سے پرچا ملتا رہے۔

منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں
خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار۔ کراچی
اپنا صحیح ایڈریس بھی لکھیں۔

شبانہ عندلیب..... گوجرانوالہ

میری سالگرہ سے ایک دن پہلے یعنی پانچ دسمبر کو خواتین ملا مگر یہ کیا.....! دل دھک سے رہ گیا۔ اپنا چھوٹا سا نام بھی نہ ملا ڈھونڈے سے۔ ابھی اپنا غم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ ایک اور دھچکا لگا نمرہ احمد کا نمل غائب.....! اس کے بعد گرتے پڑتے آب حیات تک پہنچی سالار سکندر کی طرح ہمارے نو سال بھی ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ ناول کا پہلا صفحہ پڑھ کے بالکل نہیں لگا کہ ہم نو سال بعد پڑھ رہے ہیں۔ عمیرہ جی یہ آپ کا خیال تھا کہ ہم پیر کامل کو کچھ کچھ بھول گئے ہیں۔ یہ آج بھی ہمارے دل میں روز روشن کی طرح زندہ ہے اور پہلے سے زیادہ۔

شادی کے دوسرے دن سے ہی مسئلے مسائل شروع ہو گئے اور اس میں سالار اور امامہ دونوں کی ہی غلطی تھی۔ کیونکہ سالار نے اپنے رویے سے امامہ کو واقعی مایوس کیا۔ کہاں رات کو محبوبہ اور دلربا اور نئی زندگی کی پہلی سحری بھی ساتھ نہیں کی۔ سالار صاحب کو بھی کچھ ہوش کے ناخن لینے ہی پڑیں گے کہ مقابل بھی کوئی ایویں نہیں ہے۔ ٹکر برابر کی ہے۔

اب آتے ہیں نمل کی طرف۔ ہاں جی نمرہ جی بتایئے۔ آپ کیوں غائب رہیں اس مہینے۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کی غیر حاضری ہمیں بالکل بھی گوارا نہیں وعدہ کریں آئندہ سے ایسا نہیں کریں گی۔ حنین، زمر اور فارس نے ہمیں اپنے حصار میں قید کرلیا ہے، اب ہمیں اس سے سعدی ہی باہر نکال سکے گا۔

عہد الست کے لیے تو الفاظ کم پڑجاتے ہیں۔ بہت خوب صورتی سے اپنے انجام کی طرف گامزن ہے۔ تنزیلہ کے لیے بہت زیادہ دعائیں۔

ج : شبانہ! بے حد معذرت کہ آپ کے خطوط شامل نہ کرسکے۔ "پیر کامل" بھلایا نہیں جاسکتا ہمیں اس کا بخوبی اندازہ ہے۔ ہم نے "پیر کامل" کا خلاصہ ان قارئین کے لیے دیا جنہوں نے "پیر کامل" نہیں

پڑھا۔

خواتین ڈائجسٹ پہ تفصیلی تبصرہ کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

سدرہ خان..... جہلم

پورا سال K.D پڑھا۔ داد دیں ہمیں کہ سیلابی صورت حال میں بھی ڈائجسٹ منگوا لیا۔ باوجود اس کے کہ سارا علاقہ پانی سے گھرا ہوا تھا ہمارے گھر کے چاروں طرف بھی پانی ہی پانی تھا۔

اس ماہ نمل کو نہ پا کر ناخوش ہوں۔ مگر کوئی بات نہیں اگلی بار سہی۔ بن مانگی دعا اور عہد الست ٹھیک جا رہے ہیں۔ عمیرہ احمد کے دوبارہ آنے کی خوشی تو ہوئی مگر آب حیات مکمل ہونے کا انتظار ہے کیونکہ جب یہ ناول مکمل ہوگا، میں تب پڑھوں گی کیونکہ پہلی قسط مجھے اتنی سمجھ نہیں آئی۔

ثمینہ صاحبہ اچھا لگا آپ کا انداز۔ سائرہ رضا حد ہوتی ہے حقیقت لکھنے کی۔ آئینہ پڑھ کر پھر یہ احساس ہوا۔ ذرا ہاتھ ہولا رکھیں۔ آپ کے افسانوں کے کردار ارد گرد ڈھونڈنا شروع کردیتی ہوں۔ باقی سب سلسلے بہترین ہیں۔

ج : سدرہ! آپ کہانی لکھ کر بھجوائیں پھر ہم کوئی رائے یا مشورہ دے سکتے ہیں۔ "آب حیات" مکمل ہونے کا انتظار نہ کریں۔ ہر ماہ پڑھ کر اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کریں۔ پہلی قسط سے اندازہ نہ لگائیں۔ آگے کہانی صاف اور واضح ہے۔

ملائکہ کوثر..... بسم اللہ پور

"نزل" میمونہ صدف کا تلخ حقائق پر مبنی ناولٹ تھا جس کو پڑھ پڑھ کر میں روتی رہی۔ مجھے لگا۔ میمونہ صدف نے میری کہانی لکھ دی ہے۔ میری ماں بولتی نہیں تھی۔ اپنی ماں کو کھانا کھلانا، نہلانا، چلانا پیمپر بدلنا یہ سارے کام بخوشی اپنے ہاتھ سے کرنے میں مجھے کبھی عار محسوس نہیں ہوا۔ آخری دن کی صبح جب امی جان کو کمزوری کی وجہ سے پاٹ کی کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو گیا تو بہت غم زدہ حالت میں ان کی بے چارگی دیکھ کر میرے منہ سے یہ لفظ نکل گئے۔ اللہ سوہنے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ آخری ٹائم یہ۔ جب ان کو یخنی والی کھچڑی کھلا رہی تھی تو نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ وہ موت کی وادی میں اتر گئیں۔ مجھے لگا، یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے صبح والا جملہ پھر کھانا کھلانے کی کوشش جب کہ وہ رخت سفر باندھ رہی تھیں۔ میں بہت روتی بلکتی رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے معافیاں مانگتی رہتی تھی ایک دن میں نے خواب میں دیکھا میری ماں (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) بڑے تکیے کے سہارے لیٹی ہیں میں بھاگ کر روتے ہوئے ان کے سینے سے لگ جاتی ہوں۔ وہ اپنے مہربان ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کرتی ہیں اور کہتی ہیں "یہ سب اللہ کے کام ہیں، انسان کے بس میں کوئی اختیار نہیں ہے تم مت رویا کرو۔" میں کہتی ہوں اچھا ٹھیک ہے میں اب بالکل نہیں روؤں گی۔ پھر سہانا سپنا ٹوٹ گیا۔

"آئینہ" سائرہ رضا کی زبردست کہانی تھی۔ وہ جب بھی لکھتی ہیں باکمال اور موضوع بھی لاجواب چنتی ہیں۔ ثمینہ عظمت علی کی "بابا کا نوٹ" صوفیہ سرور کی "روشن صبح" وجیہہ احمد کی "دھوپ سے سیلے گھر" بے حد پسند آئیں۔ "عہد الست" میں تنزیلہ ریاض کا فن نکھر نکھر کر

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ دلشاد نسیم اور ڈاکٹر نگہت نسیم کی والدہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ خصوصاً ایسی ماں جنہوں نے کٹھن حالات کے باوجود اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ آنے دی ہو، ہم بہن دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اہل خانہ صبر جمیل سے نوازے۔ آمین
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

سامنے آرہا ہے۔ نمرہ احمد کی "نمل" کو اس دفعہ مس کیا۔ بے حد اچھی لگ رہی ہے اس کی کہانی بھی "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید کی تعریف کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔

ج : پیاری ملائکہ! کسی معذور کی خدمت آسان نہیں بہت تھکا دینے والا کام ہے۔ کبھی کبھی جب ہم خود کمزور یا بیمار ہوتے ہیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی منہ سے کچھ ایسے کلمات نکل جاتے ہیں، لیکن ماں کا دل اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ اسے اولاد کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔ آپ نے اپنی ماں کی اتنی خدمت کی، ان کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثوبیہ نور...... کشن گڑھ بھاول نگر

"کوہ گراں تھے ہم" (جس کا عنوان بھی زبردست تھا) زندگی کے تلخ و شیریں رنگوں سے آشنائیاں دلا کر بالآخر اختتام کو پہنچی گویا ایک پورا دور ختم ہوا۔

خاصا لیٹ ہی سہی مگر میں اس پر تھوڑا تبصرہ کرنا چاہوں گی۔ حسب توقع اور حسب سابق عنیزہ جی نے بہت زبردست لکھا۔ حالانکہ آغاز میں ریشم کے ڈوروں جیسے الجھے کردار تھے، مگر عنیزہ جی نے ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا۔ عنیزہ جی! کوہ گراں کے اختتام کے ساتھ ہی میں نے آپ کی دوبارہ آمد کا انتظار شروع کر دیا ہے۔

عمیرہ احمد کا نام اتنے عرصے کے بعد دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی ابھی چونکہ کرداروں کا "کردار" کھل کر سامنے نہیں آیا تو تبصرہ تو کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مگر یقین ہے کہ ہمیشہ کی طرح زبردست ناول پڑھنے کو ملے گا اور بے چارے سالار کے ساتھ تو شادی کے اگلے دن ہی سعیدہ اماں کا اتنا برا سلوک، کیا ہی ناپسندیدہ بہوؤں کے ساتھ ہوتا ہوگا (شادی کے اگلے ہی دن تو شاید نہ ہی ہوتا ہو)

بینک میں اعلیٰ عہدہ، ذہین و فطین بندہ جس کے آئی کیو لیول کا ڈھنڈورا پورے پیر کامل میں بجتا رہا، بے چارہ، غریب بیوی کو ڈیل کرنا نہیں جانتا، سالار کو چاہیے تھا اس دوران کوئی دو چار افیئر ہی چلا لیتا۔ تجربہ ہو جاتا۔ جبھی خواتین کو تو بڑے بڑے فلاسفر نہ سمجھ سکے۔ سالار صاحب کس کھیت کی مولی ہیں۔ "منہ سے پھوٹتا بھی نہیں اور یہ امید بھی کہ اگلا بندہ وہ ہی کرے جو ہم نے سوچ رکھا ہے، شوہر نہ ہو گیا نجومی ہو گیا۔

"عہد الست" کے لیے تو کیا ہی کہوں۔ تنزیلہ جی تو ہمیشہ ہی زبردست لکھتی رہی ہیں مگر اب کے تو بدریا ٹوٹ کر برسی ہے۔ کافی عرصے بعد آئی ہیں (اب تو آئے ہوئے بھی "کافی عرصہ" ہو گیا اور چھا گئی ہیں اور چھائے ہوئے بھی)

"بن مانگی دعا" میں عفت جی ادھر عون کی ایسی کی تیسی کروا رہی ہیں تو ادھر ابیہا کی۔ ویسے یہ محترمہ ثانیہ کی مجھے تو سمجھ نہیں آئی ایک طرف تو اتنی انا پرستی کہ شوہر کی ایک غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں اور دوسری طرف فاران کے ساتھ ایسی بے تکلفی کہ عزت نفس کا ہی خیال نہیں، اور عفت جی منہ پھٹ دیہاتن والی اصطلاح بھی میری سمجھ سے باہر ہے، بھئی عادت یا فطرت کا شہر اور دیہات سے تو تعلق نہیں بنتا بلکہ "تم چپ رہو" کا سبق دیہاتوں میں زیادہ پڑھایا جاتا ہے۔

صبح روشن کا اختتام اچھا تھا انسان معاف کر کے جتنا پرسکون ہو سکتا ہے انتقام لے کر ہرگز نہیں ہو سکتا۔" دھوپ سے سیلے گھر" میں تاشہ والا قصہ ڈال کر بلاوجہ بات کو بڑھایا گیا۔ سائرہ رضا ہمیشہ کی طرح اچھا ٹاپک لے کر آئیں۔ راشدہ رفعت نے اچھا پیغام دیا، انسان ہمیشہ نہ ہونے کے رونے روتا رہتا ہے جو ہے اس کی قدر نہیں کرتا۔ میمونہ صدف کے خیال سے تو سو فیصد متفق ہوں کہ عزت کے بغیر زندگی گزارنا عذاب بن جاتا ہے۔ محبت تو ثانوی چیز ہے بلکہ جہاں عزت ہو وہاں محبت بھی ہو ہی

دعا

ہماری پیاری مصنفہ قرۃ العین رائے کے بازو میں فریکچر ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ سے نوازے قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

جاتی ہے۔ زرتش سے ملاقات اچھی رہی۔ کیوٹ سی لڑکی، پیاری پیاری باتیں اور نابیہ کے بجائے تو سہیل احمد کا انٹرویو کرنا چاہیے تھا بلکہ اب کر لیں، یہ تو خالی ہنسنے کے پیسے لیتی ہیں، یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام (ہنسنے سے خون بڑھتا ہے نا؟ بڑھتا ہی ہوگا شاید اسی لیے تو اتنی صحت مند ہیں ماشاء اللہ)

ج : ثوبیہ! طویل تبصرہ بہت جامع اور دلچسپ ہے۔ افسوس کہ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے ہم شائع نہیں کر سکتے۔ عمیرہ احمد کا تو نام ہی کافی ہے "آب حیات" کے بارے میں آپ کا یقین درست ہے۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ عنیزہ کی آمد کا ہمیں بھی انتظار ہے۔

فوزیہ ثمروٹ، آمنہ میر...... گجرات

عمیرہ جی نے اپنا وعدہ ایفا کیا ہے۔ دوسری قسط سے شروع کیا۔ لاجواب عمیرہ جی کا تو کسی سے کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں۔

مگر ایک بات ہے۔ ان کی تحریر ہمارے دماغ کے سائز سے کچھ بڑی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ ابتدا میں جو لڑکی پامسٹ کو ہاتھ دکھا رہی ہے۔ کیا امامہ تھی۔ پچھلی تحریر کا خلاصہ بھی تو نہیں تھا۔ وجیہہ احمد کی تحریر پہلی دھوپ کے سیلے گھر۔ ویل ڈن وجیہہ جی۔ اتنی اچھی تحریر دل خوش کر دیا۔ عیسیٰ کا کردار پسند آیا۔ عورت کی جب مت ماری جاتی ہے تو پھر تاشہ جیسی ذلت ہی اس کا نصیب بنتی ہے۔ عیسیٰ اور خدیجہ دونوں کردار بہت اچھے تھے، اپنوں کے لیے اپنی خوشیاں قربان کرنے والے۔ روشن صبح دل موہ لینے والی تحریر۔ حذیفہ خوش نصیب نکلا۔

ناولٹ آئینہ موضوع پرانا مگر تحریر نے جکڑے رکھا۔ حاجرہ کا صبر پسند آیا۔ عہد الست بڑی مشکل تحریر مگر پڑھی۔

ج : پیاری فوزیہ! بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ ہر ماہ "آب حیات" پڑھ رہی ہیں۔ ہماری بہت سی قارئین ناول مکمل ہونے کا انتظار کرتی ہیں۔ اور قسطیں جمع کر کے پڑھتی ہیں۔ اس طرح وہ ہر ماہ ہمیں اپنی رائے نہیں دے پاتیں۔ آپ کی آسانی کے لیے اس ماہ ہم پچھلی اقساط کا خلاصہ دے رہے ہیں۔

ایک بات کی وضاحت کر دیں ناول کا پہلا حصہ زیادہ واضح نہیں تھا اس لیے آپ کو الجھن محسوس ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ سالار اور امامہ کی ہی کہانی ہے اور پھر عمیرہ کا مخصوص انداز وہ بڑی سے بڑی بات وہ بہت سادہ اور رواں انداز میں کہہ جاتی ہیں۔

عائشہ ثناء اللہ...... کاہنہ نو

خطوں میں اکثر بہنیں لکھتی ہیں کہ ان کی والدہ بھی خواتین ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ میری ماما نہ خواتین ڈائجسٹ پڑھتی ہیں اور نا ہی انہیں میرا پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ بلکہ مجھے تو ماما سے ڈانٹ پڑتی ہے اکثر..... ایک بار ڈائجسٹ مل جائے تو بس پورا چٹ کر کے ہی کوئی دوسرا کام کرتی ہوں، ایسے میں ماما مجھے آواز دیتی ہیں "عائشہ بات سنو" میں کہتی ہوں ماما بس "ایک منٹ" اور وہ ایک منٹ اتنا لمبا ہو جاتا ہے کہ بس پھر ماما کی ڈانٹ شروع لیکن پھر میں ماما کو منا لیتی ہوں ان کی باقی ساری باتیں مان کر۔ آخر میری پیاری ماما ہیں..... اور اگلے ماہ کا ڈائجسٹ بھی تو انہوں نے ہی خرید کر دینا ہوتا ہے..... اس ماہ کی ساری کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ اب تو سب سے زیادہ عمیرہ احمد کے ناول

دعائے مغفرت

ہماری ساتھی صبا سحر کے بہنوئی محمد اسلم شیخ مختصر سی علالت کے بعد راہی ملک عدم ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

محمد اسلم شیخ نہایت مرنجان مرنج اور محبت کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی اچانک وفات ان کے متعلقین کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جنت فردوس میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

”آبِ حیات“ کا انتظار رہتا ہے۔

ج : پیاری عائشہ! ہم ان سطور کے ذریعے آپ کی ماما سے کہیں گے کہ وہ آپ کو خواتین ڈائجسٹ پڑھنے سے نہ روکیں۔ اس میں سبق آموز کہانیاں بھی ہوتی ہیں اور مفید سلسلے بھی جن سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، لیکن عائشہ! ایک بات کا آپ بھی خیال رکھیں جب آپ کی ماما آپ سے کوئی کام کرنے کو کہیں تو فوراً ”ڈائجسٹ رکھ دیں، اور پہلے وہ کام کریں پھر وہ آپ کو ڈائجسٹ پڑھنے سے نہیں روکیں گی۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37-اردو بازار کراچی

اقرا اسحاق چوہدری..... حویلی لکھا، ضلع اوکاڑہ، تحصیل دیپالپور

اس ماہ مکمل ناول وجیہہ احمد کا ”پہلی دھوپ کے سیلے گھر“ اور صوفیہ سرور کا ”روشن صبح“ دونوں ہی زبردست تھے۔ سائرہ رضا میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، بس اتنا کہوں گی ایکسیلنٹ۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ حسب حال کی ناجیہ سے ملاقات اچھی رہی۔ ٹی وی فنکارہ زرنش کچھ خاص نہیں تھیں۔ خاتون کی ڈائری میں نوشابہ منظور کی غزل اچھی لگی۔ رنگا رنگ پھول بھی زبردست تھے، خاص طور پر ”مرچیں“، ”کھٹا میٹھا“ اور ”قیمت“ چھوہارے کا حلوہ ٹرائی کیا تھا، مزے دار بنا تھا۔ ظاہر ہے، ہم نے جو بنایا تھا۔

ج : پیاری اقرا! خواتین کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

آمنہ شبیر راجہ..... راولپنڈی

بہت عرصے سے سوچ رہی تھی کہ خواتین کی محفل میں شرکت کروں، لیکن دل کچھ ٹوٹ سا گیا تھا خواتین ڈائجسٹ سے.... سوچا تو تھا رشتہ ہی توڑ دوں.... لیکن دل پہ لگی تصویر کاغذ کی بنی تصویر کی طرح نہیں ہوتی جسے آسانی سے پھاڑ دیا جائے اور نہ ہی موبائل یا کیمرہ میں کھینچی گئی تصویر کی طرح جسے ڈیلیٹ کیا جاسکے۔ یہ ہوا میرے ساتھ اور پھر.... لکھ ڈالی میں نے چٹھی آپ کے نام....

ج : آمنہ بہت اچھا کیا کہ آپ نے اپنے دل کی بات سن لی اور ہمیں چٹھی لکھ ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ آپ لوگ اتنی محبت سے ہمیں خط لکھتی ہیں اور خط شامل نہیں ہوتا تو آپ کو دکھ ہوتا ہے۔ خط شائع نہ ہونے کی مختلف وجوہات ہیں بھی تاخیر سے موصول ہوتے ہیں تو ہم شامل نہیں کر پاتے، کبھی صفحات کی مجبوری آڑے آجاتی ہے۔ اور کبھی ہمیں موصول نہیں ہوتے۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ اب آئندہ ماہ تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

خالدہ جیلانی

ناہید شبیر رانا ____ رحمان گڑھ

ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے

صبا نوشاہی ____ ڈوگہ گجرات

نہ اٹھا سکوں گی ہاتھ میں، میرے ہاتھ ہیں لہو لہو
میری ذات کی ہیں جو کرچیاں تم دکھ سکو تو سمیٹ لو

زاہدہ سلیم ____ ڈی آئی خان

تم نہ مانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے

سلمیٰ صابر ____ جہلم

ہزار رنگ دیے جس نے زندگانی کو
اسی نظر سے محبت میں سادگی آئی

شفاعت بتول ____ جام پور

یہ دستورِ وفا صدیوں سے رائج ہے زمانے میں
صدائے قرب دی جن کو انہی کو دور دیکھا

حافظہ سمیرا ____ 157 - این بی

وجہ بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی!
بس وہ لہجہ بدلتے گئے اور ہم اجنبی ہوتے گئے

ثمینہ کوثر عطاری ____ ڈوگہ گجرات

وہ تباہ حال، وہ سر پھرے بڑا نام عشق میں کر گئے
تری جستجو میں جو کھو گئے، تری آرزو میں جو مر گئے
ہے روش روش میں شگفتگی، کہیں تازگی کہیں نغمگی
یہ چمن سے کس کا گزر ہوا کہ تمام پھول نکھر گئے

نگینہ شہباز ____ لاہور

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

حنا اقبال ____ حویلی لکھا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

عائشہ احسان ____ گوجرہ

ہمارا در بدری کا یہ ماجرا ہے کہ ہم
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تحریم ____ فیصل آباد

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے!
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

زرتاشیہ شیرازی ____ جڑانوالہ

جس کی نظروں میں ہم نہیں اچھے
کچھ تو وہ شخص بھی برا ہو گا

حرمت ردا ____ ڈلوال

بچھڑتے وقت کسی سے ہمیں تھا یہی گمان
کہ زخم کیسا بھی ہو، عمر بھر نہیں رہتا

نادیہ، طوبیٰ ____ گجرات

بارے میں اس کے سوچیں بھی تو کیا سوچیں قتیل
وہ غیر نہیں تو اپنا بھی نہیں لگتا

نخبہ اکرم ____ گاؤں گویکی

لوگوں کو گماں تک نہیں ہوتا ہے جنوں کا
ہم دل کی طرح چاک گریباں نہیں کرتے

نویدہ ____ گوجر خان

کسی کو راس آئی بے وفائی
کسی کو کر دیا رسوا وفا نے

فوزیہ ثمر بٹ ____ گجرات

عشق سچا ہو تو اس طرح امر ہوتا ہے
جس طرح مر نہیں سکتا کسی فن کار کا فن

ڈراما سیریل چپ رہو کے ہیرو

عمیمہ ملک کے بھائی

باتیں فیروز خان سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"

"فیروز خان۔"

2 "پیار کا نام؟"

"امی مجھے گڈا کہتی ہیں' باقی تو سب فیروز ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"

"11 جولائی 1990ء / کوئٹہ۔"

4 "ستارہ / قد؟"

"کینسر / اور 5 فٹ 11 قد ہے میرا۔"

5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"

"ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ 4 بہنیں اور دو بھائی اور — میرا نمبر پانچواں ہے۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"

"بزنس لاء میں ڈگری لی ہے لندن یونیورسٹی سے۔"

7 "شادی؟"

"ابھی جناب بہت چھوٹا ہوں' ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی کوئی ارادے نہیں ہیں شادی کے۔"

8 "شوبز میں آمد؟"

"اپنے ٹیلنٹ سے آیا ہوں۔"

9 "پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟"

"چپ رہو" ڈرامہ سیریل ہے.... اور اس نے مجھے بہت شہرت دی ہے۔"

10 "پہلی کمائی؟"

"سولہ سال کی عمر میں کی تھی.... جب میں ایک اسٹور میں کام کرتا تھا اور اس اسٹور کا ٹائلٹ صاف کیا تھا میں نے تو مجھے پیسے ملے تھے۔ ملک سے باہر تھا.... پڑھنے گیا تھا۔"

11 "شوبز کی کوئی برائی؟"

"صرف شوبز میں نہیں' دنیا میں ہر جگہ برائی ہے۔"

12 "صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے یا؟"

"الحمدللہ۔ مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے اور میں نو بجے تک اٹھ جاتا ہوں۔"

13 "رات کب سوتے ہیں؟"

"اس انڈسٹری میں صبح کا تو پتا ہے کہ کب ہونی ہے' رات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔" قہقہہ۔

14 "صبح اٹھ کر سب سے پہلے کس کو دیکھتے ہیں؟"

"اپنی ماں کو' ان کے پاس بیٹھتا ہوں اور باتیں کرتا ہوں۔"

15 "گھر والوں کی کوئی بات جو بری لگتی ہو؟"

"الحمدللہ.... دل پہ ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں مجھے اپنے گھر والوں کی کوئی بات بری نہیں لگتی.... مجھے اپنے گھر والوں سے بہت پیار ہے۔"

16 "کیا اپنے آپ کو مکمل انسان سمجھتے ہیں؟"

"جسمانی لحاظ سے الحمدللہ میں ایک مکمل انسان ہوں۔"

17 "شدید بھوک میں کیفیت؟"

"اوہو.... میں پاگل ہو رہا ہوتا ہوں' اس وقت میرے سامنے کوئی بھی آئے میں کاٹ لوں گا۔"

18 "دوستوں میں ایزی فیل کرتے ہیں یا رشتے داروں میں؟"

"گھل مل تو جلدی جاتا ہوں' مگر دوست کم بناتا ہوں۔ مجھ سے دوستی کرنا مشکل ہے۔"

19 "مطالعہ کا شوق ہے؟"

"بالکل ہے اور مطالعہ میں اپنے آپ کو جاننے کے لیے کرتا ہوں۔"

20 "آپ چاہتے ہیں کہ؟"

"میرے والدین خود کہیں کہ ہمارے بیٹے نے بہت محنت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔"

21 "شدید تھکن میں بھی نہیں بھولتے؟"

"جم جانا.... یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

22 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"

"بہت خوش ہو کر اور میں تو ویسے ہی بہت خوش رہتا ہوں۔"

23 "ضد کرتے ہیں یا بات مان لیتے ہیں؟"

"میں بہت ضدی ہوں۔ کوئی میری بات نہ مانے تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔"

24 "دماغ کب گھوم جاتا ہے؟"

"جب کوئی میری عزت نہ کرے' عزت بہت ضروری چیز ہے۔"

25 "آپ کو ڈر لگتا ہے؟"

"قسم سے مجھے اپنے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بچپن میں بہت غلطیاں ہوتی تھیں۔ اب سنبھل گیا ہوں۔"

26 "کس قسم کی خواتین اچھی لگتی ہیں؟"

"جن میں نسوانیت ہوتی ہے' ڈیسنٹ ہوتی ہیں۔ نزاکت ہوتی ہے۔"

27 "کیا بات بری لگتی ہے خواتین میں؟"

"اب پہلے جیسی شرم و حیا نہیں رہی لڑکیوں میں۔"

28 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"

"اچھا لگتا ہے.... انجوائے کرتا ہوں۔"

29 "پرائز بانڈ لیتے ہیں؟"

"نہیں جی.... مجھے یقین نہیں ہے۔ مجھے محنت پہ یقین ہے۔"

30 "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"

"بڑے بھائی کا.... مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

31 "کچھ وقت سے پہلے ملا؟"

"نہیں جی.... بہت جدوجہد کے بعد ملا' جو کچھ بھی ملا۔"

32 "جوائنٹ اکاؤنٹ کس کے ساتھ ہونا چاہیے؟"

"بیگم کے ساتھ.... تاکہ جب اس کو ضرورت ہو وہ رقم نکلوا لے۔"

33 "کس ملک کی شہریت کے خواہش مند ہیں؟"

"کسی کی نہیں.... صرف اور صرف پاکستان۔"

34 "شاپنگ کے وقت آپ کی ترجیح؟"

"کپڑے.... مجھے شاپنگ کا بہت شوق ہے۔"

35 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"

"والدین کو خوش رکھنا' اپنے مذہب کو فالو کرنا اور اپنے بہن بھائیوں کو خوش رکھنا۔"

36 "آپ کانپ جاتے ہیں؟"

"جب میں یاد کرتا ہوں کہ امی بیمار ہوئی تھیں.... خدا میری ماں کا سایہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے۔"

37 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"جو کچھ بھی دیں دل سے دیں۔"

38 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"

"تعریف اچھی لگتی ہے۔"

39 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"یہی.... یعنی شوبز۔"

40 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں یا.....؟"
"بستر چھوڑ دیتا ہوں۔ مجھے اٹھنا کبھی بھی مشکل نہیں لگتا۔"
41 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے یا پرائے؟"
"دونوں ہی ہوتے ہیں میرے خیال میں۔"
42 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"
"صرف اور صرف گھر پر۔"
43 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"شلوار قمیص بہت پسند ہے، لیکن کم پہنتا ہوں تاکہ جب پہنوں نیا لگے۔"
44 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"
"ذہین ہونی چاہیے۔ خوب صورتی ایکسٹرا کوالٹی ہوئی۔"
45 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں یا پھر امی کے کمرے میں۔"
46 "کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کی خواہش ہے؟"
"بہت خواہش تھی کہ سجل کے ساتھ کام کروں جو کہ پوری ہوئی اب صبا قمر کے ساتھ خواہش ہے اور صنم سعید کے ساتھ۔"
47 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوری دیتے ہیں؟"
"گھر والوں کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتا ہوں۔"
48 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"میوزک سنتا ہوں، مطالعہ کرتا ہوں یا پھر جم چلا جاتا ہوں۔"
49 "مہمان اچانک آجائیں تو؟"
"تو کوئی مسئلہ نہیں..... مجھے مہمان اچھے لگتے ہیں۔"
50 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"
"بہت مرتبہ۔"
51 "اگر آپ حکومت میں آجائیں تو کیا کریں گے؟"
"اپنے عوام کی مدد کروں گا، ان کے حقوق کی جنگ لڑوں گا۔"
52 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"دعائیں۔"
53 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"نصیحت انسان کے بھلے کے لیے ہوتی ہے اس لیے بری نہیں لگتی۔"
54 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"
"وہ دور، وہ وقت جب آپ صحت و تندرستی کے ساتھ اپنا وقت گزار رہے ہوں۔"
55 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"بہت زیادہ پابندی کرتا ہوں اور سب کو تلقین بھی کرتا ہوں۔"
56 "کن پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"
"اپنے بھائی اپنی بہنوں اور والدین پہ۔"
57 "اپنی کمائی سے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"ایک برانڈڈ گھڑی خریدی۔"
58 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ ڈائننگ ٹیبل، چٹائی، اپنا بیڈ؟"
"چٹائی۔"
59 "ہاتھ سے کھانا اچھا لگتا ہے یا چھری کانٹے سے؟"
"چھری کانٹے سے کھانا اچھا لگتا ہے۔ لیکن چاول میں ہاتھ سے ہی کھاتا ہوں۔"
60 "جب ساری دنیا سو رہی ہو سوائے آپ کے تو کیا کریں گے؟"
"میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔"
61 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"بہت زیادہ....."
62 "عشق کے بخار چڑھے.....؟"
"بہت کم..... کیونکہ میں اپنے کام پہ بہت فوکس ہوں۔ بہت دل لگاتا ہوں۔ ان باتوں کی طرف توجہ نہیں ہے۔"
63 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
(ٹھنڈی سانس کے ساتھ) "مرد نرم دل ہوتے ہیں۔"
64 "آپ اغوا ہو جائیں تو پریشان کون ہو گا؟"
"ایسے امتحان میں اللہ تعالیٰ میرے گھر والوں کو نہ ڈالے۔"

65 "کن کیڑے مکوڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"ڈر نہیں لگتا..... مجھے چھپکلی سے "گھن" آتی ہے۔"
66 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"بالکل اندھی ہوتی ہے محبت تو ایسی ہوتی ہے کہ آپ ایک مرتبہ ڈوبے تو پھر گئے۔"
67 "رویے تکلیف دیتے ہیں؟"
"بالکل..... جب کوئی عزت نہ دے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"
68 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی۔"
69 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"تحفہ۔"
70 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"
"امی بھابھی اور عمیمہ بھی پراٹھا بہت اچھا پکاتی ہے۔"
71 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"مائیکل جیکسن اور قائداعظم۔"
72 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"زیادہ نہیں..... کیونکہ میں اپنا فون نمبر کسی کو نہیں دیتا۔"
73 "آپ کو فوبیا ہے؟"
"پانی سے گھرے سمندر کو نہیں دیکھ پاتا۔"
74 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"والٹ، موبائل اور اسکرپٹ۔"
75 "لوگوں سے کس طرح ملتے ہیں؟"
"ہمیشہ مسکرا کے۔"
76 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بہت آسانی سے..... آرام سے۔"
77 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"
"دماغ کی سنتا ہوں..... سارے فیصلے دماغ کے کہنے پر کرتا ہوں۔"
78 "آپ کی کوئی اچھی بری عادت؟"
"اچھی تو یہ کہ اپنے گھر والوں کا بہت خیال رکھتا ہوں، اور بری یہ ہے کہ میرا غصہ بہت تیز ہے۔"
79 "منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"جی بالکل نکلتی ہیں، جب غصے میں ہوتا ہوں ماں بہن ایک کر دیتا ہوں۔"
80 "غصے میں کھانے سے ناراضی؟"
"ہوتی تھی..... مگر بچپن میں، اب کم ہوتی ہے۔"
81 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"
"تب بنتی ہے جب آپ اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھنے لگیں اور غرور میں پاگل ہو جائیں..... اور اللہ مجھے محفوظ رکھے۔"
85 "آپ کے وارڈ روب میں زیادہ کس رنگ کے کپڑے ہیں؟"
"کالے، لال اور تقریباً" ہر رنگ کے، مجھے لال رنگ کی شرٹس بہت پسند ہیں۔"
86 "کھانے میں کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"
"کچھ خاص نہیں..... اگر آپ کا اشارہ اچار اور اس طرح کی کوئی چیز ہے تو مجھے یہ چیزیں پسند نہیں۔"
87 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"نہیں جی کبھی بھی نہیں..... زندگی بہت حسین تحفہ ہے رب کا۔"
88 "تہوار جو شوق سے مناتے ہیں؟"
"عیدالفطر، عیدالاضحیٰ۔"
89 "پیسہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟"
"محنت سے ملتا ہے۔"
90 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
قہقہہ "اٹھتا ہی نہیں ہوں۔ دوبارہ سو جاتا ہوں۔"
91 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"
"جب جان پر بن آئے۔"
92 "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"
"غصہ کم کرنا چاہتا ہوں۔"
98 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"جب اللہ آپ کو کچھ دے اور اس پر آپ شکر کریں تو کبھی زوال نہیں آتا..... اور آئے تو انا اللہ پڑھ لیں۔"

☼

بقیہ سروے

میں بہت پریشان ہوں، آپ میرے لیے بھی دعا کیجئے گا..... اس لمحے مجھے اللہ کی ذات پر بڑا پیار آیا کہ مجھ گناہ گار کے عیبوں کی پردہ پوشی کس طرح کی کہ لوگ مجھ سے بھی دعا کے لیے درخواست کرتے ہیں۔

میرے پیارے شہزادے معیز اکرم کے جانے کے بعد جیسے میری زندگی یکسر بدل گئی..... میرا ظاہر و باطن سب میں بہت واضح تبدیلی آئی ہے۔ اکثر میری ملنے والیاں کہتی ہیں کہ ”ثمینہ کے صبر کا اللہ پاک نے کتنا اچھا انعام دیا کہ اسے اپنے قریب کرلیا۔“ بس یہ جملہ سن کر مجھے ایک انمول خوشی ملتی ہے۔

(3) زندگی تو پانی کا بلبلہ ہے..... زندگی کا لمحہ بھر کا بھی بھروسہ نہیں۔ ہم اس ذرا سی زندگی کو ناراضی، لڑائی جھگڑے اور آپس کی رنجشوں کی نذر کردیتے ہیں۔ میں اب اپنی موجودہ زندگی میں کسی سے کوئی رنجش یا ناراضی نہیں رکھتی..... پہلے اگر میرے دل میں کسی کے لیے کوئی رنجش تھی بھی تو اب نہیں ہے۔ میں معیز کی شہادت کے بعد اکثر اپنے خاندان والوں کے رویہ کو سوچ کر دکھی ہوتی تھی۔ کیونکہ جو میرے بہت اپنے تھے، وہ غم کی اس گھڑی میں بہت دور کھڑے نظر آئے، جبکہ غیر اجنبی لوگوں نے میرا غم بانٹا۔ میں بھی کچھ لوگوں سے ناراض تھی..... مگر پھر اچانک ہی اللہ نے میرے دل کو بدل دیا۔ میں نے اپنے قریبی لوگوں سے ناراضی اور رنجش کو خود آگے بڑھ کر ختم کیا..... خود چل کر ان لوگوں کے گھر گئی ان کی خوشی اور دکھ میں بھی شریک ہوئی۔ رنجش اپنے دل میں نہیں رکھتی..... یہ سب اس لیے کہ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ پھر یہ زبان کا میٹھا بول ہی تو یاد آئے گا۔ ورنہ تو سب کچھ یہی رہ جائے گا۔

(4) 2014ء میں پاکستانی سیاست کا جو جنازہ نکلا ہے۔ سیاست دانوں نے سیاست کا جو بیڑا غرق کیا ہے اس کی وجہ سے تو جو ایک دو سیاسی شخصیات پسند بھی تھیں۔ وہ اب نہیں رہیں اس سال 2014ء میں کسی بھی سیاسی شخصیت نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا ہے، سوائے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے..... لہٰذا انہیں تو رہنے ہی دیں۔ اب میوزک، ڈراما اور کھیل میں پسندیدہ شخصیات کون سی تو ان شعبہ جات میں میری دلچسپی صفر ہے لہٰذا ”کوئی بھی نہیں“ میرا جواب ہوگا..... اردو ادب اور مذہب میں کئی ایک نام قابل ذکر ہیں..... ادب کے حوالے سے میں نے اس سال بھی کئی لوگوں کو پڑھا۔ اشفاق احمد، یونس بٹ، جاوید چوہدری، پریم چند، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ..... ہمارے ڈائجسٹ بھی تو ادب کا ایک حصہ ہیں۔ عمیرہ احمد، سمیرا حمید اور سائرہ رضا اس سال میری موسٹ فیورٹ رہیں۔

مذہب میں یوں تو مجھے دینی کتب کے مطالعے میں اب بہت دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، مختلف رائٹر کے قلم سے مختلف کتب میں نے پڑھی، مولانا محمد یوسف اصلاحی اور مولانا طارق جمیل، مذہب کے حوالے سے میری پسندیدہ شخصیات ہیں۔ جن کی وجہ سے میری زندگی نے نیا سفر اختیار کیا۔

(5) ویسے تو قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہی وہ واحد کتاب ہے۔ جس کے مطالعے کی وجہ سے ہماری زندگی مثبت رخ اختیار کر سکتی ہے..... جو ہر ایک مسلمان کو ضرور پڑھنی چاہیے مگر اس کے علاوہ سیرت النبی بھی پڑھیں اور ایک کتاب ”شعور حیات“ (مولانا محمد یوسف اصلاحی) ہے یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر میری زندگی یکسر تبدیل ہو گئی اور مجھے زندگی گزارنے کا شعور ملا..... اس لیے میں اپنی قارئین کو بھی ”شعور حیات“ پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔

خباب رحمٰن انصاری..... شہر سکھر سندھ

(1) جہاں تک بات اچھے کام کر کے گہرا اطمینان محسوس کرنے کی ہے تو میں اچھے کام کر کے بھول جاتی ہوں۔ بہت یاد کرنے پر بھی صرف ایک یاد آرہا ہے، چھوٹی عید کی چاند رات کے دن جب میں بازار جارہی تھی تو میری بہن نے ایک بہت مشہور ہفتہ وار رسالہ منگوایا تھا جس کے سرورق پر ”ماورا حسین“ اور ”عروہ“ تھیں اور میری بہن ماورا کی بہت بڑی فین ہے۔ جب واپسی پر میں نے اسے وہ رسالہ دیا تو اس کی خوشی دیکھ کر میں نے خود اپنے اندر خوشی محسوس کی تھی اور ایگزمز کے دوران فرینڈز کی ”ہیلپ“ کر کے کافی خوشی محسوس ہوتی ہے اور اطمینان بھی ہوتا ہے۔ ہاہاہا۔

(2) گزرے سال میں کافی لوگوں نے میری تعریف کی

لیکن سب سے زیادہ اچھی تعریف جو میرے دل میں خوشی کا انمول احساس جگا گئی تھی۔ جب میری کزن نے میری بہنوں سے کہا تھا کہ خباب تم سب بہنوں میں سب سے الگ ہے۔“ اور جب میرے بہنوئی نے میری بہن کو بولا تھا جو میری شکایت کررہی تھی کہ ”نہیں خباب ایسی نہیں ہو سکتی..... وہ تو بہت معصوم ہے۔“ ہاہاہا..... کافی خوشی ہوئی تھی اور میری فرینڈز کا گزرے سال میں کوئی ڈیڑھ سو دفعہ کہنا ”خباب سب سے معصوم ہے“ اور جب میں اپنے گھر میں بہنوں کو بتاتی تو وہ کہتیں کہ انہوں نے اصلیت نہیں دیکھی ہے ابھی تمہاری اور میران کو ہر بار جلانا کافی خوشی دیتا تھا۔

(3) اول تو میں گھر سے باہر کسی کو ناراض نہیں کرتی لیکن اگر فرینڈز وغیرہ میں کوئی بات ہو جائے تو میں اپنی غلطی مان لیتی ہوں، لیکن اس سال ہمارے سیاست دانوں کی وجہ سے میں نے فیس بک پہ کافی بحث کی تھی سب سے اور اسی وجہ سے کافی لوگ ناراض ہو گئے تھے مجھ سے تو میں بس انہیں لوگوں کی ناراضی ختم کرنا چاہوں گی اور یہ ہی کہوں گی کہ اس طرح کی بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر آپ سچ بول سکتے ہیں تو سچ سننے کی ہمت بھی رکھیں اور آخر میں سب سے سوری کروں گی کہ اگر میں نے کچھ غلط کہا ہو کبھی کسی کو۔

(4) 2014ء میں مذہب کے حوالے سے ”ابتسام الٰہی ظہیر“ سیاست کے حوالے سے پہلے ”خان صاحب“ تھے لیکن اب میں کافی تجزیہ کر کے کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ رہی ہوں جو ہمارے ملک کے ساتھ مخلص ہو۔ میوزک کے حوالے سے مجھے کوئی پسند نہیں آیا آج تک۔ ڈراما کے حوالے سے ”محبت اب نہیں ہوگی“ والی صائمہ اکرم چوہدری اور خاص طور پر ان کے دھرنے کے متعلق اسٹیٹس مجھے کافی پسند ہیں۔

(5) 2014ء میں تو بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور میں زیادہ تر اسلامی کتابیں ہی پڑتی ہوں تو میں ”امیر حمزہ“ کی بکس کہوں گی کہ ان کی بکس پڑھیں۔ ایک کتاب ہے ”غم نہ کریں“ یہ ایک اردو ترجمہ ہے ایک عربی بک ”لاتحزن“ کا اور اس کا ایک انگلش ترجمہ بھی ہے ”Dont be sad“ اس کے مصنف کا نام ڈاکٹر عائض القرنی ہے۔ تو اس بک کے لیے کہوں گی کہ یہ پڑھیں اور ایک کتاب ہے ”زندگی سے لطف اٹھائیے“ اور اس کے مصنف کا نام ”دکتور محمد بن عبدالرحمٰن العریضی“ ہے۔ یہ ایک مسلمان کے لیے کافی اچھی اسوہ حسنہ کی روشنی میں کتاب ہے۔

در ثمن مغل..... گاؤں کیلے ضلع شیخوپورہ

(1) ویسے تو کوئی نہ کوئی ایسا کام کرنے کا موقع تلاشتی رہتی ہوں جس سے بہت سکون ملے، تو پچھلے سال کا قابل ذکر کام یہ ہے کہ فروری 2014ء میں تایا کے بیٹے کی شادی تھی میں نے زبردست سا سوٹ لینے کے لیے پیسے جمع کیے تھے۔ کچھ دن پہلے بھائی نے بتایا کہ میرے دوست کا داخلہ جانا ہے۔ (جامعہ کا) تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور اگر داخلہ نہ بھیج سکا تو اس کا سال ضائع ہو جائے گا۔ میں نے اسی وقت داخلہ دینے کی ہامی بھرلی اور بھائی سے کہا کہ اسے دے آؤ پیسے تاکہ سال ضائع ہونے سے بچ جائے اور کزن کی شادی پہ پرانے سوٹ سے ہی گزارا کرلیا تھا۔

(2) ایک کزن نے کہا تھا کہ مجھے تم سے زیادہ اچھا کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ آہم م م م۔

(3) میرا مزاج سب بہن بھائیوں سے منفرد ہے۔ تو بس سب موڈ کو سمجھنے کے بجائے ہرٹ کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے کبھی تو اگنور کرجاتی ہوں، اور کبھی ناراض ہو جاتی ہوں۔ تو میں چاہتی ہوں کہ اب ایسا نہ ہو۔

(4) ہمارا گھر ٹی وی سے پاک ہے تو تفریح کا ذریعہ ڈائجسٹ ہی ہیں تو اس لحاظ سے 2014ء کی پسندیدہ شخصیات میں انشاء جی، نمرہ احمد اور سمیرا حمید شامل ہیں۔

(5) پوری دنیا میں سے جو سب سے بہترین کتاب اور جو میری بھی پسندیدہ ہے وہ قرآن مجید بمع ترجمہ ہے۔ تمام قارئین سے یہی گزارش کروں گی کہ وہ قرآن مجید کو ترجمہ کے ساتھ ضرور پڑھیں۔

اقرا اسحاق چوہدری..... حویلی لکھا، تحصیل دیپالپور، ضلع اوکاڑہ

تمہیں بھی خبر ہوگی کہ دریا پاس بہتے ہوں تو
پانی اچھا لگتا ہے
کناروں سے جڑی مٹی سے پوچھو
اس پانی کی چاہت میں

کناروں سے اکھڑ کر
اجنبی دیسوں میں جانا کتنا مشکل ہے
کنارہ پھر نہیں ملتا
تمہیں بس اتنا کہنا ہے کہ
یہاں جو بھی بچھڑ جائے
دوبارہ پھر نہیں ملتا"

(1) جی ہاں! وہ لمحہ ابھی چند دن پہلے ہی آیا ہے، جب میں نے مصحف کو پڑھا۔ میں نے مصحف ہی سے قرآن پڑھنا سیکھا کہ قرآن ترجمے کے ساتھ کس طرح پڑھا جاتا ہے اب میں ہر روز اسی طرح ترجمے کے ساتھ پڑھتی ہوں اور گہرا سکون محسوس کرتی ہوں۔ اب مجھے شوق نہیں بلکہ جنون ہے کہ میں عربی سیکھوں۔ قرآن کا ساتھ کبھی نہ چھوڑ سکوں (آمین)

(2) ہاں جی آہم آہم ضرور کیوں نہیں' ایسا ایک نہیں بلکہ بہت سے جملے ہیں جو کہ ہمارے دل میں خوشی کا "انمول" احساس جگا گئے ہیں ارے وہ "انمول جملہ" نہیں جو آپ سمجھ رہے' آپ نے صرف ایک پوچھا ہے اس لیے ایک ہی لکھ رہی ہوں' ایک دفعہ میں اپنی کلاس کو اسلامک موضوع پہ لیکچر دے رہی تھی کہ ایک بچی نے کھڑے ہو کر کہا "ٹیچر آپ کی باتیں سیدھی میرے دل پر اثر کرتی ہیں اور میں ہر وہ کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں جو آپ مجھے کہتی ہیں۔"

(3) خدا کا شکر ہے کہ میری کسی سے دشمنی یا رنجش نہیں چھوٹی موٹی ناراضیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں ان ہی سے تو زندگی کے رنگ ہیں۔ میری دوست حفصہ' مصباح سے ناراض ہے کہ کیونکہ وہ شادی پہ نہیں آئی' یہی دعا کروں گی کہ یہ جاتا ہوا سال اپنے ساتھ اس ناراضی کو لے کر جائے اور اگلا سال ہمارے عشی گروپ کے لیے خوشیوں بھرا سال ہو۔ (آمین)

(4) ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔ ہے نا حیرانی کی بات!.... اس لیے سیاست اور میوزک میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔ ڈراما تو پھر دور کی بات' کھیل کے بارے میں سنتے رہتے ہیں' بھئی جو اچھا کھیلتا ہے وہ ہمارا پسندیدہ بن جاتا ہے۔ ادب کے حوالے سے مجھے عمیرہ احمد' نسیم حجازی اور نمرہ احمد بہت پسند ہیں۔

(5) مجھے ایک نہیں' بہت ساری کتابیں پسند ہیں' نسیم حجازی' عمیرہ احمد اور نمرہ احمد نے جتنی بھی کتابیں لکھی ہیں' بہت بہت زبردست ہیں جن میں نسیم حجازی کی "خاک اور خون" "شاہین' عمیرہ احمد کی "پیر کامل" و "شہر ذات" نمرہ احمد کی "جنت کے پتے"' "مصحف" کو میں ہر قاری کو مشورہ دوں گی کہ وہ انہیں ضرور' ضرور پڑھیں۔

مشعل فیاض..... گوجرانوالہ

سب سے پہلے تو سب کو نیا سال مبارک۔ اللہ خیر سے یہ سال بھی گزارے۔ ہم سب کو اپنی امان میں لے۔ اب آتے ہیں جوابوں کی طرف۔ یقین کریں بور نہیں ہوں گے۔

(1) ہاں 9 نومبر کو جب خواتین میرے ہاتھ میں تھا۔ اور میرا خط اس میں شائع ہوا' یقین کریں ایسا اطمینان بھرا سانس' جب میں فرسٹ ایر میں پاس ہوئی تھی تب بھی نہ لیا ہو۔ تھینکس' بس یہی اچھا کام تھا جو 2014ء میں کیا۔ (آہم)

(2) جب مجھے کسی نے کہا کہ میری ماما نے میری تربیت بہت اچھی کی ہے' اور یہ میری ماما نے کہا کہ زندگی میں میں ہر چیز حاصل کرلوں گی اور میری ماما کی دعائیں۔۔ بس۔

(3) بالکل نہیں' میں کبھی بھی نہیں بھولتی۔ یاد رکھتی ہوں اور مجھے ضرورت بھی نہیں بدتمیز اور فضول لوگوں سے رنجشیں دور کرنے کی۔ ہاں بولتے سب ہیں' بس اتنا

ہی ٹھیک ہے۔ ہاں لیکن حورم سلطان سے ناراضی دور کرنے کا ارادہ ہے۔ کہ چلو مرگئی۔ میری جان چھوٹی۔ اب دل میں اس کے لیے کچھ فیل نہیں ہوتا جب اس کا ڈرامہ دیکھ کر ہوتا تھا۔ بدتمیز حورم سلطان۔ سلطان کی دم۔

(4) مذہب میں عامر لیاقت

سیاست میں نواز شریف۔ کافی کیوٹ ہیں۔ اور ان کا بھائی بھی ارے ارے شہباز شریف یار۔ میوزک میں مجھے سب اچھے لگتے ہیں۔ کھیل میں کرکٹ کیونکہ بس اس کی سمجھ آتی ہے۔ ادب کا پتا نہیں کیونکہ میں نے ابھی کچھ دن پہلے اشفاق احمد کی "من چلے کا سودا" پڑھنے کی بہت کوشش کی مگر دس صفحے پڑھنے کے بعد واپس دے دی جس کی تھی۔ لیکن رسالہ کی بات ہے تو سب کہانیاں اچھی ہیں اور مجھے پسند ہیں مگر نمل کچھ زیادہ ہی۔

(5) میں نے اتنا مطالعہ نہیں کیا صرف ڈائجسٹ میں کہانیاں پڑھیں اور کتابیں منگوائی ہیں پھر بھی میں انہیں مصحف ہی پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔ جو سب نے پڑھی ہے۔ (ہاہاہا) اب اجازت دیں۔

شجیہ۔۔۔۔ لاہور

(1) اس سوال کا جواب تو میرے دل کے بہت قریب ہے کیونکہ اس سال میں نے باقاعدگی سے حجاب لینا شروع کردیا ہے۔ جس سے مجھے بہت روحانی سکون حاصل ہوا ہے۔

(2) جی جی! بالکل میرے ایک انکل نے کہا تھا کہ تمہارا چہرہ بہت پیارا ہے چمکتا ہوا اور ایک فیملی ممبر نے بھی کہا تھا کہ تمہارے چہرے پہ بہت نور ہے تو بہت خوشی ہوئی تھی۔

(3) میں اپنے دل میں ناراضی کسی کے لیے بھی نہیں رکھتی۔ ہاں بات کرتے وقت کبھی کبھار لہجہ سخت ہو جاتا ہے وہ کوشش کرتی ہوں کہ نہ ہو۔

(4) اس سال رمضان میں مولانا طارق جمیل کا خطاب سنا تھا بس وہی پسندیدہ مذہبی شخصیت ہیں۔ سیاست میں کوئی خاص نہیں۔ میوزک میں گانے زیادہ پسند ہیں۔ ڈراموں میں سب اچھے ہیں۔ ثانیہ سعید اور نعمان اعجاز بہت اچھی اداکاری کرتے ہیں اور آج کل سجل بچی بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ کرکٹ میں اپنے لالا (بھئی شاہد آفریدی) آل ٹائم فیورٹ ہیں اور احمد شہزاد بھی اچھا کھیلتا ہے۔ ویسے سب پسند ہیں۔ ٹینس میں اعصام الحق اور ویلیم سسٹرز پسند ہیں۔ ادب میں تو نمرہ احمد کی کیا ہی بات ہے۔ وہ کہانی کے ذریعے ہی سبق سکھا دیتی ہیں۔

اور اب ہاشم ندیم کو پڑھا ہے۔ بہت اعلیٰ رائٹر ہیں۔

(5) میری پسندیدہ کتاب تو "مصحف" اور "جنت کے پتے" ہیں۔ اگر آپ واقعی اپنی زندگی میں تبدیلی چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور پڑھیں اور ہاشم ندیم کی "بچپن کا دسمبر" بھی بہت اچھی کتاب ہے۔ وہ پڑھ کر انسان اپنے بچپن میں چلا جاتا ہے۔

فرحت اشرف گھمن۔۔۔۔ سیدوالا

(1) 2014ء میں مدارس دین اور قرآن پاک کا ترجمہ شروع کر کے میں نے گہرا اطمینان محسوس کیا۔

(2) مدرسہ میں باجی جان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے کردار کی خوب صورتی مانگو۔ تاکہ لوگ آپ سے آپ کی صورت کی وجہ سے نہیں کردار کی خوبصورتی سے متاثر ہوں۔

(3) میری کزن سے میری ناراضی چل رہی ہے جسے میں نئے سال میں ختم کرنا چاہتی ہوں اور اپنے آپ میں صبر و تحمل پیدا کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

(4) مذہب میں مولانا طارق جمیل صاحب' سیاست میں نواز شریف میوزک میں عاطف اسلم کھیل میں عمر اکمل' ادب میں وصی شاہ اور ڈرامہ میں سہیل سمیر پسندیدہ شخصیات ہے۔

(5) تحفہ خواتین' مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب کی ہے۔ یہ کتاب مجھے بہت پسند ہے۔ میں بہنوں کو یہ کتاب پڑھنے کا ضرور مشورہ دوں گی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... شیزا

میک اپ .... روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر .... موسیٰ رضا

خبریں و ہ بیں

واصفہ سہیل

یقین

مسلمان تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ ان کے ایمان کا حصہ ہے مگر یہودی جو مسلمان نہیں ہیں اور مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ آپؐ پر ایمان نہیں لاتے' لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے اسے سچ سمجھتے ہیں اور اس پر پورا یقین بھی رکھتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی مثال "غرقد کاری" ہے۔ غرقد ایک جھاڑی نما درخت یا پودا ہے' جو حدیث کے مطابق یہودیوں کے لیے باعث پناہ ہو گا۔ تو یہودیوں نے پوری دنیا کے ساتھ ساتھ پشتون علاقوں میں بھی غرقد کی بڑے پیمانے پر شجر کاری کی مہم شروع کر دی ہے۔ کابل اور جنوب مشرق کے صوبوں میں امریکی اور یورپی این جی اوز وسیع رقبوں پر یہ درخت لگا رہی ہیں' حتیٰ کہ پاکستان کے پشتون علاقوں کے علاوہ غیر پشتون علاقوں میں بھی غرقد کاری کی شجر کاری انتہائی منظم طریقے سے کی جا رہی ہے۔ وہ این جی اوز افغانستان میں اتحادی فورسز کے تحفظ میں یہ کام کر رہی ہیں (اور ہم ...؟)

عظیم انسان

ٹینا ثانی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی منفرد گائیکی نے ان کو ایک الگ پہچان دی ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو شاعری کو سمجھ کر گاتے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے لاہور میں فیض فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام "یوم اقبال" پر اقبال کا کلام گا کر اہلیان لاہور سے بھرپور داد وصول کی۔ اس موقع پر ٹینا ثانی نے کہا کہ "علامہ اقبال کی شاعری کو پڑھ کر سمجھ میں آیا کہ وہ کتنے عظیم انسان تھے۔ وہ کبھی ایک جگہ ہٹ دھرمی سے کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہر چیز کا مطالعہ کرتے تھے۔ یہی بات ایک بڑے انسان ہونے کی دلیل ہے۔ ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ ہمیں دو چار چیزوں پر یقین ہو جاتا ہے اور ہم ہٹ دھرمی سے اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ لوگ سیاسی پارٹی تک نہیں بدلتے۔ یہ نیچرل نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں ایک نشوونما ہے۔ میں تو بہت کم جانتی ہوں لیکن جتنا بھی ان کو پڑھا' سمجھ کر گایا۔ "شکوہ' جواب شکوہ" لگتا ہے کہ ہمارے آج کی کہانی ہے۔ سو سال کے بعد بھی شکوہ پڑھی تو مجھے لگا کہ یہ آج کے انسان اور آج کے مسلمان کے لیے لکھا گیا ہے۔ (جی ٹینا! مسلمان اپنے حالات سے سبق نہیں سیکھتے جب ہی تو ...؟)

قومی کھیل ...؟

پاکستان میں کھیلوں پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ وزارت کھیل نہ جانے وہ فنڈ کہاں خرچ کر دیتی ہے' جو کھیل اور کھلاڑیوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔ فٹ بال پر اگر توجہ دی جائے تو پاکستان اس میں یقیناً" بہت نام بنا سکتا ہے۔ اسکواش کے ہم سالوں چیمپئن رہے لیکن انفرادی کوششوں کی وجہ سے، حکومت نے اسکواش کے کھیل اور کھلاڑیوں کی سرپرستی کرنا پسند نہیں کی۔ (بھئی وہ ملک کا نام جو روشن کرتے تھے ...!) اس طرح پاکستان کا قومی کھیل ہاکی جس کی ساری ٹرافیاں اور ایوارڈ پاکستان کے پاس تھے۔ آج فنڈ اور تنخواہ نہ ملنے کے باعث کھیل اور کھلاڑی دونوں زوال پذیر ہیں۔

ہاں ایک کھیل ہے۔ جس پر حکومت اور وزارت کھیل کی خوب توجہ ہے اور وہ ہے کرکٹ۔ جس پر حکومتی نوازشات کی بارش ہمیشہ رہتی ہے۔ ابھی حال ہی میں متحدہ عرب امارات میں پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کھیلی گئی دو ٹیسٹ میچوں کی سیریز پاکستان جیت گیا تو کھلاڑیوں کو ایک کروڑ سینتالیس لاکھ پچاس ہزار کی رقم انعام کے طور پر دی گئی' جس کے مطابق ہر کھلاڑی کو پانچ پانچ لاکھ اور شاندار انفرادی کارکردگی پر الگ سے دس دس لاکھ دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہیڈ کوچ ۔ کوچ اور دیگر کوچز اور معاون عملے کو ساڑھے تین تین لاکھ روپے انعام میں دیے جائیں گے۔ اس کے برعکس ایک طویل عرصے بعد پاکستان ہاکی ٹیم انڈیا کو ہرا کر دوسری پوزیشن پر پہنچی' لیکن ہاکی فیڈریشن اور حکومت نے ان کو کسی انعام سے نہیں نوازا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان کرکٹ کے علاوہ کسی اور کھیل پر توجہ نہیں دیتے دوسری طرف کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کے لیے میرٹ بنیاد نہیں ہے۔

انکشاف

پروین شاکر نے شاعری میں کیا نام بنایا' ہر طرف خواتین شعرا نظر آنے لگیں' اس کی حد دیکھیے کہ اداکارہ ریشم نے بھی فلم' ٹی وی اور ماڈلنگ کے بعد شاعری پر — طبع آزمائی شروع کر دی ہے۔ اور آنے والے چند ماہ میں سننے میں آ رہا ہے کہ ریشم اپنا ایک شعری مجموعہ لانے والی ہیں۔ (اب یہ کون بتائے گا کہ اس شاعری میں وزن کتنا ہے ...؟) اس بارے میں ریشم کا کہنا ہے کہ وہ ٹی وی' ڈراموں میں اس قدر مصروف رہیں کہ اب تک اپنا شعری مجموعہ شائع نہیں کروا سکیں' لیکن اب جلد ہی وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کروا کے عوام کے سامنے لے آئیں گی۔

ہمارے دیس کے پکوان

صباسحر

سندھی دیگچی کباب

ضروری اجزا :

قیمہ روکھا ایک کلو
براؤن پیاز آدھا کپ
بیسن، خشخاش پسی دو، دو کھانے کے چمچے
انڈا ایک عدد
دہی دو کھانے کے چمچے
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمہ میں چار ہری مرچ، نمک، ہرا دھنیا، سیاہ مرچ، گرم مسالا، پسی خشخاش کے ساتھ باریک پیس لیں پھر اس میں براؤن پیاز کا چورا، انڈا، بیسن اور دہی مکس کرکے دبا دبا کر لمبے کباب بنالیں۔ دیگچی میں تیل گرم کرکے یہ کباب احتیاط سے رکھ دیں اور ڈھک کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ پانچ منٹ بعد احتیاط سے دیگچی ہلاتے رہیں کہ تمام طرف سے کباب اچھی طرح پک جائیں۔ چمچہ نہیں چلانا ورنہ کباب ٹوٹ جائیں گے۔ کٹی ادرک اور ہرا دھنیا چھڑک کر رائتے اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

حیدر آبادی فرائی مچھلی

ضروری اجزا :

مچھلی کے سلائسز آٹھ عدد
لہسن پیسٹ دو چائے کا چمچے
سرکہ ایک کھانے کا چمچہ
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

مچھلی کو اچھی طرح دھو کر خشک کرلیں اور اس پر نمک، ایک چائے کا چمچہ لہسن پیسٹ اور سرکہ لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں نمک، باقی بچا لہسن پیسٹ، لال مرچ، ہلدی مکس کرلیں اور مچھلی کو اس آمیزے سے نکال کر اس مسالے میں لپیٹ کر ایک گھنٹہ مزید چھوڑ دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے مچھلی کو دونوں طرف سے فرائی کرکے ٹشو پر نکال لیں۔ ڈش میں نکال کر لیموں، ادرک اور چاٹ مسالے چھڑک کر پیش کریں۔

کشمیری مرچ قورمہ

ضروری اجزا :

چکن آدھا کلو
پیاز، شملہ مرچ چار، چار عدد
لہسن پیسٹ ایک چائے کا چمچہ
دہی آدھا کپ
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گرم تیل میں دو پیاز پسی ہوئی ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ گلابی ہو جائے تو چکن ڈال کر مزید پکائیں۔ دو پیاز کو براؤن کرکے دہی پھینٹ لیں اور پسی لال مرچ ڈال دیں، ہلدی کٹا ہوا دھنیا، لہسن پیسٹ، ثابت گرم مسالا، زیرہ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ مسالا بھن جائے تو باریک کٹی ادرک اور شملہ مرچ ڈال کر رکھ دیں۔

بلوچی مکھنی دال

ضروری اجزا :

مونگ کی دال ایک کپ
پیاز، ٹماٹر ایک، ایک عدد
ادرک لہسن پیسٹ ایک چائے کا چمچہ
زیرہ، گرم مسالا ایک، ایک چائے کا چمچہ
مکھن تین کھانے کے چمچے
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

دال کو دھو کر آدھا گھنٹہ بھگو کر رکھیں پھر دو کپ پانی شامل کرکے اتنی دیر ابال لیں کہ وہ آدھی سے زیادہ گل جائے۔ اس میں سرخ مرچ ہلدی، نمک، دھنیا، ٹماٹر، ادرک لہسن پیسٹ اور گرم مسالا ڈال کر مکس کریں اور ڈھک کر پکائیں۔ دال گل جائے تو اس میں ہری مرچیں ڈال کر دو منٹ تک دم پر رکھ دیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے پیاز کے لچھے سنہری کرکے سفید زیرہ ڈال کر بگھار لگا دیں۔ ڈش میں نکال کر اوپر سے مکھن ڈال دیں اور چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

سندھی مرغ پلاؤ

ضروری اجزا :

چکن ایک کلو
باسمتی چاول آدھا کلو
پیاز دو عدد
ادرک لہسن ایک کھانے کا چمچہ
دہی آدھا کپ
گرم مسالا ایک چائے کا چمچہ
نمک، تیل حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کرکے پیاز فرائی کرلیں۔ چکن اور ادرک لہسن ڈال کر تھوڑا سا بھون لیں۔ پیالے میں دہی، ایک ایک چمچہ کٹی ہوئی سونف، کٹا ہوا دھنیا، گرم مسالا، کٹا ہوا زیرہ اور نمک ڈال کر پھینٹ لیں اور چکن میں مکس کرکے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو بھیگے ہوئے چاول اور حسب ضرورت پانی ڈال کر پہلے تیز اور پھر درمیانی آنچ پر پکائیں، پانی خشک ہو جائے تو دم پر رکھ دیں۔ رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

پنجابی زردہ

ضروری اجزا :

سیلا چاول، چینی آدھا، آدھا کلو
کھویا، دودھ آدھی، آدھی پیالی
پستے، بادام، کشمش آدھی پیالی
الائچی، لونگ چھ، چھ عدد
کیوڑہ چند قطرے
گھی، اشرفیاں ایک ایک پیالی

ترکیب :

تین گھنٹے بھگو کر چاول ابال لیں اور نتھار کر کھلے برتن میں پھیلا دیں۔ سارے میوے باریک کاٹ کر دو چمچے گھی میں فرائی کرکے نکال لیں۔ اسی گھی میں لونگ اور الائچی کڑکڑائیں۔ پھر چاول کی ایک تہہ لگائیں۔ تھوڑی سی چینی پھیلائیں۔ تھوڑا سا دودھ اور تھوڑا سا میوہ چھڑکیں۔ پھر چاولوں کی تہہ لگا دیں اور گھی، میوہ، چینی اور دودھ کی ایک اور تہہ لگائیں، پھر آخری تہہ چاول کی لگا دیں۔ چاول کے اوپر کھویا اور کیوڑہ اور دم پر لگا دیں۔ پیش کرتے وقت مکس کریں۔

☆

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

سعدیہ..... کراچی

میں پانچ بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن ہوں۔ شادی کو تیرہ سال ہونے والے ہیں۔ بات کہاں سے شروع کروں۔ شادی کے بعد میں نے بے حد ذہنی تکلیف اٹھائی ہے۔ میں نے چاہا ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں۔ میں نے اپنی ایک بات اس سے شیئر کی۔ اس نے اسے اپنے تک محدود نہیں رکھا۔ سو میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ خاموشی اپنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار مجھے سائیکاٹرسٹ کے پاس جانا پڑا۔ گزشتہ چار سال سے ڈپریشن کی ادویات استعمال کررہی ہوں۔

میں ایک اسکول میں ٹیچر کے طور پر جاب بھی کررہی ہوں۔ ایم اے بی ایڈ ہوں۔ یہ جاب کیا ہے۔ دراصل ایک فرار ہے اپنی ذات سے 'کھانا پینا' 'تن ڈھانپنا' 'ازدواجی تعلقات یہ کافی نہیں ہے زندگی میں۔ کچھ ہے جو مسنگ ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے پیار کیا' اعتبار کیا خود سے بڑھ کر مگر غلطی کی۔ میں نے اس کے پاس قابل اعتراض ویڈیوز دیکھیں تو میرا اعتبار ٹوٹ گیا۔

عدنان بھائی! چند دن پہلے میں نے اس کے موبائل پر ایک گانے کا رقص دیکھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے اس سے کہا میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو ان سب چیزوں کو مردوں کا حق سمجھتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ الگ ہوجاتے ہیں۔ میں نے کہا' یہ مت سمجھنا کہ آپ کو چھوڑ کر باقی زندگی آپ کے سوگ میں گزار دوں گی۔ میں اور شادی کرکے دکھاؤں گی آپ کو۔ چاہے کسی اندھے آدمی سے کروں۔ مجھے یقین تو ہوگا ناں کہ وہ ایسی چیزیں نہیں دیکھتا۔

میں نے جب یہ بات اس کے ماں باپ کو بتائی تو انہوں نے اس کو فیور دی' ناجائز طرف داری کی۔ اب سوچتی ہوں کہ اگر اس کے پاس ایسا کوئی مواد دیکھوں تو کیا کروں۔ اسے چھوڑ دوں ہمیشہ کے لیے' طلاق لے لوں یا خلع؟ ڈاکٹر بھی وہ عضو کاٹ دیتے ہیں جو ناسور بن جائیں۔ دکھ تو ہوتا ہے تکلیف بھی ہوتی ہے مگر ایسا آپریشن کروانا پڑتا ہے ناں۔ میرے چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی کی عمر بارہ سال ہونے والی ہے اور سب سے چھوٹا دو برس کا۔ لیکن کیا میں کسی اور شخص پر اعتبار کرسکوں گی؟ نہیں ناں۔ یہ بات مت کہیے گا عدنان بھائی! کہ میں خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنارہی ہوں۔

اب آتے ہیں دوسری بات کی طرف۔ اس نے مجھے کبھی مناسب خرچا نہیں دیا۔ اپنی انکم وہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ البتہ گھر کا سودا سلف بروقت آجاتا ہے۔ چاہے کم چاہے زیادہ۔ اگر میں اپنے بھتیجے یا بھتیجی کے لیے کچھ لوں تو خرچا مجھے اپنی تنخواہ میں سے کرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذاتی استعمال کی اشیا کپڑے' جوتے' پرس وغیرہ بھی خود خریدتی ہوں۔ بچوں کی ٹیوشن یا اگر کام والی رکھوں تو اس کی ادائیگی بھی میری تنخواہ میں سے ہی ہوگی۔

ساس اور اکلوتی مطلقہ نند (ہمراہ ایک بیٹے کے) نے زندگی' دالگ عذاب بنائے رکھا۔ دوسرا نکاح سال پہلے ہوا ہے۔ اکثر جھگڑا کرکے یہیں رہتی ہے۔ رائی کا پہاڑ بنالیتی ہے۔ بے حد خود پسند ہے۔ خواہ مخواہ اونچی آواز سے لڑنا شروع کردیتی ہے اور مجھے پلٹ کر جواب دینے کی اجازت نہیں۔

محبت تو میں اپنے شوہر سے اب بھی کرتی ہوں۔ مگر کیا زندگی بھر ساتھ رہنے کے لیے صرف محبت کافی ہوتی ہے۔ نہیں ناں؟

عدنان بھائی! مجھے گھر میں وہ حیثیت نہ ملی جو میرا حق تھی۔ ہاں! اگر وہ چاہتا تو مجھے سب کچھ ضرور ملتا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ ماں باپ سے لڑتا۔ مگر انسان نرمی اور پیار سے تو اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتا ہے ناں۔

میں اپنی زندگی سے مطمئن نہیں۔ اگر زندگی ایک پزل ہے تو اس کا ایک ٹکڑا یا تو گمشدہ ہے یا پھر مس فٹ ہے۔ مجھ میں ایک خلا سا در آیا ہے۔ نہیں معلوم کیسے ختم ہوگا۔ میں اور وہ چار برس پہلے تک بھی ایسے ہی تھے جیسے ایک ندی کے دو

کنارے' جو ساتھ ساتھ تو چلتے ہیں مگر بھی ایک نہیں ہوپاتے۔ یہ تو ہمارے سائیکاٹرسٹ کی مہربانی ہے جو یہ خلیج کبھی کبھی تو ختم محسوس ہوتی ہے۔

میں اپنی تنخواہ اپنی مرضی سے خرچ کرسکتی ہوں۔ اس سلسلے میں مجھ پر دباؤ نہیں ہے۔ عدنان بھائی! میں نے اسے ہر رشتے' ہر محبت سے بڑھ کر چاہا۔ شاید خدا کو میری یہی بات بری لگی ہو کہ دیکھو جسے تم نے سب کچھ سمجھا جس کی محبت میں اتنی مگن ہوگئیں دیکھو! اس کی اصلیت کیا ہے؟ یہ ہے اس کی حقیقت۔

جب سے اس کا لبادہ اترا ہے' اس کا مجھ پر وہ رعب نہیں رہا۔ ہاں۔ ایک چیز میرے حق میں مثبت ہوئی ہے۔ اب وہ کہتا ہے کہ مجھے دوسروں کو معاف کردینا چاہیے اس سے مجھے ذہنی سکون ملے گا۔ کیا معاف کردینا اتنا آسان ہے؟

ج:۔ اچھی بہن! حقیقی زندگی میں اور ناول افسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا زندگی میں جو کچھ آپ کو حاصل ہے وہ ہمارے ہاں 60٪ خواتین کو حاصل نہیں ہوتا۔ کھانا پینا' بچے' ازدواجی زندگی۔ زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل ہیں پھر بھی آپ کو کچھ کمی محسوس ہورہی ہے تو ایک بات سمجھ لیں کہ کمی ہمیشہ رہ ہی جاتی ہے۔ مکمل آئیڈیل زندگی کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

اس کے موبائل پر قابل اعتراض ویڈیوز دیکھ کر آپ خلع یا طلاق کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ اپنے بچوں کے بارے میں سوچا ہے؟ انہیں معاشرے میں کس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ اپنے بچوں کو طلاق کی کیا وجہ بتائیں گی؟

اس نے اپنے والدین کو آپ کی باتیں بتائیں تو آپ نے کون سی کمی چھوڑی۔ قابل اعتراض ویڈیو والی بات اس کے گھر والوں کو بتادی۔ کیا ایک بیوی کو زیب دیتا ہے کہ اپنے شوہر کی انتہائی پرسنل باتیں کسی کو بتائے۔

اس میں بہت سی خرابیاں ہوں گی لیکن کچھ باتیں اچھی بھی ہیں۔

اس نے آپ کو جاب کی اجازت دی' اپنی تنخواہ آپ اپنی مرضی سے خرچ کرسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں۔ اس نے آپ کا ذہنی مسئلہ سمجھا اور آپ کا سائیکاٹرسٹ سے علاج کرارہا ہے۔ وہ آپ پر اعتماد کرتا ہے۔ دن یا رات کے کسی بھی پہر کہیں جائیں۔ آپ کے کردار پر شک نہیں کرتا' جہاں تک ساس نند کی بات ہے تو کون سا گھر ایسا ہے جہاں یہ جھگڑے نہیں ہوتے۔ بے شک اس نے آپ کے لیے آواز نہیں اٹھائی لیکن وہ آپ کو صحیح اور حق پر تسلیم کرتا ہے۔ تب ہی معاف کرنے کو کہتا ہے۔

قابل اعتراض ویڈیو والی بات تکلیف دہ ہے لیکن اس بات پر طلاق یا خلع کی بات کرکے جو مزید مسائل پیدا کریں گی وہ آپ کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوں گے۔ آپ کو اس سے محبت کا دعوا ہے' محبت میں تو بڑی بڑی غلطیاں معاف کردی جاتی ہیں' آپ نے لکھا ہے صرف محبت تو کافی نہیں ہوتی ناں' اچھی بہن محبت کے ساتھ آپ کو اور بھی بہت کچھ حاصل ہے' گھر' شوہر' بچے' آزادی۔

ویسے بھی چار بچوں کی ماں کو اپنی زندگی کے بارے میں کم اور اپنے بچوں کی زندگی کے بارے میں زیادہ سوچنا چاہیے۔ جہاں تک خرچ کا تعلق ہے تو جب آپ خود کماتی ہیں تو مل جل کر خرچ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر وہ آپ سے کسی بات کی وضاحت کے لیے سوال کرے تو آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ آپ سے درشت لہجے میں بات کرے تو آپ کی حالت بری ہوجاتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ احساس برتری کا شکار ہوں۔

اچھی بہن! آپ کو اپنی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ آپ غیر معمولی حساس ہیں۔ تھوڑا سا اپنا مزاج تبدیل کرلیں۔ شادی کے بعد اچھا یا برا وقت جو بھی تھا گزر گیا اب اسے بھول جائیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ سائیکاٹرسٹ سے علاج کرارہی ہیں۔ ان شاء اللہ اس سے بہتری آئے گی۔ زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں اب آپ کی زندگی پر سب سے زیادہ حق آپ کے بچوں کا ہے۔ آپ ماں بن کر سوچیں۔ اپنے بارے میں سوچنے کے بجائے ان کی بہتری بھلائی' مستقبل کے بارے میں سوچیں۔

☆

بیوٹی بکس

امت الصبور

ریحانہ شہزاد۔ مانسہرہ

س ۔ میرے گالوں پر جھائیاں ہیں جو کہ بہت ہی بری لگتی ہیں اس کے علاوہ میرے چہرے پر بال بھی ہیں، میک اپ کروں تو بالوں پر جم جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔

ج ۔ ریحانہ! جھائیاں ۔ مختلف قسم کی ہوتی ہیں، آئرن کی کمی سے یا کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے ہوتی ہیں، کبھی کبھی کیلشیم کی کمی کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر سے مشورہ کرلیں۔

آج کل کینو کا موسم ہے۔ روزانہ سیب اور ایک یا دو کینو کھانے سے بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ دودھ میں بادام پیس کر لگانے سے بھی جھائیاں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ جھائیوں پر ٹوتھ پیسٹ لگانے سے بھی ہلکی ہو جاتی ہیں۔

چہرے پر بالوں کی موجودگی میں نہ میک اپ ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے۔ آپ تھریڈنگ کے ذریعے بال صاف کر سکتی ہیں۔ اگر تھریڈنگ کا طریقہ نہ آتا ہو تو ویکسنگ کے ذریعہ بھی بال صاف کیے جا سکتے ہیں۔

زہرہ انجم۔ ڈیرہ غازی خان

س ۔ میں نے آئی بروز بنوائیں تو وہ بے حد باریک ہو گئیں۔ جو بہت بری لگ رہی ہیں۔ میں انہیں پھر سے گھنی کرنا چاہتی ہوں۔ دو ماہ بعد میری شادی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟

ج ۔ اس میں شک نہیں کہ بہت زیادہ باریک ابرو بہت برے لگتے ہیں۔ بھنویں دوبارہ اگنے کا وقت متعین نہیں کیا جا سکتا، یہ چند ماہ سے لے کر سال بھر تک ہو سکتا ہے۔ البتہ بالوں کی افزائش کا عمل تیز کیا جا سکتا ہے۔

بھنووں پر کیسٹر آئل لگایا جائے تو بال جلدی اگ سکتے ہیں۔ بھنووں پر سرمہ لگانے سے بھی بال جلد آ جاتے ہیں۔ جب تک بال دوبارہ نہ آئیں۔ بھنووں کو گھنا دکھانے کے لیے نرم آئی برو پینسل سے۔ بھنووں پر ہلکے ہلکے خط لگائیں، ایسے رنگ کی پینسل کا انتخاب کریں جس کا رنگ آپ کی بھنووں کے رنگ سے ملتا جلتا ہو۔

نسرین بشیر۔ پسرور

س ۔ میرے سر میں کافی سفید بال نمودار ہو رہے ہیں۔ میں نے ہیر کلر کا استعمال کیا تو بال سخت، روکھے ہو گئے۔ الجھے ہوئے بھی رہتے ہیں۔ کیا ہیر کلر کا استعمال مضر ہے یا میرے ساتھ ہی ایسا ہوا ہے۔

ج ۔ ہیر کلر ہمیشہ اچھے اور معیاری برانڈ کا استعمال کرنا چاہیے جو امونیا فری ہوں اور ان میں کریم وٹامنز کنڈیشنگ ایجنٹ کی بھرپور مقدار موجود ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہیر کلر کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو اس کا استعمال بالوں کی ساخت کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچاتا ہے۔ ہیر کلر اور بلیچ میں شامل کیمیکلز بالوں کی حفاظتی تہہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

سفید بالوں کے لیے ایک آسان سا نسخہ لکھ رہی ہوں جو بالوں کے لیے بھی مفید ہے۔ مٹھی بھر آملے رات کو بھگو دیں۔ صبح انہیں پیس کر بالوں میں لگالیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر اچھے شیمپو سے سر دھولیں۔ بال سیاہ، گھنے اور چمک دار ہو جائیں گے۔

بال رنگنے کے لیے مہندی کا استعمال بھی بہت اچھا ہے۔ رات کو مہندی گھول کر رکھ دیں۔ صبح اس میں ایک انڈا پھینٹ کر ملالیں۔ بالوں پر لگائیں۔ دو گھنٹے لگا رہنے دیں۔ پھر بال دھولیں۔ بالوں میں بے حد خوب صورت رنگ اور چمک آ جائے گی۔

سعدیہ کفیل۔ پنڈی

س ۔ سردی کے موسم میں میرے ہونٹ خشک رہتے ہیں، اور ان پر پپڑیاں سی جم جاتی ہیں۔ کوئی آسان گھریلو نسخہ بتائیں۔

ج ۔ یوں تو سردی میں سب لوگوں کے ہونٹ خشک رہتے ہیں لیکن جن کی جلد حساس ہوتی ہے۔ ان کے ہونٹ بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کے لیے آپ یہ ترکیبیں استعمال کریں۔

لپ بام استعمال کریں۔ گلیسرین لگائیں۔ سیب کے بیج پیس کر لیپ بنالیں۔ رات کو لگا کر سو جائیں، صبح دھولیں۔ گائے کا کچا دودھ ہونٹوں پر لگانا بہت مفید ہے۔